چمکیلی دُھلائی کے لئے سب سے بہتر

جیٹ

واشنگ پاؤڈر

نہ محنت نہ مشقت اور نہ ہی زیادہ خرچ

جیٹ کا حیرت انگیز جھاگ کپڑوں کا میل کچیل دُور کر کے انہیں فوراً صاف، چمک دار اور اُجلا کر دیتا ہے۔
اُونی، سُوتی اور ریشمی سبھی کپڑے جیٹ میں بآسانی دھل کر صاف اور اُجلے ہو جاتے ہیں۔

Adarts JD 3/73

بشکریہ :

پراچہ اِنٹرپرائز

پرنٹرز' پبلشرز اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز

دوسری منزل ویکا چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ۔

فون : آفس ۲۲۵۰۳۲ ۔ پریس ۲۳۳۱۹۲

CAREER COUNSELORS

Gullivers are the career counselors for Students

Gullivers have found placements for over 3,500 Pakistani Students in United States and Canada.

Gullivers discover your latent aptitude. We locate the best institution in States and Canada, suited to your need. We take care of your travel Documents.

Admissions and Reservations. We can also make you proficient in English after one week in our Intensive language institute.

Relax-we take competent care of all admission problems :

just contact us, or visit our office

GULLIVERS

120-122 Hotel Metropole, Club Road, Karachi.
Tele : 512051

Pakistan is passing through Constructive Phase!

We got to speed up, so as to forge ahead shoulder to shoulder with advanced nations. Through individual efforts alone, could we get through successfully and make Pakistan an ideal state.

Al-Azam Limited

being aware of their responsibility towards the Nation, are playing their humble role to the entire satisfaction of all income groups, by building good houses at lowest cost. Gigantic residential projects as well as apartments and flats built by AL-AZAM speak themselves of highest technical skill and professional acumen. You too, can join them and apart from owning a flat or house, on easy terms, you would be participating in building up a new Pakistan.

Al-Azam Limited

Bambino Chambers, Garden Road,
Karachi. Phones: 74426-74469

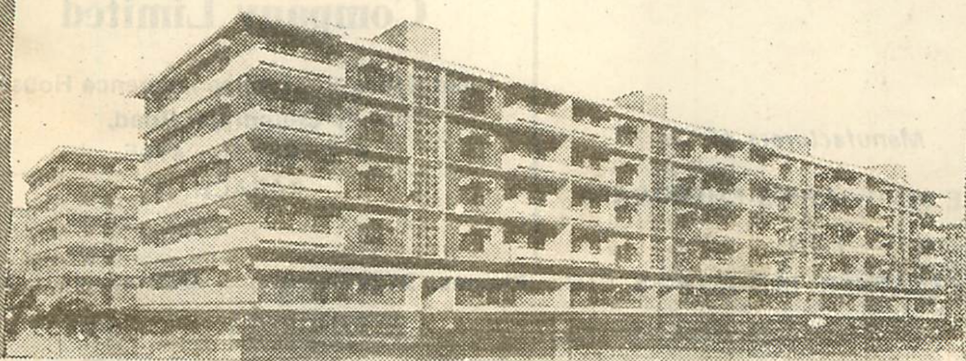

KSK AA-9,

With Compliments From

TRADING AGENCIES

Sole Agents	1. Paper & Paper Board
&	2. BEVEROL Oils & Lubricants
Indenting	3. VARTA Batteries
Agents :-	4. Many other sundries items

Cable :
MANITRADE
Phones :
23 90 80, 22 35 24

6-Fidvi Chambers,
M.A. Jinnah Road,
P. O. Box 5590
Karachi (Pakistan)

To Look Smart

Use

K. EYE CO.'s

Specticals & Sun Glasses

Special Discount for Medicos

K. EYE CO.

Near Mazzar, Bus Stop Light House,
M. A. Jinnah Road,
KARACHI.

With Compliments

from

Futehally Chemicals Ltd.

D-86, S.I.T.E., Karachi-16.

Manufacturers of

TEXTILE AUXILIARIES-CHEMICALS
FOR
PAPER & LEATHER INDUSTRIES ETC.

With Compliments

from

New Jubilee Insurance Company Limited

Head Office :- Jubilee Insurance House,
I. I. Chundrigar Road,
P. O. Box No. 4795,
KARACHI

Phones: 222621-26 Grams: "JUBINCO"

پروفیسر قیوم سالانہ
کھیلوں کا افتتاح کر
رہے ہیں۔

سالانہ کھیلوں کی
چند جھلکیاں

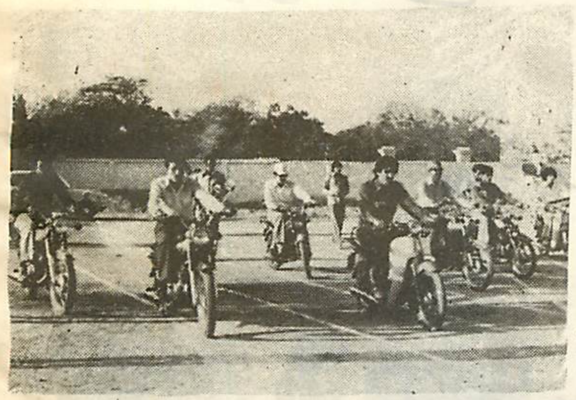

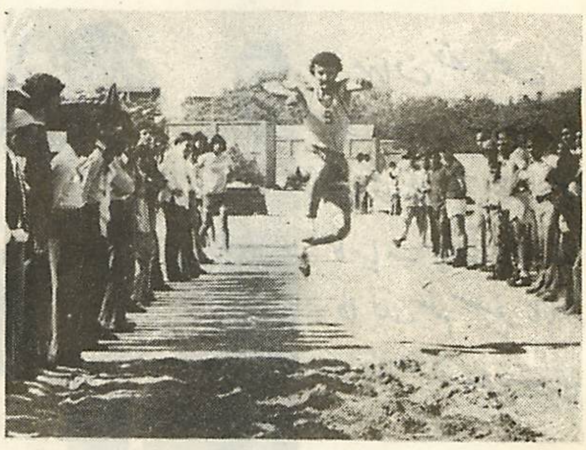

کھیل کے میدان میں

جیمخانہ سیکریٹری
اویس شفقت

تیراکی کا ایک منظر

مہمان خصوصی
جناب ادریس چاندنہ
تیراکی کے مقابلے میں
کامیاب ہونے والے
طالب علم سہیل تایانی
کو انعام دے رہے ہیں

New from Glaxo

Ventolin Syrup

widens the choice of Ventolin therapy for bronchodilatation without cardiac stimulation

Now you can prescribe Ventolin Syrup in cases of chronic bronchospasm where liquid therapy is preferred. The syrup has a pleasant strawberry flavour which makes it especially suitable for children. Like Ventolin Tablets and Inhaler, Ventolin Syrup is a selective bronchodilator with a wide margin of safety.

- Rapid and effective bronchodilatation.
- Acts on smooth muscle in bronchi and bronchioles without cardiovascular involvement.
- Long duration of action.

Indications

For the relief of bronchospasm in :

- Bronchial Asthma of all types
- Chronic Bronchitis
- Emphysema

Presentation

Ventolin Syrup is available in bottles of 60 ml, each 5 ml containing 2 mg salbutamol as sulphate.

Glaxo
-everything
for better health

Glaxo Pharmaceuticals
A Division of
GLAXO LABORATORIES (PAKISTAN) LTD

منی لائبریریز کا قیام

رسائل و جرائد اور دیگر کتب کی فراہمی

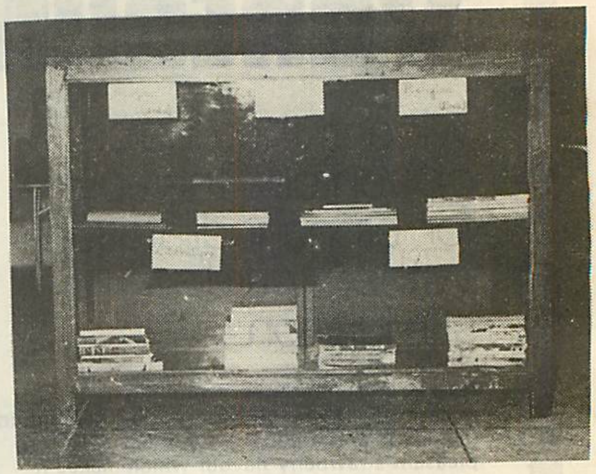

کالج گرلز کامن روم

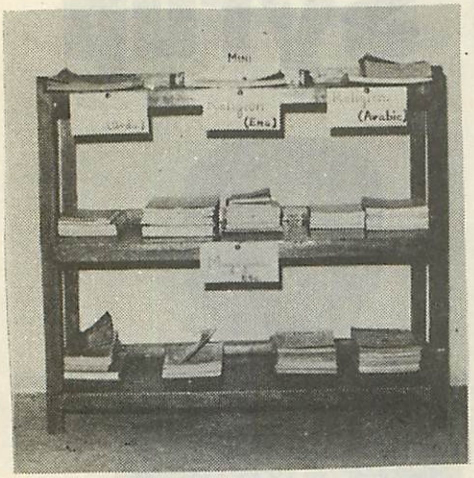

ہوسٹل گرلز کامن روم

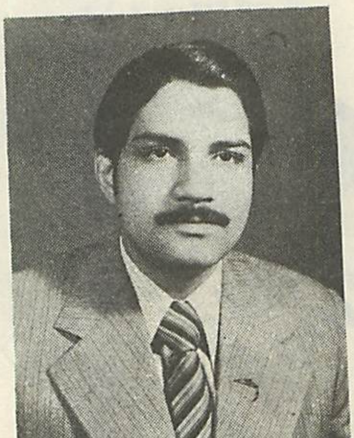

سلیم اصغر

اسسٹنٹ سیکرٹری لینڈنگ لائبریری

Ampicillin Beecham

Master in a changing world of infections

Over 2000 world references, including Pakistan, establish its efficacy and safety in all age groups.

Ampicillin/Beecham - no wonder it's the one which other antibiotics measure themselves against.

References and full information available on request.

Beecham

(PAKISTAN) LTD. P.O. Box 2802, KARACHI-1

B-M-10-75-R

ASIATIC

NDVP idea-men in action:

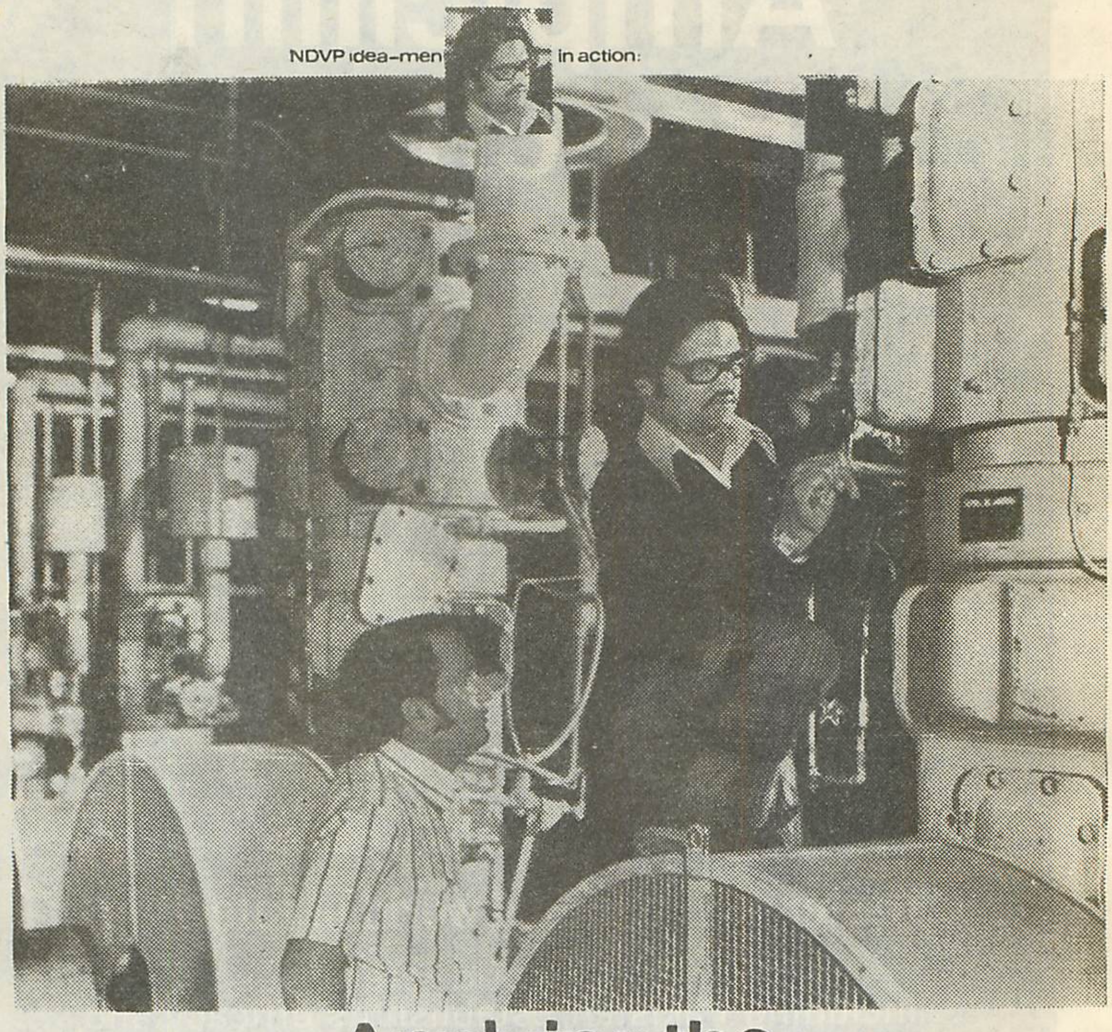

Applying the energy of youth to generate power for progress

– Karachi Electric Supply Corporation

NDVP

Join the Manpower Revolution

Participate in the National Development Volunteer Programme

NDVP Centre, 6th Floor, P.I.D.C. House Karachi
Telephones 512045 512046

MNJ

1٨9

ٹریٹ کی نئی پیشکش، انوکھی، نرالی

کریم سے بھرپور
نرم نرم شیو کیلئے

ٹریٹ لادر شیونگ کریم

ٹریٹ لادر شیونگ کریم کا بے پناہ جھاگ کریم سے لبالب ہے جس سے آپکی داڑھی کے بالوں کی سخت ترین جڑیں نرم پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے کریم سے لبالب ٹریٹ شیونگ کریم سے آپ آرام دہ اور سہل شیو بنا پاتے ہیں۔

ٹریٹ شیونگ کریم میں ایسی دلفریب مہک بھی ہے جو شہرۂ آفاق جدید ترین اور مردانہ ذوق کے مطابق ہے۔ ہر شیو کے بعد آپکو اک نیا احساس شگفتگی بخشتی ہے۔ ٹریٹ شیونگ کریم میں ایلنٹائن نامی جراثیم کش اور جلد کی حفاظت کرنے والے اجزا بھی شامل ہیں۔

ان سب خوبیوں کے علاوہ ٹریٹ شیونگ کریم میں اور بہت سی خصوصیات ہیں کیونکہ یہ شیونگ کریم ان تجربہ کار ماہرین کی تیار کردہ ہے جو سہل شیونگ کے بہتر انداز بخوبی جانتے ہیں۔

جانا پہچانا نام - آزمانا آپ کا کام

PRESTIGE T.S.C. 34, 8/72

10 + 11 = 1

this equation may not be correct

BUT

it holds true for

PFIZER MULTIVITAMIN MINERAL CAPSULES

10 VITAMINS + 11 MINERALS =

VITAMIN A	IRON
VITAMIN D	CALCIUM
VITAMIN B_1	PHOSPHORUS
VITAMIN B_2	IODINE
VITAMIN B_6	MANGANESE
VITAMIN B_{12}	POTASSIUM
NICOTINAMIDE	COPPER
CALCIUM PANTOTHENATE	MAGNESIUM
	ZINC
VITAMIN E	COBALT
VITAMIN C	MOLYBDENUM

IN THERAPEUTIC CONCENTRATION

to extend metabolic support during illness and convalescence and in stress conditions

JUST ONE CAPSULE A DAY

Pfizer

International sign of quality medicines

Chanda

JEWELLERS

G-7/A, AL-AZAM SQUARE MARKET, FEDERAL B. AREA, KARACHI

With Best Compliments

from

A & B FOOD INDUSTRIES

OFF ESTATE AVENUE, S. I. T. E.,

KARACHI

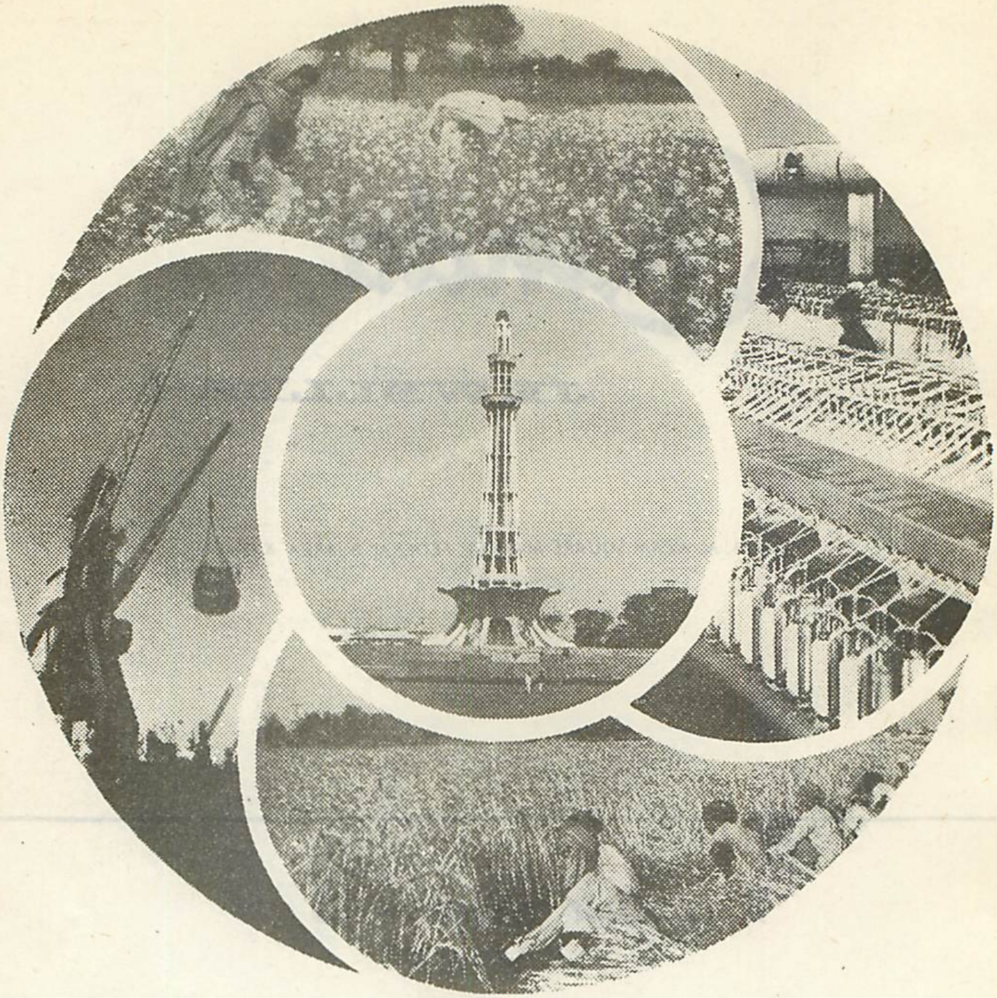

نیا اک نظامِ معیشت

بنانے میں شامل

نیشنل بینک آف پاکستان

IAL - NBP - 13 - 73

With Best Compliments

from

★
★
★
★

JILANI INDUSTRIES

A-47, S. I. T. E.,

KARACHI.

With Compliments

from

SHAIKH MOHAMMED ASHRAF

With Compliments

from

★
★
★
★
★

Pakistan Printing Ink Industries Ltd.

612, Mohammadi House,
I. I. Chundrigar Road,
KARACHI

لینڈنگ لائبریری کمیٹی

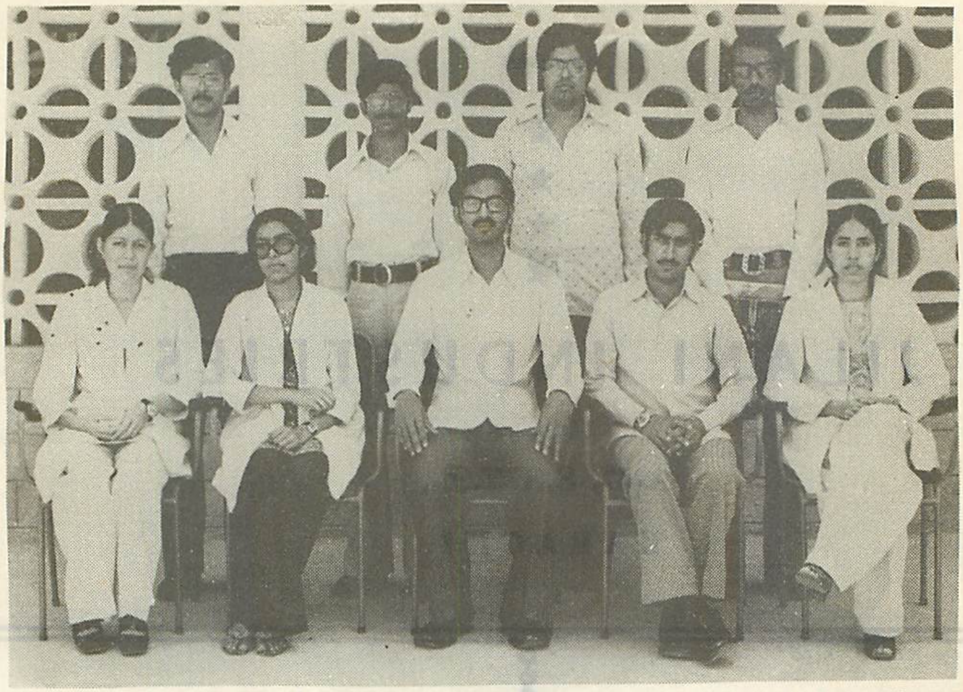

بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں) :- وزیدہ خانم، شوکت علی ملک (سیکرٹری) مصباح العزیز (صدر انجمن اتحاد طلبا) شائستہ ظفر ثمینہ شاکر
کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں) عطاء الرحمٰن، شریف ہاشمات، شفیق علی بیگ - اسلم صدیقی

سال چہارم کے طلباء کے کل پاکستان دورۂ خیرسگالی کے موقع پر نشتر میڈیکل کالج کے پرنسپل، اسسٹنٹ پروفیسر ارشاد وحید (ڈاؤ میڈیکل کالج) کو استقبالیہ میں تحفہ پیش کر رہے ہیں۔

اراکینِ کوئیز فورم

بیٹھے ہوئے: (دائیں سے بائیں) سہیل شارق، فریدالمبشر (سکریٹری)، پروفیسر عمر خان (چیرمین کوئیز فورم) محمد طفیل (سکریٹری بزم ادب و مباحثہ)
محمد اسلم — کھڑے ہوئے: (دائیں سے بائیں) شفیق علی بیگ، ہمایوں ظفر، انجم نوید، سید صادق میاں، سید راشد حسین

Best Dow Graduate
1972

Dr. Fauzia Quddus

یا جی چاہے تو نٹنگ کمپیوٹر سے سوئٹر تیار کریں۔

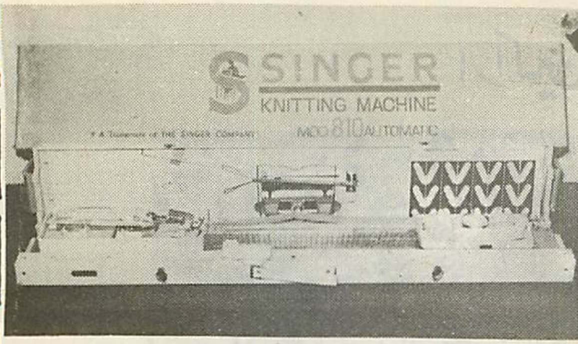

اب آپ کامن روم میں کپڑے سی سکتی ہیں

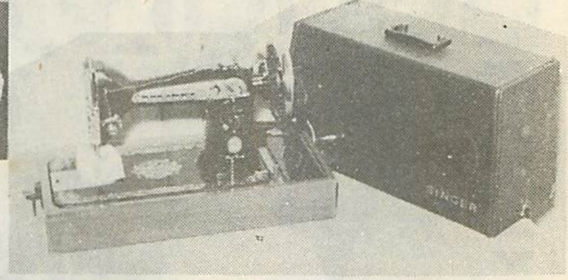

گرلز ہوسٹل کے کامن روم میں نئی آرائش و تنصیب

میڈم گرلز ہوسٹل کے کامن روم کی آرائش دیکھنا چاہتی ہیں۔

کہیئے مشین پائیدار رہے نا۔!

گرلز ہوسٹل کا کامن روم تو دیکھ لیا اب ذرا ستالیں آیئے!

بوائز کامن روم کی ترتیب و تزئین

سر! آپ فیتہ کاٹ کر ہی کامن روم میں داخل ہو سکتے ہیں۔

چلو ڈرافٹ کھیلیں!

آیئے ایک یادگار
گروپ فوٹو ہو جائے!

پروفیسر وحید
ایکشن میں

یونین کی سرگرمیوں کی چند جھلکیاں

یومِ فلسطین

یونین کے زیرِ اہتمام منائے جانے والے یوم فلسطین کے موقع پر ہونیوالے مذاکرہ میں صدر انجمن اتحاد طلبا مصباح العزیز، قطب الدین عزیز اور فلسطینی طالب علم عقیف خطاب کر رہے ہیں صدارت کمال احمد فاروقی نے کی۔

ریڈیو کا انتخاب بھی کوئی مسئلہ ہے؟
فِلپس
خریدیئے اور کئی دیگر فوائد حاصل کیجئے!
فلپس ۴ بینڈ ٹرانزسٹر ریڈیو
فلپس ۳ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
فِلپس کوالٹی
فِلپس گارنٹی
فِلپس سروس
فلپس ۲ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
فلپس ایک بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو
PHILIPS
ہمیشہ فلپس کی مصنوعات طلب کیجئے

زراعت ہماری معیشت کی بنیاد ہے
اور صنعت اسکا اہم ترین جزو۔

قوم کے معاشی مقاصد کیا ہیں؟

۱ : زراعت کو جدید بنا کر خوراک میں خود کفیل ہونا۔
۲ : صنعتی سرمایہ کاری کو فروغ دینا۔
۳ : پیداوار بڑھانا۔

یہ مقاصد حکومت، تجارتی حلقوں اور محنت کش عوام کی سہ فریقی کوششوں سے ہی پورے ہوسکتے ہیں۔

معاشی تعمیر کی اس جدوجہد میں مسلم کمرشل بینک اپنے بینکاری کے تجربے۔
سرمایہ کاری کی معلومات اور بین الاقوامی روابط کے ساتھ
اپنا کردار ادا کرنے کے لئے پوری طرح مستعد ہے۔

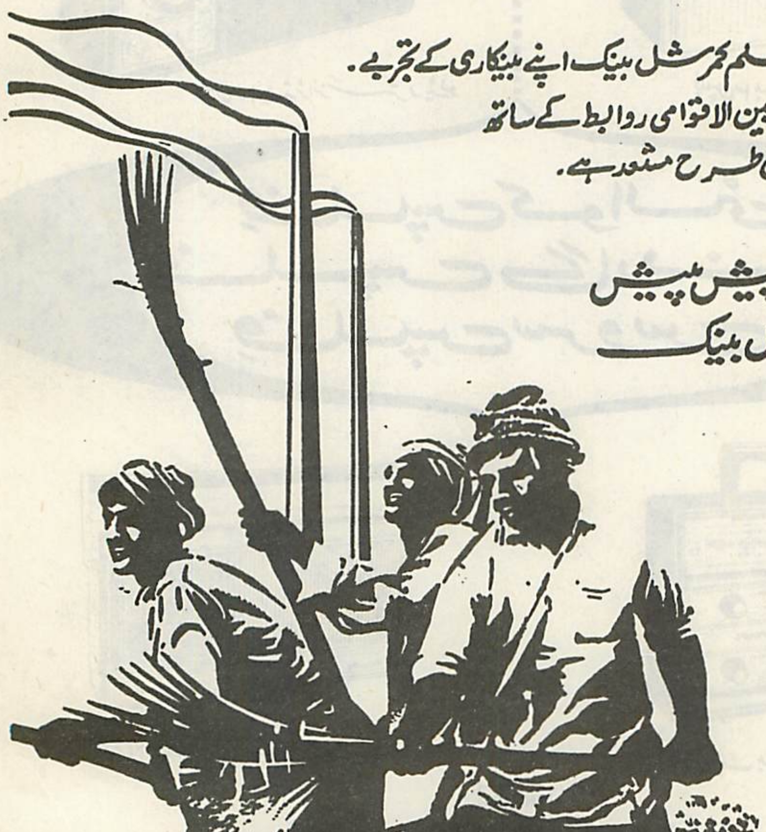

خدمت میں پیش پیش
مسلم کمرشل بینک
MCB

Ravi-Delmon Ltd - MCB-20-74-UD

قید کی سزا ہو گئی . . . . اندھیروں نے نہ صرف ارجن کو بلکہ کانتا کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی . . . کانتا خون اگلنے لگی . . . . اور ایک دن چپ چاپ اپنے اور ارجن کے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اس نگری سے رخصت ہو گئی . . . پھر جب ارجن کو رہائی ملی تو پھر اندھیرے . . . . گھٹا ٹوپ اندھیرے اس کے استقبال کو موجود تھے . . . . . . اب تو ان اندھیروں میں کانتا کی لائی ہوئی روشنی کی کرن کا وجود بھی ختم ہو چکا ہے . . . سب کچھ ختم ہو چکا تھا . . . پھر نہ جانے ارجن کہاں چلا گیا . . . . اب وہ دھرتی پر ایک بوجھ ہے اور اس کے دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہیں . . . . . بابا کی آواز بھرا گئی . . . . میں بابا سے لپٹ کر بے تحاشا رو دیا . . . . میرا دل چاہا کہ میں بابا سے کہوں کہ بابا کہہ دو کہ تم ہی ارجن ہو . . . تم اپنی تاریک کٹیا میں دن رات اپنی معذور ٹانگوں پر کمبل ڈال کر حقیقت نہیں چھپا سکے ہو . . . تم مجھے بہلا نہیں سکے ہو بابا . . . مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور پھر پتہ ہے بوڑھے چنار کیا ہوا؟ . . . دوسرے دن میرا بابا جو کہ دھرتی پر ایک بوجھ تھا . . . اس دنیا سے رخصت ہو گیا . . . بابا نے اندھیری راتوں کو دکھ دے کر چپ چاپ اپنی آنکھیں موند لیں . . . دھرتی ماتا نے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا . . . . . بابا کیا تم یہی کہانی سنانے کے لئے زندہ تھے . . . میں سوچتا رہ گیا . . . . میرا بابا میرے پاس ہوتا اور مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے تھا . . . . مگر لوگ روحوں کی سچائی کو نہیں پا سکتے . . . اوہ وقت کی گرد اڑا اڑ کر پھر میری آنکھوں کو دھندلا رہی ہے . . . . . لمحے پھیل رہے ہیں . . . . اندھیرا دبے پاؤں آنگن میں اتر آیا ہے . . . اور بوڑھا چنار سسکیاں لے رہا ہے . . . . . . مگر میرے احساسات پر وقت کی گرد جم گئی ہے . . . . . پرندے چپ چاپ اپنے آشیانوں میں سو رہے ہیں . . . . وقت کا بہاؤ اور تیز ہو گیا ہے . . . . ہوائیں بوڑھے چنار کی شاخوں میں چیخ رہی ہیں . . . . اور میں اندھیری رات میں بیٹھا چپ چاپ سوچ رہا ہوں . . . . میں اندھیری راتوں میں کبھی نہیں سوتا . . . کیونکہ مجھے بابا سے پیار ہے . . . . اور بابا اندھیری راتوں سے پیار کرتا تھا اور میں اندھیری راتوں کو دکھ نہیں دینا چاہتا . . . . وقت کی گرد بھی بابا کے زندہ تصور کو مٹا نہ سکی ہے . . . . . شاید اس لئے کہ اس دنیا میں ابھی ایسا پیار موجود ہے جو دل کی گہرائیوں سے کیا جاتا ہے . . . . میں سوچتا رہتا ہوں . . . . . . بے مقصد سوچیں . . . . . لامتناہی سوچیں . . . . اور بوڑھا چنار چپکے چپکے سسکیاں لیتا رہتا ہے . . . . . لیکن بابا کی ہنسی بوڑھے چنار کی سسکیوں اور میری تمام سوچوں پر محیط ہو جاتی ہے

بقیہ: ڈاکٹر اے۔ کے۔ غالب کی کلینک میں

آخر میں چلتے چلتے ہم نے ایک سوال اور پوچھنے کی جسارت کی جو عرصہ دراز سے ہمارے ذہن میں چبھ رہا تھا "ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس تمام امراض کا علاج ہے لیکن آج کی دنیا میں ہر شخص پس پردہ ہو غموں کا ہار لٹکائے نظر آتا ہے کیا اس کا بھی کوئی علاج ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا۔ اے "تازہ واردِ بساطِ ہوائے دل! آج کی دنیا کے تمام غم خود ہمارے پیدا کردہ ہیں ہر شخص کا دل خلوص و محبت جیسے لافانی جذبات سے عاری ہو چکا ہے، اگر آج ہم ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرنے لگیں اور پیار و محبت کا صحیح مفہوم سمجھ لیں تو یقین مانو اس مردہ چمن میں بھی بہار آسکتی ہے" اور ہمیں بھی حقیقی مسرتیں اور خوشیاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ ورنہ تو موت ہی ان غموں کا واحد علاج نظر آتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

ایسا محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر صاحب نے واقعی ہمارے غم کا علاج کر دیا ہو۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی اور ان کا مشہور شعر گنگناتے ہوئے گھر واپس چل دئیے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

مگر پھر ایک صدا آتی کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے۔
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

پھر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں.... اس وقت کبھی خزاں اور بہاریں چپکے چپکے آتی اور گزر جاتی تھیں..... لمحوں کی دھند وقت کی دھوپ میں پگھلتی گئی.... اور پھر نہ جانے کتنے سال بیت گئے..... پھر میری نگاہوں میں دکھ اور سکھ کا مطلب واضح ہو گیا... میں سمجھ گیا کہ اس دھرتی پر ہمیشہ سے اندھیرے اور اجالے کا کھیل جاری ہے.... اور بابا اندھیرے کا باسی ہے.... بہت سے لوگ اندھیرے کے باسی ہوتے ہیں ... مگر کچھ لوگ روشنیوں کا تعاقب کر کے وقتی طور پر اپنی زندگی میں گیتوں کی نغمگی شامل کر لیتے ہیں.... اور کچھ لوگ ہمیشہ تاریکی کو سینے سے لگائے چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں..... بابا بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا جن کے لئے جیون ایک چتا ہوتی ہے... اوہ..... شاید بوڑھا چنار سسکیاں لے رہا ہے... لیکن میں چپ چاپ چنار کے درخت سے ٹیک لگائے سوچتا رہتا ہوں.... شاید وقت کی گرد میرے احساسات پر بھی جم گئی ہے.... بوڑھے چنار! کیا تم میرے بابا کی کہانی سنو گے... ہاں ایک اندھیری رات میں بابا نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی.... اور وہ کہانی بابا کے زندہ تصور کے ساتھ میرے ذہن میں موجود ہے... ہاں تو بیٹے! بابا نے کہنا شروع کیا۔ بابا کے چہرے پر جھریوں کے خطوط کچھ اور گہرے ہو گئے..... آنکھوں میں سوچ کی لکیریں واضح ہو گئیں..... اس بستی سے پرے ایک اور بستی ہے.... اس بستی کے لوگ بہت اچھے تھے... امن و آشتی کے متوالے... اور گناہوں سے دور رہنے والے.... لیکن اس بستی میں کچھ برے لوگ بھی تھے.... ان میں ایک نوجوان تھا.... لوگ اسے ارجن کے نام سے جانتے تھے..... اس کی ماں اسی وقت مر چکی تھی جب وہ بہت چھوٹا تھا...... وہ محرومی کا شکار ہو گیا .... اس کے باپ کو کبھی اس سے محبت نہیں رہی تھی.... لیکن پھر یوں ہوا کہ اس کا باپ بھی مر گیا اور اس کے چچا نے اسے اپنے گھر رکھ لیا۔ ...... وہ سارے دن کام کرتا مگر چچا کی نفرت بھری نگاہیں ہمیشہ اس کا تعاقب کرتی رہتیں.... وہ چپ چاپ روتا رہتا اور کوئی اس کے دکھ کو سمجھنے والا نہ تھا.... اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ اور بچوں کی طرح اچھے کپڑے پہنے اور اسکول جائے.... کتنی معصوم سوچ تھی اور کیسی معصوم خواہش..... لیکن اس کی قسمت میں یہ سب نہ تھا کیونکہ وہ یتیم تھا..... مگر ارجن بہت ہی احسان فراموش نکلا.... جب اس نے بچپن کی حدود پھلانگ کر جوانی میں قدم رکھا تو ایک دن وہ اپنے چچا کا بہت سارا روپیہ لیکر بھاگ گیا...... سب نے اپنا سر پیٹ لیا... پولیس دوڑائی گئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا.... اور ارجن ہمیشہ کے لئے تاریکی میں ڈوب گیا..... دن کو شراب پینا اور جوا کھیلنا.... اور رات کو بڑے گھروں میں چوری کرنا.... یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا.... اندھیری راتیں اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے میں مدد دیتی تھیں..... لیکن پھر کانتا اس کی زندگی میں روشنی کی کرن بن کر آئی..... لوگ جس ارجن سے نفرت کرتے تھے..... وہ اسی ارجن سے پیار کرتے تھے....... اس نے تو یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کا ارجن چور تھا.... جواری تھا شرابی تھا ...... اس نے کچھ بھی تو نہ دیکھا..... بابا کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی..... بیٹا! ارجن محبت کا پیاسا تھا...... جب اس کو ذرا سا پیار ملا..... اس نے زندگی کی راہیں بدل ڈالیں۔ .... اس نے اندھیروں سے نکل جانا چاہا..... اس نے پیار کے سہارے نیک راہوں پر چلنا چاہا..... اس نے پیار کے دیپک سے اپنی تاریک زندگی کو روشن کرنا چاہا..... اور پھر اس نے کانتا کی بات مان کر چوری چھوڑ کر مزدوری شروع کر دی...... کانتا نے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا.... اس کے دکھ کو اپنی آنکھوں میں اتار لیا..... لیکن وہ دونوں کتنے ناداں تھے..... کتنے ناسمجھ تھے..... وہ نہیں جانتے تھے کہ اندھیروں کے باسیوں کو روشنی راس نہیں آتی..... بھنور میں پھنسے انسان اگر بھنور سے نکل بھی آئیں تو سمندر کی گہرائی ان کو نگل لیتی ہے.... ان دونوں کو ان کے سچے جذبے کی گہرائی نے نگل لیا...... ایک دفعہ ارجن مزدوری کے وقت دیوار سے گر پڑا.... اس کو ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا...... اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں... اور پھر ہسپتال میں ہی اس کو ایک آدمی نے پہچان لیا کہ یہ تو وہی ارجن ہے جو چند سال پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا.... پھر اسے دو سال

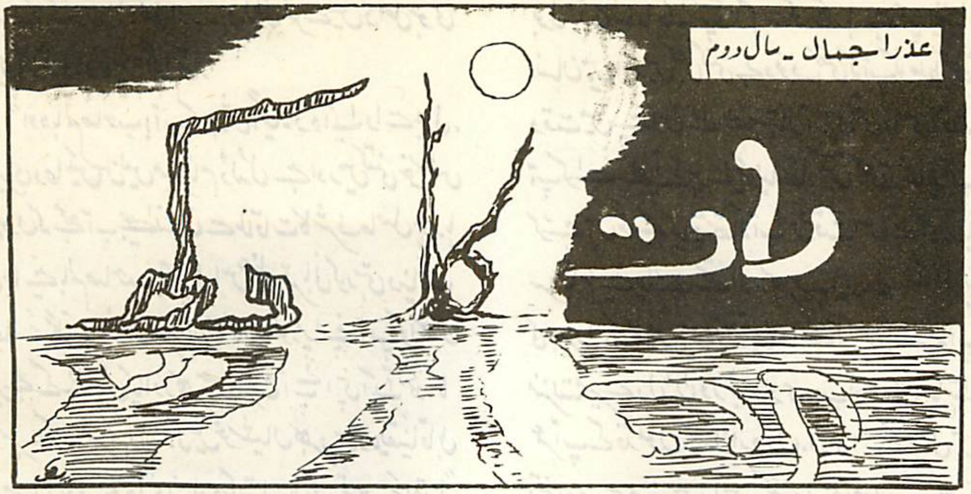

راتیں

جو اپنے اندر نہ جانے کتنی داستانیں سموئے رہتی ہیں.... حسین اور دلچسپ داستانیں.... خوفناک اور پراسرار داستانیں.... راتیں.... جب غریب اپنے سینوں پر دکھوں کا بوجھ اٹھائے نیند کی خوبصورت وادیوں میں کھو جاتے ہیں.... رات ان کا سارا دکھ اپنے تاریک آنچل میں چھپا لیتی ہے.... کتنی مقدس ہوتی ہے رات.... میں چنار کے بوڑھے درخت سے ٹیک لگائے گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں.... بے مقصد سوچیں.... لامتناہی سوچیں.

.... ہوائیں درختوں کی شاخوں سے چیختی ہوئی گزر جاتی ہیں.... بہاریں آتی ہیں۔ اپنے دامن میں شگفتگی کو سمیٹے ہوئے۔ تب درخت پر پرندے راگ الاپنے لگتے ہیں.... بہار کے بعد خزاں اپنے ڈیرے جما لیتی ہے.... اور تب درختوں کی پھیلی ہوئی ٹنڈ منڈ شاخیں یوں لگتی ہیں جیسے وہ مجھے اپنی گود میں سلا لینا چاہتی ہوں.... مگر شاید مجھے کسی سے پیار نہیں.... ہاں مجھے اپنی سوچوں سے پیار ہے اور اس بوڑھے چنار کے درخت سے.... لیکن نہیں مجھے تو اپنے سادھو بابا سے بھی پیار تھا.... میں سوچتا رہتا ہوں.... وقت کی گرد اڑ کر میری آنکھوں میں پڑ جاتی ہے.... اور پھر میری آنکھیں دھندلا جاتی ہیں.... مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا.... مگر سادھو بابا.... اسے تو میری تصور کی آنکھیں پھر بھی دیکھتی رہتی ہیں.... ہر چیز دنیا کے ہنگاموں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے.... ہوائیں چیخ چیخ کر دم توڑ دیتی ہیں.... پرندوں کے راگ رات کی تنہائی میں کھو جاتے ہیں.... اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا.. مگر سوچیں ازل سے ابد تک انسان کی ساتھی رہتی ہیں.... مجھے سادھو بابا سے پیار تھا.... شاید اس لئے کہ وہ بھی بہت سوچتا تھا.... بے مقصد سوچیں. لامتناہی سوچیں.... پھر وقت کا بہاؤ یادوں کے تمام نقوش کو مٹا دیتا ہے.... مگر بابا ایک زندہ تصور کی طرح میرے ذہن میں موجود رہتا ہے.... بابا جسے اندھیری راتوں سے پیار تھا.... ہاں وہ کہا کرتا تھا کہ راتوں کا حسن تو تاریکی میں ہوتا ہے.... اور چاندنی راتیں تو راتوں کا سارا حسن ختم کر دیتی ہیں.... کیسی عجیب سی سوچ ہے.... میں بابا کے کندھے پر سر رکھے چپ چاپ سوچا کرتا.... اور پھر حیرانی سے بابا سے پوچھ بیٹھتا.... بابا! تمہیں اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا.... بابا کے [illegible] پر سائے سے لہرانے لگتے.... بیٹا ہم تو سدا سے اندھیرو[illegible] کے [illegible] رہے ہیں.... ہم بھلا اندھیرے سے کیا ڈریں گے.... اند[illegible] سے تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جو روشنیوں کا تعاقب کرتے ہیں.... پھر بابا [illegible] ہنس دیتا.... کیسی عجیب باتیں کرتا ہے بابا.... میں معصومیت سے [illegible] .... پھر بابا کی ہنسی میری تمام سوچوں پر محیط ہو جاتی اور میں سب کچھ بھو[illegible] جا[illegible].... بالکل ایسے جیسے وقت کی گرد میری آنکھوں میں پڑ جاتی ہے اور

نے سوچا۔ یکایک دروازہ کھلا اور وہی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی جس کا پیچھا کرتا ہوا وہ پکڑا گیا تھا۔

"اوہ بالم صاحب! آپ کو ہوش آگیا۔ وہ ایک ادا سے بولی۔ خدا نے میری دعائیں سن لیں میرا نام دُلدُل ہے اور میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسے انسان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے یقین جانیے بالم صاحب! آپ کی اس عظیم قربانی کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا آپ نے جس طرح رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو اس سائنسی تجربے کے لئے پیش کیا اور پھر جس طرح آپ نے اپنی ایک آنکھ کا عطیہ دیکر میرے کزن سرگم کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دیں وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ اس وقت وہ اپنی شادی کی تیاریاں کرتے ہوئے یقیناً آپ کی اس عظیم قربانی کو یاد کر رہا ہو گا۔"

"کیا.....". بالم کی اکلوتی آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔

"بالم صاحب!" ولدل اس کی طرف پیار سے دیکھتی ہوئی بولی" آج سارا ملک آپ کے نام سے گونج رہا ہے آپ یقیناً ایک عظیم انسان ہیں اور میں بھی کتنی بے وقوف تھی کہ آپ کو غلط سمجھ بیٹھی، جس وقت میں اپنے کزن سے ملنے ہسپتال آرہی تھی، اسی وقت میں نے آپ کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں سمجھی کہ شاید آپ میرا پیچھا کر رہے ہیں مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ اس وقت اس سے بھی زیادہ عظیم کام سرانجام دینے جا رہے تھے اور پھر جب میں نے سنا کہ افریقہ میں آپ کی ہیروں کی کانیں ہیں تو یقین جانیے کہ اس بات نے آپ کی قدر و منزلت میرے دل میں اور بڑھا دی۔ اب تو جی یہی چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ کے قدموں تلے گزار دوں۔ اوہ! مجھے خیال ہی نہیں آیا اتنی دیر سے صرف میں باتیں کئے جا رہی ہوں۔ آپ بھی تو کچھ بولیئے نا۔ اور سنائیے۔ آپ کا بنک بیلنس کتنا ہے۔؟

اور کائنات جھوم اٹھی، دنیا گھوم اٹھی اور زندگی کا دامن خوشیوں سے بھر گیا۔

ھرنائی وولن ملز لمیٹڈ

- اونی کپڑوں کی صنعت کے پیشرو۔
- نت نئے خوشنما رنگوں کے کمبل تیار کرتا ہے۔

یہ کمبل بڑے پیمانے پر سندھ کے ہسپتالوں کو فراہم کئے جا رہے ہیں۔

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

کا ایک ادارہ۔

روتے تو وہ کون تھا جو اٹھ کر تمہیں بہلاتا۔ تمہارے کپڑے تبدیل کرتا۔ تمہارے پیٹ بھرنے کا سامان کرتا۔ مانا کہ یہ سب کام تمہاری آیا کرتی تھی مگر بازار سے دودھ کے ڈبے تو آخر میں ہی خرید کر لاتی تھی۔"

"ممی آخر کوئی وجہ بھی تو ہو، آخر آپ کس وجہ سے انکار کر رہی ہیں۔ سرگم نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"بیٹے! یہ ایک درد بھری داستان ہے، بیگم جہاندیدہ بولیں۔ یہ آج سے ۲۵ برس پہلے کا ذکر ہے۔ تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے میں اور بیگم طرم خان پڑوسی تھے اور اس عورت نے مجھے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ اس کی بلی تین مرتبہ میرے گھر کا سارا دودھ پی گئی اور جب ایک مرتبہ میں نے جھاڑو سے اس بلی کی اچھی خاصی مرمت کر دی تو یہ پھکنی لے کر مجھ پر چڑھ دوڑی۔ میں تو اس کا عرصہ حیات تنگ کر دیتی، مگر محلے والوں نے ہماری لڑائی سے تنگ آ کر ہمیں محلہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا اب تم خود ہی سوچو کہ اُس گھر کی لڑکی اس گھر کی بہو کیسے بن سکتی ہے جس کی ماں نے میری اتنی توہین کی ہو لہٰذا یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔"

* * *

سرگم آج بہت خوش تھا آخر کار بیگم جہاندیدہ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وہ یہی خبر بتاشہ کو سنانے کے لئے بے چین تھا اور اس کے گھر تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔

اس سے کچھ دور اسٹریٹ لیمپ کے اندھیرے میں کھڑا ہوا بالم اسے آتا ہوا دیکھ رہا تھا "اچھا تو یہ صاحب ہیں جو بتاشہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔ اب خاندان کی یہی ایک لڑکی تو بچی ہے اور یہ کم بخت اسے بھی مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ خیر آج کے بعد یہ حضرت بھی کیا یاد کریں گے۔ اس کے لبوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس کے پلان کو مکمل ہونے میں اب صرف چند ہی لمحے رہ گئے تھے" تو آج سرگم صاحب کا قصہ پاک ہو جائے گا۔" اس نے زیر لب کہا اور وقت گننے لگا۔ پانچ ..... چار ..... تین ..... دو ..... ایک ..... صفر ..... غڑاپ ...

اس نے نظریں اٹھائیں اور اپنے تڑپتے ہوئے شکار کی طرف دیکھا۔ آخر کار اس کا پلان کامیاب رہا تھا۔ سرگم کھلے ہوئے گٹر میں گرا ہوا مدد کے لئے پکار رہا تھا۔

* * *

"اب کیا ہوگا ڈاکٹر صاحب"؟ بیگم جہاندیدہ نے روتے ہوئے پوچھا۔ ان کے پیچھے کھڑی بیگم طرم خان اپنی بیٹی کو دلاسہ دے رہی تھیں جو کہ رونے دھونے کے بعد اپنا میک اپ درست کرنے میں مصروف تھی۔

"مریض کی حالت کافی نازک ہے۔" ڈاکٹر علیل نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ میں نے ڈاکٹر بیمار سے مشورہ کیا تھا۔ معدے میں کافی مقدار میں گندہ پانی چلا جانے کی وجہ سے بائیں آنکھ کی بینائی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔

"کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔" بیگم جہاندیدہ نے بے صبری سے پوچھا۔

"علاج کیوں نہیں ہے۔" ڈاکٹر علیل نے بیگم کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا، "ہم ایک نیا علاج آزمانے چلے ہیں۔ ایک ایسا علاج جو کہ نہ صرف اس ہسپتال میں بلکہ پوری طبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیگا شبراتی ..... شبراتی"! ... اس نے نوکر کو آواز دی۔

"جی صاحب"! شبراتی بولا "کوئی کام ہے"۔

"سنو!" ڈاکٹر بولا "تم کسی ہٹے کٹے اور جاندار آدمی کو لے کر نیچے چلے جاؤ اور ایک آدمی کو پکڑ لاؤ۔ تم تینوں کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہوگا ہمیں اپنے تجربے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے جاؤ۔"

* * *

بالم کو جب ہوش آیا تو وہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا اس کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے واقعات یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک لڑکی کا پیچھا کرتا ہوا ہسپتال تک آیا تھا۔ لڑکی تو ہسپتال میں داخل ہو گئی اور وہ باہر کھڑا ابھی سوچ ہی رہا تھا، کہ اندر جائے کہ نہیں کہ یکایک اسے کچھ آدمیوں نے پکڑ لیا اور پھر اسے گردوپیش کی کچھ خبر نہ رہی۔

"یہ میرے خلاف کوئی ناپاک سازش معلوم ہوتی ہے"۔ اس

اور نشہ آور بنا رہی تھی۔

"ایک بات سنو!" بتاشہ نے اپنے سینڈل میں سے پانی نکالتے ہوئے کہا" اب ہمیں شادی کی کوششیں شروع کر دینی چاہئیں۔"

"ابھی سے!" سرگم پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ابھی تو ہمیں ایکدوسرے سے ملے ہوئے صرف پندرہ دن ہوئے ہیں۔"

"ہیں! آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔" بتاشہ غصے میں سینڈل کو ہلاتے ہوئے بولی" میں ایک مشرقی گھرانے کی باحیا اور باکردار لڑکی ہوں اب اگر کبھی کبھی اپنے لوائے فرینڈز کے ساتھ کلب ڈانس کرنے کے لئے چلی جاتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر کوئی مجھ سے فلرٹ کرتا پھرے۔ کیا سمجھے؟"

"جی جی۔ بابا بالکل سمجھ گیا" سرگم سینڈل پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"تمہیں شاید پتہ نہیں کہ ہمارے ایک کزن بالم صاحب افریقہ سے اپنے لئے ایک عدد بیگم ڈھونڈنے کے لئے ٹور پر نکلے ہیں اور کل یا پرسوں ہمارے گھر وارد ہونے والے ہیں۔ ویسے تو اچھا خاصا امیر آدمی ہے اور بظاہر اس میں کوئی خرابی بھی نہیں مگر پتلون بھی تنگ ٹیڈی پہنتا ہے اور کم بخت کے جوتے بھی نوکیلے ہوتے ہیں۔" بتاشہ کچھ نرمی سے بولی۔

"یہاں بھی یہی حال ہے۔" سرگم ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔

"کل ہمارے رشتہ کی ایک خالہ بمع اپنی جوان بچی کے ہمارے گھر بغرض تبدیلی آب و ہوا آرہی ہیں۔ ان کا مقصد بھی ہمیں معلوم ہے ان کی بچی کا نام دلدل ہے اور ہیں تو اچھی خاصی مگر سگریٹ بہت پیتی ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی کوشش کرتا ہوں کہ امی جان تمہارے گھر رشتہ لے کر پہنچ جائیں۔"

"رشتے کی بات چھوڑو۔" بتاشہ بات کاٹتی ہوئی بولی۔ "آخر ہم کب تک یوں کھڑے بارش میں بھیگتے رہیں گے۔ بس تو نجانے کب آئے کوئی ٹیکسی کیوں نہیں لے لیتے۔"

"آخر بس میں جانے میں کیا حرج ہے۔" سرگم نے تنگ کر کہا۔

"اچھا! کرایہ میں دیدوں گی۔" بتاشہ بولی۔

"تو پھر اتنی دیر سے چپ کیوں بیٹھی تھیں" سرگم تبیسی نکالتا ہوا بولا۔ حد ہو گئی، اتنی دیر سے بھیگ رہے ہیں اگر بیمار ہو گئے تو کیا کرو گی۔ ٹیکسی — ٹیکسی — ٹیکسی۔"

اور گھر واپس آتے ہوئے بتاشہ سوچ رہی تھی کہ اس کا محبوب اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا اس نے اسے سمجھا تھا۔

* * *

سرگم نے ENO کی چوتھی گولی کھائی اور بے دم ہو کر صوفے پر گر گیا۔ آج دلدل نے سب کے منع کرنے کے باوجود گھر والوں کے لئے کھانا تیار کیا تھا۔ شاید اس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ اور اب اس کا خمیازہ سرگم کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ دوپہر سے وہ پیٹ کے درد سے تڑپ رہا تھا یقیناً اگر دلدل اسے اس وقت دیکھ لیتی تو اتنا گھوم پھر کر اس کے دل میں جانے کے بجائے کوئی سیدھا سادا راستہ منتخب کرتی۔ ابھی اس نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اس کی والدہ دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ممی!" وہ پیٹ کا درد بھول کر اٹھ بیٹھا۔ "ہو آئیں وہاں سے؟"

"ہو آئی ہوں!" بیگم جہاندیدہ نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور کان کھول کر سن لو منے — تمہاری شادی وہاں نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی ممی؟" وہ صوفے سے تقریباً اچھلتے ہوئے بولا" میں نے تو تقریباً اپنے تمام دوستوں کو بتلا دیا ہے۔"

"منے —" بیگم جہاندیدہ طیش میں آکر چلائیں" کہہ جو دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی!"

"ممی! میں بغاوت کردوں گا۔" سرگم جوش میں آکر بولا۔ "میں شر پسند بن کر اس ظالم سماج سے ٹکرا جاؤں گا!"

"منے!" بیگم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آج تم اپنی ماں سے لڑنے آئے ہو۔ اس ماں سے جس نے تمہاری خاطر اتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ یاد کرو وہ وقت جب تم چھوٹے سے تھے۔ تم راتوں کو

• شہاب جاوید ۔ سال دوم •

افسانہ

وِگ

وہ بڑی دیر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دعوت میں آیا ہوا نوجوان بھی بار بار اُسے گھور رہا تھا۔ اور آخر وہ آج اچھی بھی تو لگ رہی تھی، پندرہ رُپے گز والی شیفون کی گہرے بیگنی رنگ کی ساری پہ سلمی ستارے کا کام کیا ہوا تھا جس کے ساتھ میچنگ کرتی ہوئی جامنی رنگ کی لپ اسٹک نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ گلے میں پڑا ہوا لاکٹ اور کانوں کے بندے اس نے پچھلے ہی ہفتے بوہری بازار سے خریدے تھے چھوٹی چھوٹی کلیوں کے درمیان سفید موتی ٹکے تھے کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سیٹ صرف گیارہ رُپے میں خریدا گیا ہے، گلابی رنگ کا بلاؤز حالانکہ اس نے اپنی والدہ کا پہنا تھا مگر ساری سے خوب میچ کر رہا تھا۔ ساڑھے تین انچ کی ہیل نے اس کے چار فٹ دو انچ کے قد کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔ آج بس ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ اس نے وگ نہیں پہنی تھی۔ پچھلی دعوت میں ایک بچے نے کھینچ کر خراب کر دی تھی، لہٰذا اب بننے کے لئے گئی ہوئی تھی، اسے دعوت میں آتے وقت کچھ عجیب سا تو لگ رہا تھا کہ شادی کی دعوت میں بغیر وگ کے جا رہی ہے۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔

نوجوان اب بھی اس کو گھور رہا تھا یکایک وہ اٹھا اور اس کی طرف آیا، قریب پہنچکر وہ مسکرایا اور بولا "محترمہ! آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے آج وہی لباس پہنا ہے جو "آجا چھولے کھاجا" کی ہیروئن نے اس فلم میں اپنے چچا کے چھوٹے منے کی سالگرہ میں پہنا تھا"۔

"کیا واقعی" اس نے مسکرا کر کہا اور اپنی انگوٹھی دکھلانے کے لئے ہاتھ ایک ادا سے اوپر لے گئی۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا تعارف کراؤں، نوجوان خوشدلی سے بولا میرا نام سرگم ہے"۔

"اور مجھے تباشہ کہتے ہیں"، وہ گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

"کس قدر میٹھا نام ہے"۔ اس نے نام کی تعریف کی۔

جلد ہی وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ باتوں باتوں میں نوجوان نے اس سے پوچھا "آپ کے ہاتھ کافی سخت ہیں۔ میرا ہاتھ ابھی تک درد کر رہا ہے۔ کراٹے تو نہیں سیکھتیں آپ۔؟"

☼ ☼ ☼

آج ان کی ملاقات کا پندرھواں دن تھا۔ موسم بڑا رومانی ہو رہا تھا۔ صبح ہی سے بادل گھر آئے تھے۔ اور اس وقت تو کافی تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر سے بس اسٹاپ پر کھڑے بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پانی کی بوندیں ٹین کی چھتوں پر جلترنگ سا بجا رہی تھیں۔ اور دور کہیں سے آتی ہوئی دیپک راگ کی آواز ماحول کو

ذیابیطس اور حمل

موروثیت سے قطع نظر اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ آیا ذیابیطس کی مریضہ کو بچہ پیدا کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اس کو بچے کی کس قدر آرزو ہے اور اس میں حمل کے ہر مرحلے پر اپنے ڈاکٹروں کے ساتھ تعاون کرنے کی کس درجہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ تعاون کی صلاحیت صرف مریضہ کی ذہانت اور لگن پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار ایک حد تک اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک مناسب ہسپتال یا کلینک کا انتظام کر سکتی ہے جس میں مریضہ کو ہر وقت نگاہ میں رکھا جائے۔

ذیابیطس کی مریضہ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے بچے کی ولادت میں عجلت کی جائے گی۔ بچے کی پیدائش کی مقررہ مدت سے تقریباً تین ہفتے پہلے وضع حمل کے لئے تحریک پہنچائی جائے گی یا CAESAREAN OPERATION کے ذریعے سے رحم کو چاک کر کے بچے کو رحم سے نکالا جائے گا۔ ذیابیطس کی مریضہ حاملہ عورتوں کو وضع حمل کی طبعی مدت (۴۰ ہفتے) کیوں پوری نہیں کرنے دی جاتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر حمل کو وضع حمل کی پوری مدت تک برقرار رہنے دیا جائے تو تجربے نے یہ بتایا ہے کہ بچہ پھول کر بہت بڑا ہو جاتا ہے اور ایسے بچوں میں سے تقریباً ایک تہائی پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ ذیابیطس کی مریضہ کے حمل کا معاملہ خصوصی ماہرانہ استعداد کا متقاضی ہوتا ہے اور عام فیملی ڈاکٹروں کو اس کا تجربہ نہیں ہوتا اور انہیں وہ سہولتیں اور وسائل میسر نہیں ہوتے جن کو وضع حمل کے وقت ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ذیابیطس کے ہسپتال کے زچہ خانے میں وضع حمل کرانا چاہئے۔

اس دور میں ذیابیطس کی بیماری میں مبتلا عورتوں کے حمل کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزار دینے اور جیتے جاگتے اور صحیح سالم بچے کی پیدائش کو بالکل ممکن اور یقینی بنانے میں بڑی ترقی عمل میں آئی ہے۔ تاہم ہر قسم کی احتیاط کے باوجود ذیابیطس کی بیمار عورتوں میں سے چند کے بچے اب بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ یا تو وہ بطن مادر ہی میں مر جاتے ہیں یا پیدائش کے بعد دم توڑ دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو سکتی ہے کہ وہ عورتیں جن میں ذیابیطس کی استعداد ہو جاتی ہے اکثر بڑے وزنی بچے جنم دیتی ہیں نوزائیدہ بچے کا وزن عام طور سے ساڑھے سات پونڈ ہوتا ہے لیکن ان عورتوں کے نوزائیدہ بچوں کا وزن جن میں ذیابیطس کی استعداد ہوتی ہے آٹھ، نو، دس، بلکہ گیارہ پونڈ تک ہوتا ہے۔

امریکہ، کوپن ہیگن اور کنگس کالج ہسپتال میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ رحم میں بچے کی زندگی اور ماں کی ذیابیطس کی بیماری میں باہم اہم تعلق ہے۔ خصوصاً حمل کے آخری تین ماہ میں ذیابیطس پر کنٹرول انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

کنگس کالج ہسپتال حمل کے ۳۲ ویں ہفتے میں حاملہ کو داخل کر لیتا ہے اور اس کے بعد حاملہ کی ذیابیطس کی بیماری کو حتی الامکان کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔ اس صورت میں بچوں کی سابقہ شرح اموات ۲۵ فیصد سے گھٹ کر ۱۲ فیصد نیچے آگئی ہے۔

ذیابیطس اور جڑواں بچے

اگر ذیابیطس ایک موروثی بیماری ہے تو اگر ان میں سے کسی ایک بچے کو ذیابیطس کا مرض ہو تو دوسرے کو بھی لازماً یہ مرض ہونا چاہئے۔ لیکن اس میدان میں جو تحقیقات کی گئی ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ایک مماثل بچہ ذیابیطس کا مریض ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرے کو بھی یہی شکایت ہو۔ بلکہ ایسے مماثل بچوں کی صرف نصف تعداد میں ذیابیطس کی شکایت پائی جاتی ہے۔ دراصل یہ بہت حیرت انگیز دریافت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ذیابیطس کوئی موروثی بیماری نہیں ہے لیکن اس کی طرف رجحان البتہ وراثت میں ملتا ہے اور یہ کہ ذیابیطس کی طرف رجحان موٹاپن، چوٹ لگنے اور بوڑھے ہوتے چلے جانے سے زور پکڑتا اور شدت اختیار کر لیتا ہے۔ البتہ یہ خوش کن بات ہے کہ موجودہ دور میں جب کہ انسولین کی ایجاد ہو چکی ہے ذیابیطس کے مریض علاج اور پرہیز کے ساتھ بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی طبعی عمروں کو پہنچ جاتے ہیں۔

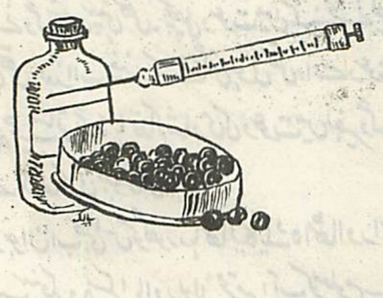

شکر خارج ہوتی ہے۔ شکر کے علاوہ یوریا اور فاسفیٹ کا اخراج بھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیشاب میں شکر کی خراش سے کبھی نائیٹرے یا حشفہ میں زخم ہو جاتا ہے۔ مردوں میں قوت باہ زائل ہو جاتی ہے اور عورتوں میں حیض کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ موتیا بند ہو کر بینائی ناقص یا زائل ہو جاتی ہے۔ آخر مرض میں سل یا نمونیہ یا اسہال سے مریض راہی ملک عدم ہو جاتا ہے۔

ذیابیطس کا علاج

اس مرض کا اصل سبب جوہر انسولین کی کمی ہے۔ اس لئے مریض کو انسولین استعمال کرائی جائے تو شکر کنٹرول میں رہتی ہے۔ انسولین میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اسے منہ کے رستے استعمال نہیں کرایا جاسکتا۔ کیونکہ معدے کی رطوبت اس کے اثر کو باطل کر دیتی ہے اس لئے اس کو انجکشن کے ذریعے سے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ انجکشن کے ذریعے سے جسم میں انسولین کی مقدار اور اوقات کا تعین آسان نہیں ہے اور اس کا استعمال ماہر ذیابطیس کی نگرانی میں ہی ممکن ہے۔ پھر روزیہ ایک دو مرتبہ انجکشن لینا بھی کافی ہمت طلب ہے۔

یہ مرض اکثر رنج و غم اور فکر و تردد سے لاحق ہوتا ہے۔ اس لئے مریض کو حتی الامکان پریشانی اور تردد سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اعتدال کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ ضعیف یا کم شدید ذیابطیس شکری میں غذا کے سخت پرہیز سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ علاج میں اس بات کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے کہ مریض کا جسم گھٹنے نہ پائے اور کمزور بھی نہ ہونے پائے۔

ذیابطیس سے آنکھوں کے امراض بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں موتیا بند خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ تجربے کے طور پر جب بعض جانوروں کو شکر زیادہ مقدار میں دی گئی تو وہ ذیابطیس میں مبتلا ہوئے اور موتیا بند میں بھی

ماہرین غذائیات کہتے ہیں کہ غلط غذائی عادات ہمارے جسم میں ہارمون کی تولید پر بُرا اثر ڈالتی ہے اور جب ہارمون وافر مقدار میں پیدا نہیں ہوتے تو ہمارے نظام اعصاب پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ جب ہارمون کے غدود متاثر ہوتے ہیں تو ہمارا جسم اور ہمارا کردار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ابھی تک قطعی طور پر ثابت نہیں ہو سکا کہ ذیابطیس واقعی ایک موروثی مرض ہوتا ہے۔ تاہم اس بات کا قطعی امکان ہے کہ دوران حمل میں بچے کو اپنی ماں سے جو خون ملتا ہے، اس میں بیماری کے جراثیم آجاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسے دوسری خصوصیات ودیعت ہوتی ہیں۔ صحت مند ماں کا بچہ تندرست اور بیمار ماں کا بچہ غیر صحت مند ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ماں باپ کے کرتوتوں کا خمیازہ اکثر اوقات اولاد بلکہ اولاد کی اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے، لہٰذا فلاح کا راستہ بہرحال صالح طرز زندگی ہے۔

مسلسل محنت اور جذباتی ہیجان بھی ذیابطیس کا موجب ہے۔ آجکل ہر روز ہزاروں آدمی حادثوں بلکہ موت سے بال بال بچتے ہیں۔ بچ تو جاتے ہیں لیکن نظام اعصاب کو جو جھٹکا لگتا ہے اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ سینما اور ٹی وی کے پردے پر آپ مختلف کرداروں کو خوف اور ہیجان کے مرحلوں سے گزرتا دیکھ کر خود بھی ویسے ہی جذباتی تلاطم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظام اعصاب خراب ہو جانے سے آپ کو ذیابطیس کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہنیز گرونیبر نے ایک بچے کا حال قلمبند کیا ہے جو والدین کے سخت برتاؤ سے ذیابطیس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بڑے دن کی تقریب پر ماں باپ نے اسے رشتہ داروں میں بھیج دیا جنہیں اس کی بیماری سے متعلق کوئی علم نہیں تھا۔ انہوں نے بیحد شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے خوب مٹھائیاں کھلائیں۔ ظاہر کہ مٹھائیاں ذیابطیس کے لئے زہر قاتل ہیں لیکن جو نتیجہ نکلا وہ سننے کے قابل ہے۔ یعنی اس تمام بدپرہیزی کے باوجود رشتے داروں کی شفقت والفت کے سبب بچے کا نفسیاتی اور اعصابی نظام ایسا ہموار ہوا کہ ان کے گھر وہ بالکل تندرست رہا۔

ڈاکٹر گرونیبر نے ۱۵ سال کی ایک لڑکی کا حال اور تحریر کیا ہے وہ ۱۳ مرتبہ ہسپتال میں داخل ہوئی۔ ہر بار نہایت مایوس اور بدحالی کے عالم میں اسے داخل کیا گیا لیکن ہر بار ہسپتال میں آتے ہی وہ کسی خاص پرہیزی غذا یا انسولین کے فوری انجکشن کے بغیر سنبھل جاتی۔ ڈاکٹروں کو جستجو ہوئی کہ یہ راز کیا ہے؟ جب خانگی حالات دریافت کئے گئے تو پتہ چلا کہ ہر مرتبہ جب اس لڑکی کا اپنی ماں سے کوئی شدید جھگڑا ہوا، اس کے بعد ذیابطس کی خطرناک کیفیتیں اس پر طاری ہو گئیں۔ تجربے کے طور پر اسے ایک تفریحی مرکز میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس کی حالت تیزی کے ساتھ خراب ہونے لگی۔ گھبرا کر اسے گھر لایا گیا اور وہاں آتے ہی وہ کامل تندرست ہو گئی۔ دراصل یہ لڑکی اپنی والدہ کی نفرت اور محبت کی کشمکش کا شکار تھی وہ اپنی ماں سے محبت کرتی اور اس کے ساتھ اس کا ایسا شدید جھگڑا ہو جاتا جو اس کی نرم و نازک طبیعت کے لئے ناقابل برداشت ہوتا۔

ڈاکٹر گرونیبر کا عقیدہ ہے کہ نفسیاتی علاج سے ذیابطیس کے بہت سے مریض یقیناً تندرست ہو جاتے ہیں۔ اس میدان میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے

جب شکر اپنا کام کئے بغیر جسم سے خارج ہو جاتی ہے تو جسم میں حرارت و قوت پیدا کرنے کے لئے بدن کی چربی اور گوشت سے شکر کا کام لینے کی کوشش کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم کی چربی اور عضلات تحلیل ہونے لگتے ہیں اور شکر کے ہضم میں اس خرابی سے نوشادر اور ACETONE BODIES وغیرہ مضر صحت اجزا پیدا ہونے لگتے ہیں جن سے مرض میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور ہلاکت تک نوبت آجاتی ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ لبلبے (PANCREASE) میں ایک ایسی رطوبت ہوتی ہے جو خون کے اندر دورہ کرتی ہوئی عضلات میں پہنچ کر شکر کے تحلیل و تجزیئے میں مدد دیتی ہے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ لبلبہ میں فتور پیدا ہو جانے سے پیشاب میں شکر آنے لگتی ہے۔ اگر لبلبہ کو پیٹ میں سے کاٹ کر نکال دیا جائے تو پیشاب میں فوراً شکر آنے لگتی ہے۔ بعض حیوانات کے جسم سے جگر کو خارج کر دیا گیا تو انہیں ذیابیطس شکری کی بیماری لاحق ہو گئی۔

انسانی دماغ کے بطن چہارم میں ایک مقام ہے جس کو (SUGAR PUNCTURE) کہتے ہیں۔ اگر اس مقام پر سوئی چبھو دی جائے تو بھی پیشاب میں شکر آنے لگتی ہے۔ زیادہ شیریں غذائیں کھانے سے خون کے اندر شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

ذیابیطس کے اسباب

یہ مرض عموماً ۲۵ تا ۳۰ برس کی عمر کے بعد ہوتا ہے۔ عورتوں کی نسبت مردوں میں دوچند ہوتا ہے۔ سیاہ اقوام کے مقابلے میں سفید اقوام کو زیادہ ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ خوش خوراک افراد کو زیادہ ہوتا ہے۔ یورپ میں یہود اور ہندوستان کے بنئے اس سلسلے میں پیش پیش ہیں۔ وہ اپنے پیشے کے اعتبار سے زیادہ وقت بیٹھے رہتے ہیں۔ غذا بھاری کھاتے ہیں اس لئے اکثر و بیشتر ذیابیطس میں مبتلا رہتے ہیں۔

کبھی یہ مرض موروثی بھی ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی خاندان کے دو تین افراد اس مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ میٹھی اور نشاستے دار اشیا کھانے اور محنت سے جی چرانے سے بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

فربہی (موٹاپن) بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ جسمانی محنت کرنے کے بعد جب کہ جسم گرم ہو یکایک سرد پانی پی لینا، زیادہ شراب پی لینا، دماغی محنت زیادہ کرنا، کثرت سے مجامعت کرنا، رنج و غم فکر و تردد یا دیگر صدمات سے دوچار ہونا۔ سر یا ریڑھ یا پیٹ پر چوٹ لگنا، لبلبہ کا چھوٹا ہو جانا یا اس کی رطوبت کا ناقص ہونا۔ لبلبہ یا نظام عصبی میں کسی قدر فتور آجانا اور کبھی ملیریا یا شدید نمونیہ یا دیگر میعادی بخاروں کے بعد یہ بیماری لگ جاتی ہے اور کبھی اس کا کوئی خاص سبب معلوم نہیں ہوتا۔

ذیابیطس کی علامات

(۱) اس مرض کی پہلی علامت یہ ہے کہ مریض کو پیشاب کثیر مقدار میں آتا ہے۔ ایسے مریض دیکھنے میں آئے ہیں جنہیں ۲۴ گھنٹوں میں ۱۷ پائنٹ (ایک پائنٹ = ۲۰ اونس) پیشاب ہو جاتا ہے۔ جس میں ایک سیر کے قریب شکر نکل جاتی ہے۔ مریض کا مثانہ کمزور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے

(۲) ذیابیطس کی دوسری شناخت یہ ہے کہ مریض کو بار بار پیاس لگتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ پیشاب زیادہ ہو جانے اور جسم سے پانی زیادہ مقدار میں نکل جانے کی وجہ سے مریض کی پیاس بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ پانی پیتا ہے

(۳) پیشاب کے ساتھ جسم سے شکر کے غیر معمولی اخراج کی وجہ سے مریض کو بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ یہ اس مرض کی تیسری علامت ہے۔

جوں جوں مرض بڑھتا جاتا ہے علامات بھی شدید ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب یہ مرض بڑھتا ہے تو منہ خشک رہتا ہے۔ شدت کی پیاس لگتی ہے دانت بوسیدہ ہو کر گر جاتے ہیں۔ مسوڑھے پھول جاتے ہیں اور ان میں درد ہوتا ہے۔ منہ کا درد شیریں ہوتا ہے۔ تنفس سے ایک خاص قسم کی میٹھی بو آتی ہے کبھی ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اور کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ لیکن اکثر ہاضمہ خراب نہیں ہوتا بلکہ بھوک زیادہ لگتی ہے اور کبھی بھوک کا ہوکا ہو جاتا ہے۔ عموماً قبض کی شکایت رہتی ہے۔ مریض روز بروز کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ پست ہمتی اور سستی چھائی رہتی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہوتا جاتا ہے، جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس پر خارش ہوتی اور بھوسی جھڑتی ہے۔ جلد پر داغ یا جھائیاں پڑ جاتی ہیں۔ کبھی ایگزیما کی شکایت ہو جاتی ہے۔ جسم کی حرارت کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں سرد مگر ہتھیلیاں اور تلوے گرم رہتے ہیں۔

پیشاب میں شکر کی مقدار اکثر دو یا ڈھائی فیصد ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ۱۰ سے ۱۲ فیصد تک ہوتی ہے۔ مریض رات دن میں پانچ سات سیر یا اس سے بھی زیادہ پیشاب کرتا ہے۔ جس میں پانچ سے بارہ، تیرہ چھٹانک تک

ذیابیطس

شکری آج کل کثیر الوقوع امراض میں سے ہے۔ اس مرض کی کثرت بھی جدید تہذیب کی بدعنوانیوں کا ثمر ہے۔ چنانچہ خوشحال اور مہذب ممالک میں اس مرض کی بہت کثرت ہے۔ اگرچہ یہ مرض بہت قدیم ہے لیکن اس مرض کی اتنی کثرت نہ تھی مغربی تہذیب جن ملکوں میں جس تناسب سے بڑھتی جاتی ہے دوسرے تہذیبی امراض کی طرح یہ مرض بھی اسی تناسب سے بڑھتا جارہا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی جدید تہذیب کے نفوذ کے ساتھ ساتھ اس مرض میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

یہ مرض دو قسم کا ہوتا ہے

(۱) ذیابیطس شکری (DIABETES MELLITUS)

(۲) ذیابیطس غیر شکری یا سادہ (DIABETES INSIPIDUS)

ذیابیطس شکری میں پیشاب میں مستقل شکر آتی ہے اور پھر پیشاب بکثرت آنے لگتا ہے لیکن ذیابیطس غیر شکری میں اگرچہ کثرت بول کی شکایت لازماً ہوتی ہے لیکن شکر کا آنا لازمی نہیں ہوتا۔ اس مرض کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ شکری یا نشاستائی مواد کو سمجھ لیا جائے۔ دراصل چربی، نشاستہ اور شکر تینوں کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنے ہیں۔ شکر ہمارے جسم میں حرارت اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ یہی کام نشاستے اور چربی کا بھی ہے۔ نشاستہ دوران ہضم میں شکر بن جاتا ہے۔ شکر اگر ضرورت سے زائد ہو تو وہ خصوصیت کے ساتھ جگر میں اور کسی قدر عضلات میں جمع رہتی ہے اور اگر اس سے زائد ہو تو وہ چربی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شکر ترکیب کے لحاظ سے عموماً دو قسم کی ہوتی ہے ایک شکر انگوری GLUCOSE جس کی ترکیب میں چھ حصے کاربن اور چھ حصے پانی ہوتا ہے اور دوسری نیشکر CAN SUGAR جس کی ترکیب میں دو چند کاربن اور تقریباً دو چند ہی پانی ہوتا ہے۔

تمام کی تمام نباتاتی غذاؤں میں تھوڑی بہت شکر ضرور ہوتی ہے نشاستہ دار غذاؤں میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے۔ صحت کی حالت میں خون کے اندر شکر کی مقدار صرف ایک ہزار حصے خون میں صرف ایک یا ڈیڑھ فی صد ہوتی ہے لیکن عضلات میں ایک ہزار حصے میں ۵ سے ۹ فیصد تک شکر ہوتی ہے۔ اگر عضلات میں شکر کم ہو تو اس کے تحلیل ہو چکنے کے بعد خود عضلات تحلیل ہونے لگتے ہیں۔

ذیابیطس شکری اور بول شکری میں شکر کے ہضم ہونے کا یہ طبعی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ شکر ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی اور پیشاب میں خارج ہونے لگتی ہے

وہی کرنل عاطف جس کی قیادت میں پاکستان نے پہلی مرتبہ اولمپک چمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ کرنل عاطف نے اپنی ٹیم کی تربیت میکسکو کی آب و ہوا کو مدنظر رکھتے ہوئے کرائی بالاخر کرنل عاطف کی محنت رنگ لائی اور پاکستان نے میکسکو اولمپک میں طارق عزیز کی قیادت میں اولمپک اعزاز دوبارہ حاصل کر لیا اس اولمپک فائنل میں پاکستان نے آسٹریلیا کو ۲-۱ سے شکست دی تھی اور فیصلہ کن گول سینٹر فارورڈ رشید جونیئر نے کیا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے میکسکو اولمپک کے بعد پاکستان کو دوسری بڑی کامیابی ۱۹۷۰ء کے ایشین گیمز کے فائنل میں بھارت کو ہرا کر حاصل ہوئی اس موقع پر بھی پاکستانی ٹیم کی قیادت طارق عزیز کے ہاتھ میں تھی اس طرح پاکستان نے اولمپک اور ایشین چمپئن ہونے کا اعزاز بھارت سے چھین لیا۔

پاکستان کو ہاکی میں تیسری بڑی کامیابی ۱۹۷۱ء کے پہلے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں نصیب ہوئی۔ یہ ورلڈ کپ بارسلونا میں منعقد ہوا اس ٹورنامنٹ میں پاکستان نے سیمی فائنل میں اپنے پرانے حریف بھارت کو ۲-۱ سے شکست دی تھی اور فیصلہ کن گول کراچی کے مایہ ناز فل بیک منورالزماں نے کیا۔ جبکہ فائنل میں پاکستان نے اسپین کو ہرایا فیصلہ کن گول بھی کراچی ہی کے اختر الاسلام نے کیا اس موقع پر بھی پاکستانی ٹیم کی قیادت طارق عزیز نے کی تھی ان کی زیر قیادت پاکستان بیک وقت اولمپک، ایشین اور ورلڈ کپ چمپئن رہا۔ اس ٹورنامنٹ کے بعد پاکستان کے اس مایہ ناز اور قابل فخر کپتان نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا

ان تینوں کامیابیوں کے علاوہ پاکستانی ہاکی فیڈریشن نے ۱۹۷۱ء میں لاہور میں انٹرنیشنل ہاکی فیسٹیول منعقد کرایا۔ جس میں آسٹریلیا مغربی جرمنی اور ہالینڈ جیسی ٹیموں نے شرکت کی۔ مزے کی بات اس فیسٹیول میں یہ تھی کہ پاکستان کی اے اور بی دونوں ٹیمیں فائنل میں پہنچی تھیں۔ اس لحاظ سے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک کے تین سال پاکستان کیلئے عروج کے سال تھے۔

۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان کو ہاکی میں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا پہلی ناکامی ۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپک میں ہوئی۔ سیمی فائنل میں پاکستان نے بھارت کو ہرایا۔ لیکن فائنل میں مغربی جرمنی کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس ناکامی میں ایمپائروں کی جانب داری کا بہت زیادہ دخل تھا۔ جس کی وجہ سے کپتان اسد ملک بہت زیادہ جذباتی ہو گئے اور شائستگی کا دامن چھوٹ گیا ورلڈ ہاکی فیڈریشن نے پاکستانی ٹیم کے تمام گیارہ کھلاڑیوں پر عمر بھر کیلئے فرسٹ کلاس ہاکی کھیلنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں ہونے والے دوسرے ورلڈ کپ کیلئے پاکستانی ٹیم کو منتخب کرنے پر کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ٹیم میں کچھ نئے اور کچھ پرانے کھلاڑی شامل کیے گئے۔ ٹیم کی قیادت سابق اولمپئن خالد محمود کے ہاتھوں میں آئی لیکن یہ ٹیم ایمسٹرڈم میں ہونے والے اس ٹورنامنٹ میں اچھے کھیل کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اپنے عالمی ٹائٹل کا دفاع نہ کر سکی۔ اور ہالینڈ عالمی چمپئن بن گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستان چوتھی پوزیشن حاصل کر سکا۔

۱۹۷۳ء میں پاکستان کے ہاکی کے کھلاڑیوں پر جو پابندی لگائی گئی تھی وہ ختم کر دی گئی اور اس طرح ستمبر ۱۹۷۴ء میں تہران کے ایشین گیمز میں پاکستان نے بھارت کو شکست دے کر ایشین چمپئن کا ٹائٹل برقرار رکھا۔

بقیہ : سایہ مسیحاؤں کے مسکن کی

صاحب کو اپنا چہرہ دکھائیں جسے عرف عام میں انٹرویو کہا جاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ الاٹمنٹ آرڈر مل گیا۔ لیکن اصل الاٹمنٹ آرڈر تو اس سے لینا پڑتا ہے جو کہ پہلے ہی سے اس کمرے میں (قانونی یا غیر قانونی) رہائش پذیر ہو اس کی مرضی ہوگی تو رکھے گا ورنہ ہمت مرداں مدد خدا اور قوت بازو کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہمارے ہاسٹل کو تقریباً ہر برائی سے پاک رکھا گیا ہے کہ نہ فون ہے کہ جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پیغام رسانی کا کام تو چوکیداروں سے ہو جاتا ہے۔ T.V. اسلئے نہیں رکھا کہ اس سے مستقبل کے ڈاکٹروں کے اخلاق کو خطرہ لاحق ہے اور کورس شاید اس لیے نہیں کہ کہیں کوئی نہ نہ کھیل جائے۔

بھلا کرے خدا ہمارے وارڈن صاحب کا کہ ہمیں اتنی زیادہ سہولتیں دے کر اب ہاسٹلز کا راستہ ہی بھول گئے ہیں کہ ہمیں ان سے مستفید ہوتا دیکھیں۔

پاکستان میں ہاکی کی تاریخ اور اس کا مقام

محمد اسلم صدیقی
سال دوم

ہاکی دنیا کا قدیم ترین کھیل ہے۔ قدیم یونان اور مصر میں کافی مقبول تھا لیکن اس دور میں اس کے قواعد وضوابط مختلف تھے۔ جدید دور میں اس کھیل کا آغاز انگلستان میں ہوا۔ جہاں سے امریکہ پہنچا۔ امریکہ میں اس کھیل کو خواتین کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کے بعد یہ کھیل یورپ کے دوسرے ممالک میں پہنچا۔ اسپین، ہالینڈ اور جرمنی میں اس کھیل کو خاصی ترقی نصیب ہوئی۔ اس کھیل کا ایشیا میں باقاعدہ آغاز سنہ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ ایشیا میں برصغیر پاک و ہند اور جاپان میں اس کھیل کو خاصا فروغ ہوا۔ ایشیا کے علاوہ یہ کھیل افریقہ اور اسٹریلیا میں پہنچا۔ خاص طور پر اسٹریلیا اور کینیا میں اس کھیل کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۸۹۸ء میں انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا اس کھیل کو اولمپک میں پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں شامل کیا گیا۔ برطانیہ کو ہاکی میں پہلا اولمپک چمپئن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ہندوستان کی پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں حصہ لیا اور پاکستان کی ہاکی ٹیم نے ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ اولمپک میں حصہ لیا۔ اس اولمپک میں انگلستان نے طلائی تمغہ حاصل کیا جبکہ دوسری تیسری اور چوتھی پوزیشن بالترتیب ہندوستان، ہالینڈ اور پاکستان نے حاصل کی اس ٹیم میں پاکستانی ٹیم کی قیادت میاں سعید نے کی۔

تقسیم برصغیر کے بعد پہلی مرتبہ اولمپک چمپئن کا اعزاز یورپ سے منتقل ہو کر ہندوستان اسوقت پہنچا جب ہندوستان نے ۱۹۵۲ء کے اولمپک کھیلوں میں پاکستان کو فائنل میں ہرایا۔ یہ کھیل ہلسنکی میں منعقد ہوئے تھے۔ ہندوستان نے اپنے اس اعزاز کا کامیاب دفاع ۱۹۵۶ء کے اولمپک میں بھی کیا اور پاکستانی ٹیم کو فائنل میں ایک مرتبہ پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اولمپک مقابلوں میں دوسری مرتبہ فائنل میں پاکستان کو ناکامی کے بعد پاکستان ہاکی فیڈریشن نے آئندہ اولمپک کی تیاری کیلئے کئی ٹورنامنٹ منعقد کرائے جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور پاکستانی ٹیم کو کرنل عاطف جیسا شخص کپتان کے روپ میں ملا۔ ۱۹۶۰ء کے روم اولمپک میں پاکستان نے پہلی مرتبہ اولمپک چمپئن شپ جیت لی۔ اس اولمپک میں پاکستان نے اپنے حریف بھارت کو فائنل میں ہرایا۔ میچ کا فیصلہ کن گول پاکستانی ”مائیٹی ماؤس“ ”نصیر بندہ“ نے کیا۔ بدقسمتی سے ۱۹۶۴ء میں منعقد ہونے والے اولمپک میں پاکستان اپنے اس اعزاز کا دفاع نہیں کر سکا اور امپائرون کی جانبداری کی بدولت بھارت اولمپک بن گیا۔

۱۹۶۶ء کے ایشین گیمز اور ۱۹۶۸ء کے اولمپک کیلئے پاکستان نے ابتداء ہی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ لیکن اس کو ایشین گیمز میں جو کہ بنکاک میں منعقد ہوئے فائنل میں بھارت کے ہاتھوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء کے اولمپک کیلئے کرنل عاطف کو منیجر بنایا گیا

میری آنکھیں کچھ دیکھ رہی ہیں .... میرا دل کچھ سن رہا
ہے .... میری روح کچھ سوچ رہی ہے .... شاید
.... سحر قریب ہے .... آؤ سنو! میری منزل قریب
ہے .... وہ دیکھو! .... افق کے پار ستاروں کا راستہ
کیسا جگمگا رہا ہے، مسرتوں کا چاند انگڑائی لے رہا ہے، چاندنی بکھرتی جا رہی ہے
.... اور .... میں سوچ رہا ہوں .... میری منزل،
تو سیاہ بہت .... سحر قریب ہے .... وہ دیکھو!
دور .... کچھ دور .... سامنے .... پہاڑیوں سے ایک
کرن پھوٹی ہے .... یہ کیسا اجالا ہے .... یہ کیسی روشنی
ہے .... نفرت کی سیاہ رات کے دامن میں چمکیلی لکیر کی طرح ....
.... تعصب کی چنگاریوں پر محبت کے چھینٹے کی طرح ....

فاصلوں کے طویل رستوں میں قربت کی ندی کی طرح .... کرن پھوٹ
رہی ہے .. ..
میں سوچ رہا ہوں .... میرے قدم کچھ اور تیز ہو گئے ہیں
میری زنجیروں سے وہی لازوال نغمہ پھوٹ رہا ہے، میری بیڑیوں سے
صدائیں نکل رہی ہیں .... آؤ .... میرا ہاتھ تھام لو ....
.... آؤ .... میرے ساتھ قدم بڑھاؤ ....
آؤ! .... یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی، یہ بیڑیاں کٹ جائیں گی
....
قافلے آتے رہیں گے .... آتے رہیں گے ....
.... میری طرح .... میں جو ایک مسافر ہوں ....
.... مجھے سحر کی تلاش ہے۔

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کی مطبوعات

جنرل بُکس :

۱۔ خاندان اور برادری کی نشوونما	ڈاکٹر مہرالنساء احمد	(زیرطبع)
۲۔ مغل ہندوستان (E)	ڈاکٹر حمیدہ خاتون نقوی	۵۰/- روپے
۳۔ ارسطو سے ایلیٹ تک	ڈاکٹر جمیل جالبی	۸۰/- روپے
۴۔ موئنجو دارو (E)	مرتبہ : احمد نبی خان	(زیرطبع)
۵۔ اللہ کی تلوار	میجر جنرل اے۔ آئی۔ اکرم	〃
۶۔ پنجابی لوک داستانیں	شفیع عقیل	〃
۷۔ سندھ اے لینڈ آف لیجنڈس (E)	میجر معین الدین	〃
۸۔ سوشل آرڈر اِن پاکستانی سوسائٹی (E)	ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ بقائی	۵۰/- روپے
۹۔ اسلامک جورسپروڈنس (E)	کمال اے فاروقی	(زیرطبع)
۱۰۔ چائنا اینڈ ورلڈ پاورز (E)	ڈاکٹر نذیر۔ اے۔ مغل	〃
۱۱۔ برٹش ریلیشنز وِدھ سندھ (E)	ڈاکٹر ڈو آدٹ	〃
۱۲۔ سائنٹیفک پرنسپلز آف نرسنگ (E)	گرنگ اینڈ ڈیس	(زیرطبع)
۱۳۔ شاداب منزل مراد	ماجد صدیقی	〃
۱۴۔ سی قی دو مقصد م	آرمی اپرنٹس اسکول	۹/- روپے
۱۵۔ سنشیر ت مید ل بایوکمسٹری (E)	ڈاکٹر مشتاق احمد (E)	(زیرطبع)
۱۶۔ جمالیات	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	〃
۱۷۔ فلسفے کے بنیادی مسائل	قاضی قیصر الاسلام	〃
۱۸۔ لاز آنہ ٹوینگ ( )	محمود شام	〃
۱۹۔ چند تعلیمی مسودات	پروفیسر شبیر علی کاظمی	〃
۲۰۔ اے ہسٹری آف ایجوکیشن اینڈ تھیوری (E)	ڈاکٹر۔ اے۔ غنی	۶۰/- روپے
۲۱۔ ایجوکیشن ریسرچ تھیوری	پروفیسر پرویز شامی	(زیرطبع)
۲۲۔ ایجوکیشن (E) دوسرا ایڈیشن	مسز تنویر خالد	〃
۲۳۔ نیو ٹیڈ میکس	ڈاکٹر والٹر کا فمین	۲۸/- روپے

نیشنل بُک فاؤنڈیشن
کراچی — اسلام آباد — لاہور — پشاور — کوئٹہ

نیشنل بُک فاؤنڈیشن	نیشنل بُک فاؤنڈیشن
وتر ہاؤس	ڈسپلے سینٹر،
ٹیلی فون ۸۳ — -	ٹیلی فون : ۵۱۰۲۷۳

جانے کیا ہوا .... میں حیران تھا .... سحر خاموش
تھی .... اس کی مسکراہٹ چھن چکی تھی .... ہر طرف
اندھیارے تھے .... بجھے بجھے چراغ تھے .... اداس اداس
دھواں تھا .... سوگوار سے بادل تھے .... اور .... میں
.... بے چین ہوگیا ....

میں .... اس راستے کو دیکھ رہا تھا، جو ازل سے ابد تک
ابتدا انتہا سے بے خبر، سیدھی لکیر کی مانند چلا جا رہا تھا۔ اس کے دونوں جانب
.... دور دور .... سروں کے چراغ تھے .... روشنی
پھوٹ رہی تھی .... پر اس راستے پر کانٹے ہی کانٹے تھے ....
میں دیکھ رہا تھا .... میں دیکھ رہا تھا ....
مٹے مٹے قافلوں کے نشاں .... شوق کے پُر نور مینار ..
.... گریبانوں کی بکھری دھجیاں .... زنجیروں کے ٹکڑے
.... امیدوں کے جلتے بجھتے دیپ .... اور ....
مقدس خون کے قطرے ....
میں دیکھ رہا تھا .... میں دیکھ رہا تھا ....
میری روح مضطرب ہوگئی .... میرا دل بے چین ہوگیا
میری نظریں تڑپ اٹھیں .... اور میرے قدم اُٹھ گئے ....
خود بخود .... جانے کب میں چل پڑا .... اسی راستے پر .....
اسی سیدھی لکیر پر .... میں نے کتنی ہی داستانیں بنتے اور مٹتے
دیکھیں .... کتنے ہی قافلے بڑھتے اور لٹتے دیکھے .... کتنے
ہی چاک گریباں دیوانے دیکھے .... میں دیکھتا رہا .... میں
چلتا رہا .... مجھے سحر کی تلاش تھی ....
میں نے چاک گریباں دیوانوں کو یہ بات بتائی، میں نے شفق کے
بکھرتے رنگوں کو یہ کہانی سنائی، میں نے خلوص کی دیویوں کو اس کے نغمے سنائے
میں نے مقدس آنچلوں سے خوشبوؤں کے قصے چھیڑے، میں نے بادلوں کے
سرمئی ٹکڑوں کو اپنا ہمراز بنایا۔ میں نے محبتوں کے گیت بکھیرے ....
اور بکھرتا ہوا چلتا رہا .... چلتا رہا ....
پر یہ دیکھ رہے ہو نا .... یہ زنجیریں، یہ بیڑیاں، یہ پیوست
جاں خنجر، یہ گرتے خون کے قطرے ....

تم کچھ پوچھ رہے ہو .... ! تم جانو! میرے راستے میں
تعصب کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں، نفرت کا دھواں پھیل رہا تھا .....
.... آدم کے بیٹے صلیبوں پہ چڑھ رہے تھے۔ منصوروں کے گلے میں
انا الحق کی صدائیں گھٹ رہی تھیں، آنچلوں کا تقدس چھن رہا تھا، محبتوں
کے ورق سوکھے پتوں کی طرح بکھر رہے تھے ....
میں نے ہاتھ بڑھایا .... میرے ہاتھوں میں بیڑیاں
پہنادی گئیں .... میں نے بولنا چاہا .... میرے ہونٹوں
پہ تالے ڈال دیئے گئے .... میں آگے بڑھا، میرے پیروں میں
زنجیریں ڈال دیں .... پھر بھی میں بڑھتا رہا .... میں بڑھتا رہا
.... زنجیریں بجاتا ہوا .... بیڑیاں کھڑکھڑاتا ہوا .....
.... نغمے گونجتے رہے۔ گیت بکھرتے رہے .... میرے سینے
پر کتنے ہی خنجر آآ کر لگے۔ خون گرتا رہا .... گرتا رہا ....
کہکشاں بنتی رہی .... روشنی بکھرتی رہی ....
میں ایک مسافر ہوں .... !
جانے کتنی دیر ہوگئی کہانی سناتے سناتے .... کتنی
صدیاں بیت گئیں .... کتنا سفر کٹ گیا .... پر یہ تم
میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تم اس کہکشاں کو دیکھ رہے ہو ....
.... تم اس رہ گذر کو دیکھ رہے ہو .... تم ٹپکتے ہوئے
خون کے قطروں کو دیکھ رہے ہو ....
تم کچھ کہہ رہے ہو .... کچھ کہہ رہے ہو ....
تمہیں یہ راستہ نظر آرہا ہے نا .... چمکیلا چمکیلا
.... پر نور راستہ .... مجھے ابھی بڑا طویل سفر
طے کرنا ہے .... مجھے سحر کی تلاش ہے .... میں
چلتا رہوں گا .... چلتا رہوں گا .... میں ایک مسافر
ہوں ....
میرے قدم تھکتے نہیں .... میرے لب سوکھے نہیں
.... میرے ہونٹ خاموش نہیں۔ میرا دل آج بھی چپکے چپکے
سرگوشیاں کر رہا ہے .... میری روح آج بھی بے چین ہے .....
.... میری آنکھوں کو آج بھی انتظار ہے ....

میں ایک مسافر ہوں .... پابہ جولاں .... زخمی زخمی .... میرے پیروں میں زنجیریں .... میرے ہاتھوں میں بیڑیاں ..... میرے سینے میں خنجر .... میرے بدن سے لہو ٹپک رہا ہے .... میرے راستے میں کانٹے بچھے ہیں .... میری روح مضطرب ہے .... بے چین ہے .... میں ایک مسافر ہوں ۔

مجھے تلاش ہے .... مجھے جستجو ہے .... ایک حسین سحر کی .... ایک رنگین صبح کی .... ایک چمکیلے سورج کی .... جو کرن کرن روشنی بکھیر دے، جو کلی کلی زندگی کا پیغام دیدے ۔ .... مجھے تلاش ہے .... میں ایک مسافر ہوں .... مجھے سحر کی تلاش ہے ۔

آؤ! میری کہانی سنو! یہ زنجیریں، یہ بیڑیاں، یہ گرتے خون کے قطرے .... تم سے کچھ کہہ رہے ہیں .... آؤ سنو! یہ داستان بہت پرانی ہے .... بہت ہی پرانی .... اور میرا سفر بھی بڑا طویل ہے .... عرصہ ہوا، زمین کی حسین وادیوں میں بڑی چمکیلی سحر تھی .... ہر طرف کرن کرن اجالے تھے .... کلی کلی تبسم تھا .... پھول پھول مسکراہٹ تھی .... دریا دریا گیت تھے .... چہرہ چہرہ خلوص تھا .... آنکھوں آنکھوں میں روشنی تھی .... آنچل آنچل خوشبو تھی .... دامن دامن پیار تھا .... بادلوں کے حسین سائے تھے ۔ بادِ مراد کے جھونکے تھے .... محبتوں کے تذکرے تھے .... قربتوں کے چرچے تھے

وہ ایک بڑی پیاری صبح تھی .... نئی نویلی عروس کی طرح .... اور ———— ! میں .... اسی صبح کا باسی تھا .... میں ان اجالوں کا شناسا ۔ میں ان محبتوں کا راز داں تھا .... میں ان گیتوں کا گویا تھا .... میں ان نغموں کا خالق تھا ۔ میں اس خلوص، اس روشنی اور اس خوشبو کا پرستار تھا .... میں ان آنچلوں کا محافظ تھا ....

میں ایک مکیں تھا .... ایک پرستار تھا .... ایک محافظ تھا .... پر .... جانے کیا ہوا .... کیسے ہوا .... سحر کی روشنی کم ہونے لگی .... صبح افسردہ ہوگئی .... کلی کلی خزاں چھاگئی .... نغموں کا خمار اترا .... گیتوں کی تان ٹوٹی .... آنکھوں میں روشنی ختم ہوگئی .... آنچلوں کی خوشبو جانے کہاں اڑ گئی ۔

"اُچھا چھوڑو یہ موضوع۔ تم یہ سب نہیں سمجھ سکتیں۔" پرویز کی مدھم آواز ابھری۔ کچھ وقفے بعد پھر بولا "ہاں تم کون کون سی کتابیں پڑھتی ہوں ؟"

"بس اس کالے تابوت میں جو کتابیں بند ہیں ان کے علاوہ سب پڑھتی ہوں۔ ابا یہ کتابیں خدا جانے کیوں مجھے نہیں پڑھنے دیتے کسی دن رات کو چپکے سے پڑھوں گی۔ میں نے سوچ رکھا ہے" چچا کے کراہنے کی آواز آئی۔ "راحیلہ بیٹے کہاں ہو؟ پانی پلا دو۔" "آئی ابا یہاں ہوں" اور میں پرویز میاں کے باہر نکلنے سے پہلے ہی بیٹ میں اتنی باتوں کا بوجھ اٹھائے فوراً دبے پاؤں دروازے سے کھسک لیا۔ تین دن تک پرویز سے بات کرنے کو دل نہیں چاہا۔ افسوس اس بات کا زیادہ تھا کہ وہ پرویز جو اپنی ہر بات مجھے بتاتا تھا اس نے دوستی اور راز داری کو جدا کر دیا تھا لیکن چوتھے روز پرویز میاں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ اگل دیا تو مجھے اپنا کھویا ہوا اعتماد واپس آتا محسوس ہوا۔ ہم نے مل کر مُچھڑ سے نجات کے ہزار راستے تلاش کئے لیکن کوئی معقول راستہ نظر نہ آیا۔ چچا کی کتابیں یونہی چلتی رہیں۔ مچھڑ ہر دوسرے تیسرے روز آتا رہا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب چچا نے ہم دونوں کو اعتماد میں لے کر مچھڑ کے مستقل بڑھتے ہوئے بیجا مطالبات کے خلاف کسی نسخے کی تلاش میں مدد چاہی۔ کیونکہ اب اس نے راحیلہ سے دست درازی شروع کر دی تھی۔ رشتے کے مطالبے کے بعد ہمارا مشترکہ فیصلہ فساد کی جڑ یعنی ان نام نہاد کتابوں اور تصویروں کی تلفی پر ہوا تھا۔ لیکن اس منصوبے پر عمل درآمد سے پہلے ہی مچھڑ کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ ٹانگ ٹوٹی اور یوں نوکری کا خاتمہ ہو گیا۔ چچا جو اس سے پہلے برسوں کے بیمار نظر آتے تھے ان کا جھریوں والا کمہلایا چہرہ بہار کا پتہ دینے لگا۔ ان کی مستقل کھانسی پر بھی خوشگوار اثر پڑا۔ گاہکوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن وہ منصوبہ منصوبہ ہی رہا۔ اور گاہک یونہی پیکٹ لیجاتے رہے۔ پرویز نے چچا کے پاس آنا جانا کم کر دیا۔ وہ خاصا ناراض سا تھا۔ زندگی کچھ سست رفتار سی ہو گئی تھی۔ اب وہ روزمرّہ کی نشستوں میں سرگرمی تھی نہ پرویز نہ چچا اور نہ چچا کی دلچسپ باتیں۔ اور نہ چائے۔ چنانچہ جب ابا نے نئے گھر میں شفٹ ہونے کا فیصلہ سنایا تو کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ پھر کچھ سامان کی الٹ پلٹ اور کچھ نئے گھر کی سجاوٹ۔ نئے ماحول اور نئے لوگوں کی معیت سے سمجھوتہ کرتے کرتے پرانے گھر پرانے لوگوں کی یاد ماضی کا حصہ ہوتی جا رہی ہے۔

یہ ٹڈ ایک سال گزر گیا اور پھر ایک دفعہ کسی شادی کے سلسلے میں پرانی سوسائٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کسی سے پتہ چلا کہ جب سے ڈاکٹر جاوید کے والد کا انتقال ہوا۔ اپنی امی کے ساتھ وہ چچا کے پاس ہی رہنے آ گئے تھے اور پاس ہی کلینک کھول لی تھی۔ چچا کی لائبریری یونہی جاری تھی لیکن اب اس کا سرے سے نقشہ بدل چکا تھا۔ لکڑی کے تختوں کی جگہ قد آدم الماریوں نے لے لی تھی اور خدا جانے کیا کیا سنا لیکن دیکھا کچھ بھی نہیں۔ کچھ سستی تھی اور کچھ عجب سی اکتاہٹ کہ اتنی ڈھیر ساری دلچسپ تبدیلیاں مجھے چچا اور پرویز وغیرہ سے ملنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔

اس واقعے کو گزرے مزید دو برس ہو چلے تھے کہ آج اچانک خود بخود ہی چچا سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن آج کی ملاقات عجیب حادثاتی سی تھی۔ اتنا بد حواس اپنے آپ کو کبھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ ٹاٹا کمپنی سے لے کر بس اسٹاپ تک تین بار کم از کم راہگیروں سے ٹکرایا تھا۔ میں نہ تو پرویز سے ٹھیک طرح سے مل سکا نہ چچا سے کھل کر بات کر سکا میرا دل بے چین رہا کہ چچا سے پوچھوں کہ کس طرح سے وہ پرویز راحیلہ کی شادی کر سکے۔ کیا اتنی عجلت میں یہ شادی ہوئی کہ مجھے بھی نہ بلا سکے ؟ پرویز تو کم از کم میرا پتہ جانتا ہی ہوگا۔ لیکن میں کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ شاید میرا وہ تجسس ہی سو گیا تھا۔ میں یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ پرویز کی خفگی کب دور ہوئی ؟ اس کے آنے کے بعد کتابوں کا کاروبار کس طرح جاری رہا کیا وہ بھی اس میں شریک ہو گیا تھا یا صرف حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اس نے۔ پرویز کی گرتی ہوئی ساکھ کو کیا چچا نے اپنی کتابوں کے کاروبار سے بحال کیا ؟ کلینک کے لئے پیسہ بھی کیا انہیں کتابوں کے طفیل آیا یا ادھار لیا گیا تھا ؟ چچا شروع میں ہی لائبریری سے وہ کتابیں کیوں نہ نکال سکے چچا نے لائبریری کب اور کیسے ختم کی ؟

لیکن بس میں چڑھتے ہوئے مجھے ان تمام سوالوں کے جواب مل گئے جب میں نے ہر ایک کردار کا الگ الگ تجزیہ کیا تو ہر کردار مجھے معاشرے کا ایک 'STEREO TYPE ROBOT' نظر آیا۔ روبٹ برقی اشاروں کا مرہون منت ہوتا ہے اور یہ کردار حالات کا۔ پرویز نے تبھی تو چچا کا سہارا قبول کیا۔ چچا اگر کتابیں ختم کر دیتے تو آج شاید ٹاٹا کمپنی نہ ہوتی۔

(باقی صفحہ ۱۵۷ پر)

رکھا ہوا لکڑی کا تابوت نما صندوق - اس کے اوپر بکھری ہوئی جلد بندی کے لئے آئی ہوئی نامکمل کتابیں اور اس میں بند ہزاروں سلگتی جوانیوں کے جذبات کو بھڑکانے کا مصالحہ - کتابیں ہی کتابیں - تصویریں ہی تصویریں "صاحبزادے نظریں اٹھا کر چلو" - ایک مولانا ٹکراتے ہوئے بڑبڑاتے - لیکن یادوں کی چلمن آنکھوں پر یونہی پڑی رہی اور میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اڑاتا چلتا رہا -

اس روز سخت بارش ہوئی تھی - برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا - ابن صفی کی کتاب پڑھتے پڑھتے ختم ہوگئی - لائبریری کا وقت بھی نہ تھا - سگریٹ پیتے پیتے کچھ نہ سوجھا تو چچا سے دوسری کتاب لینے لائبریری چل دیا - کتاب سے زیادہ شاید چچا بلکہ چائے کی کشش کھینچ رہی تھی - میں عموماً لائبریری کے اوقات کے علاوہ ہی جاتا تھا - دروازہ کھٹکھٹاتا - چچا آتے اندر بٹھاتے - ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں - ڈاکٹر پرویز بھی ٹہلتے ٹہلتے آجاتے جب وہ صرف پرویز میاں تھے - پھر چچا پکارتے راحیلہ بیٹے پرویز میاں اور سالک میاں آتے ہیں - چائے نہیں بناؤ گی کیا ؟ - چند ہی لمحات میں کمرے کا پردہ ہلتا اور پتلی پتلی انگلیوں والا گورا سا ہاتھ چائے کی ٹرے کو تھامے نظر آتا - ابا یہ چائے ! پردے کے پیچھے سے آواز آتی اور چچا پکارتے چلی آ چلی آ - یہ تو پرویز میاں اور سالک میاں ہیں - پھر پرویز میاں صندوق پر سے فوراً کوئی کتاب اٹھا لیتے - چچا اس کی جلد آپ نے بہت خوبصورت بنائی ہے - آپ سے میں کب سے کہہ رہا ہوں - اردو ڈائجسٹ منگوا دیجئے "نقوش" کا سالنامہ کب تک لے آئیں گے آپ - خوشبو کا جھونکا سا کمرے میں داخل ہوتا - چائے آہستگی سے صندوق پر رکھ دی جاتی، کچھ دیر خاموشی رہتی اور پھر باتوں کا سلسلہ یونہی چلتا رہتا - یہاں تک کہ لائبریری کا ٹائم ہو جاتا -

ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں - ہر قسم کی پتلونیں، دوپٹے برقعے اور چہرے - صندوق کا ڈھکنا کھلتا بند ہوتا - اخبار میں لپٹے ہر ایک کے لئے پیکٹ تیار ہوتے - ڈوری والی عینک کے پیچھے سے دو چمکتی آنکھیں اوپر دیکھتیں - "میاں زاہد تمہارا تحفہ کب سے رکھا ہے - کل کیوں نہیں آئے" "نگینہ بی بی اپنی چیزیں یاد کرکے لے جایا کرو - کل یہ پیکٹ تم چھوڑ گئی تھیں - کوئی نئی کتاب ہے شاید اس میں" - اور نگینہ بی بی ایک نوٹ پکڑاتے ہی رفوچکر ہو جاتیں -

چچا نے باہر کے دروازے میں لیٹر بکس جیسی ایک درز بنائی ہوئی تھی جس کے پیچھے ایک بورا لٹکا ہوا تھا - جب لائبریری بند ہوتی گاہک پیسے اور کتاب اس میں ڈال کر چلے جاتے - اس روز لائبریری پہنچتے پہنچتے عجیب اکتاہٹ کا احساس ہوا - جی میں آیا فوراً کتاب درز میں ڈالوں اور چل دوں - لیکن بڑھا ہوا ہاتھ خلاء میں ہی رہ گیا - ایک لمحے کے لئے اپنے اوپر سکتہ سا طاری ہوتا محسوس ہوا کبھی کبھی انسان کے کانوں میں کچھ باتیں اپنا راستہ بناتی زبردستی گھستی محسوس ہوتی ہیں اور پھر کبھی تجسس کبھی طلب اور کبھی کوئی غیر مرئی قوت اس کے قدم پکڑتی ہے اور حیرت انگیز انکشافات کی دنیا کے دروازے اس پر کھلتے محسوس ہوتے ہیں - وہ سرگوشیاں بھی کچھ ایسی ہی تھیں -

"پرویز میں تمہارے ساتھ ہوں - تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے مجھے معلوم ہے کہ تمہاری تعلیم کے ابھی تین سال باقی ہیں - ابا کے کہنے سے کیا ہوتا ہے - تمہاری امی اگر ابھی منگنی اور نکاح پر راضی نہیں ہیں تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں - میں تمہارا انتظار کروں گی - پتہ ہے کل تمہارے سسر مجھ سے کیا کہہ رہے تھے" ؟

"کیا کہہ رہے تھے" ؟

سانسوں سے بوجھل پرویز میاں کی آواز سرسرائی - میں اب تک کافی سنبھل چکا تھا - مہندی کی باڑ کی آڑ میں محتاط اور چوکنا گدھے کی طرح کان کھڑے کئے - دور کہیں بہت مدھم سی چچا کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز آئی - چند لمحات کی خاموشی نے جھنجھلا دیا -

"کہہ رہے تھے کہ آجکل کتابوں میں بڑا منافع ہو رہا ہے - ہاں یاد آیا ایک دن ایک پولیس انسپکٹر آیا تھا - ابا اس کے قدموں میں گویا بچھے جا رہے تھے - فوراً لائبریری بند کر دی اور مجھے بہت سی چیزیں اس مچھڑ کے لئے بنانے کو کہا - جب میں چائے لے کر گئی تو مجھے بری طرح گھور رہا تھا اور اپنی ہینڈل مارکہ مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا - جب وہ چلا گیا تو ابا نے کہا - اب کتابوں میں اور منافع ہوگا - میں تو ابا سے بہت لڑی تھی کہ اس کو دوبارہ نہ بلائیں - میں نے اس کے بارے میں کچھ پوچھا تو ابا نے کچھ نہیں بتایا - لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس مچھڑ کا کتابوں سے کیا تعلق ہے"

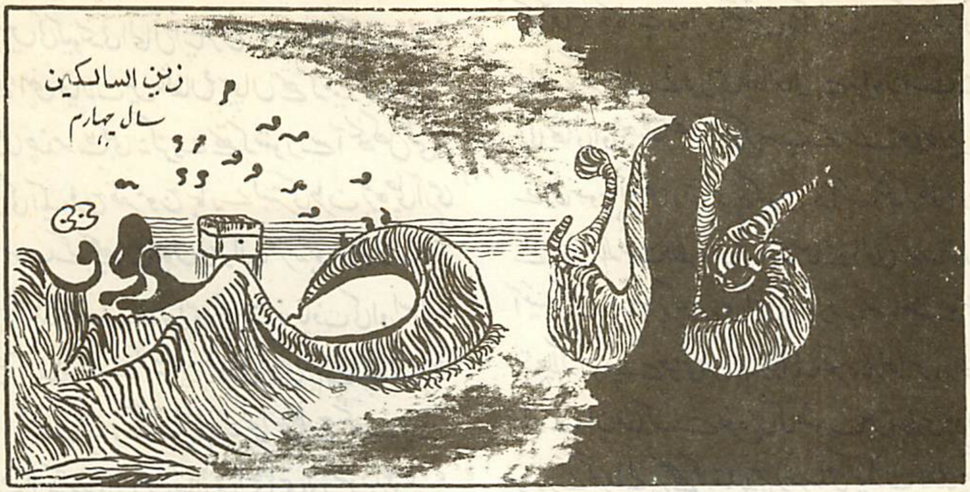

ہماری دکان پر ایک دام ہوتا ہے صاحب! اس جوتے کی قیمت فکس ہے۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، لیکن آپ نہیں مانتے لیجئے یہ رہے منیجر صاحب خود ہی بات کر لیجئے، سیلزمین نے اپنی گلوخلاصی کی۔ نگاہ اوپر اٹھی تو دودھ سے زیادہ سفید شیروانی کی جیب سے لٹکتی طلائی زنجیر، ستواں ناک پر سوار قیمتی گول عینک میں سے جھانکتی چمکتی آنکھوں، ترکی ٹوپی کے لہراتے کالے پھندنے اور سلیم شاہی جوتے کی نوک نے ذہن کے کئی غیر دریافت گوشوں کو جگمگا دیا۔ لیکن فوراً ہی جھٹکا سا لگا، سفید شیروانی کے بجائے ایک انتہائی بوسیدہ میلی کچیلی، پان کی سُرخ سرخ پیک کی گلکاریوں سے مزیّن شیروانی۔ میل اور چکناہٹ سے تربتر چشمے کے ٹوٹے فریم کے حلقوں میں دھنسی کچھ پیلی کچھ ملگجی جھانکتی آنکھوں، پچکے گالوں اور پتلے پتلے ہونٹوں میں دبی وقفے وقفے سے سلگتی بیڑی نے فوراً تین سال قبل کے چچا جمّن کو لا کھڑا کیا۔

اخّاہ! سالک میاں۔ چشمے کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے چچا جمّن لپٹ گئے گویا اپنی ساری شفقت و محبت کا ابلتا لاوا اپنے سینے سے میرے سینے میں منتقل کر رہے ہوں۔ لپٹتے ہی اپنا پرانا سوال دہرایا۔ میاں منگنی شادی وادی کا کب تک ارادہ ہے۔؟

میں کسی مناسب جواب کے الفاظ مرتب ہی کرتا رہ گیا اور انہوں نے شکوے شکایتوں کے انبار کو میرے ناتواں جسم پر ڈال دیا تین سال کی روداد تین منٹ میں چچا جمن نے دہرا دی۔ قصہ مختصر اب وہ چچا جمن سے مسٹر جمشید منیجر ٹاٹا شو کمپنی ہو چکے تھے۔ ان کی کہانی میں ان کے داماد ڈاکٹر پرویز کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر پرویز کا کیا دھرا تھا۔ بقول ان کے۔ پے در پے حیرت انگیز انکشافات سے ابھی میں ٹھیک سے لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پرویز میاں، حسب معمول کلینک سے گھر اپنی کالی فوکسی میں چچا جان، کو لنچ کیلئے لینے آگئے بمشکل معذرت کی میں نے۔ پھر بغل میں جوتے کا ڈبّہ اور دل پر چچا جمّن کے خلوص کا بوجھ محسوس کرتا چلچلاتی دھوپ میں بس اسٹاپ کی طرف چلا۔ گزشتہ واقعات کی فلم تیز قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لکڑی کے سیدھے سادے مچانوں پر دیمک زدہ 'قصہ چہار درویش' داستان امیر حمزہ، اور تلوار ٹوٹ گئی، ایک گنجینہ نما الماری میں، اور اصل گرد پوشوں میں لپٹی ہوئی صاعقہ، شمع، ناتیلہ، اور الماری پر رکھا ہوا ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا مکمل سیٹ۔ گنجینے کے اوپر مچان پر مشکوٰۃ، بہشتی زیور اور گنجینے کے برابر والے مچان پر دوسرے تیسرے درجے کے رومانی ناولوں کا طومار۔ ایک تختے پر جلد بندی کے لئے آئی ہوئی پتھر کی سل تلے دبے ہوئی مکمل کتابیں۔ مچانوں کے اوپر ذرا ذرا سی جگہ پر رکھے ہوئے رومانی تصاویر کے ساتھ اللہ محمدؐ اور آیات قرانی کے کتبات کے فریم۔ چچا کی اسٹول نما کرسی اور اس کے سامنے

قائم کرنے کا خیال مگر سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ان باتوں پر مزید سوچنے کی زحمت نہیں کی کیونکہ فی الحال اپنا خرچ بھی ہم بڑی مشکل سے پورا کر رہے تھے، انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ نیند کی دیوی نے آدبوچا۔ ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ شور سے آنکھ کھل گئی! دیکھا تو بچوں کی ایک فوج ظفر موج ہمارے بستر کی طرف بڑھ چلی آرہی تھی اور ان سب کے پیچھے ان بچوں کی والدہ محترمہ یعنی بی پڑوسن صاحبہ تشریف لارہی تھیں، انہوں نے فوراً ہی خیریت دریافت کی اور اسی اثنا میں ان کے بچوں نے ہمارے بستر پر چڑھائی کردی ہم نے اپنے بستر کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تمام بچے کچھ اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے فٹ بال کے میدان میں کھلاڑی اپنی اپنی پوزیشن پر ہوتے ہیں، سینٹر فارورڈ ہمارے آگے تھا تو فل بیک ہمارے پیچھے اور ان کے سب کے درمیان ہماری حالت اس قابل رحم فٹ بال کی سی تھی جسے سب ہی نشانۂ ستم بناتے ہیں، خیر کسی نہ کسی طرح لڑھکتے ہوئے ہم نے کارنر میں پناہ لی اور دوبارہ جب اپنی پڑوسن کی طرف متوجہ ہوئے تو انہیں بغور اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ کچھ دیر تک انہوں نے موسم اور ہماری صحت کو برا بھلا کہا اور اس کے بعد کچھ سوالات پوچھے اور فوراً ہی پریشان کن لہجے میں اپنی یہ تفتیش سنادی کہ ہم کسی بہت ہی موذی مرض کا شکار رہیں اور ایسا ہی مرض اُن کے دادا زاد بھائی کو بھی ہو چکا ہے وہ اپنی تفتیش بتا کر ہنڈیا دیکھنے گھر چلی گئیں اور ہمارے گھر والوں نے فوراً ہی خدا تعالیٰ سے براہ راست رجوع کرنے کی ٹھانی اور جھٹ مصلّیٰ لے کر سب کے سب سجدہ ریز ہو گئے ہم نے بھی سوچا آخری وقت ہے کیوں نہ آئینہ دیکھ کر بال وغیرہ سنوار لئے جائیں تاکہ جنت الفردوس میں سجے سجائے بالوں کے ساتھ داخل ہوں، آئینہ دیکھنے پر صورت پر کچھ رونق نظر آئی اور جب تھرمامیٹر سے بخار دیکھا تو پتہ چلا کہ اتر چکا ہے خوشی میں ہم نے ایک نعرہ مارا جو اس دفعہ واقعی ہمارے دہانِ مبارک سے نعرہ ہی کی صورت میں جاری ہوا شور مچانے پر ہمارے گھر والے یہ سمجھے کہ شاید ہم پر سرسامی کیفیت طاری ہو گئی ہے کچھ لوگ برف لینے کے لئے دوڑے مگر جب ہم نے تھرمامیٹر دکھایا۔ تو سب ہی لوگ دو منٹ کے بعد خاموش ہو گئے (مارے خوشی کے)۔

بال سنوارتے ہوئے جب ہمیں یہ خیال آیا کی صحت یاب تو ہم اپنے عیادت کرنے والوں کی وجہ سے ہوئے ہیں، تو اپنے دوستوں پر بڑا پیار آیا اور مارے حیرت کے ہم یہ مضمون لکھ بیٹھے کہ شاید کوئی۔ ڈاکٹر صاحب عیادت کے ذریعے بیماری کے اس طریقۂ علاج پر کچھ، ریسرچ کر سکیں اور دنیا و آخرت کا بھلا کر سکیں۔

بقیہ: میرا دیس

پامال کریں...... کیا پدما اور سنگھنا کے بہتے ہوئے آنسو بھی کسک اور اضطراب پیدا نہ کر سکے۔

میرا جی چاہتا ہے...... کہ خدا کا یہ پیغام ہر ایک فرد کو چیخ چیخ کر سناؤں کہ "تم مایوس اور مضمحل نہ ہو...... غم اندوہ کے سمندر میں نہ ڈوبو...... فتح آخر کار تمہاری ہوگی.....!"

لیکن شرط ہے ان کنتم مؤمنین۔

ہمیں پاکستان مل سکتا ہے۔ ہماری شکست کے داغ دھل سکتے ہیں۔ ہم اس برہمن راج کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔ لیکن ہم سب مومن بن جائیں۔

مومن اور صرف مومن۔

بقیہ: کالا صندوق

راحیلہ پروین کی شادی کم از کم اتنی جلدی نہ ہوتی۔ ان کے حالات نہ بدلتے۔ کالی فوکسی، شاندار بنگلہ اور کلینک نہ ہوتا۔ یہ سب سوچ کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بڑا اطمینان سا محسوس ہوا۔ لیکن پیکٹ کے آخری سگریٹ کا کش لیتے ہی دل میں عجب چبھن کا احساس ہوا۔ یہ سب بکواس ہے۔

حالات! حالات! ہم اپنے کردار کی خامیوں کا ہر الزام کتنی آسانی کے ساتھ حالات کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ بس سے اترتے ہی موڈ خراب ہو گیا۔ اور نتیجتاً بس اسٹاپ سے گھر تک پہنچتے پہنچتے میں کئی بار راہگیروں سے ٹکرایا لیکن گھر پہنچ کر بھی کسی جھنجھلاہٹ کا احساس نہیں ہوا۔

شاید اس لئے کہ اب یہ میرا معمول ہو چکا ہے۔

فی الحال صحت مند ہونے کی تمنا نہیں تھی، شام تک میں ہماری تندرستی کافی غیر مشکوک ہوگئی اور بخار بھی بتدریج بڑھنے لگا۔ رات یوں ہی گزر گئی اور صبح تک ہمارا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اب تو ہم کافی پریشان ہوئے کیونکہ زندگی کافی ویران معلوم ہونے لگی اور تمام دلچسپیاں بخارات بن کر اڑ گئیں ہم نے دل ہی دل میں اپنے گناہوں سے توبہ کرنی شروع کر دی کیونکہ وہ زندگی کا آخری دن محسوس ہو رہا تھا۔ گڑگڑانا شروع کر دیا مگر جس طرح پہلی تمام دعائیں رد ہوگئی تھیں کچھ یہی حشر ان دعاؤں کے ساتھ ہوا۔ مارے تکلیف کے ہم نے کراہنا بھی شروع کر دیا ہائے ہائے کرتے رہے مگر قدرت بھی ۔ ۷/۷۸ لینے والے ممتحن کی طرح بے رحم نکلی اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالی تو نامۂ اعمال کو بہت سیاہ پایا۔ اب تو رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ خدائے تعالیٰ کو ہم نے اپنی مجبور جوانی اور اپنی اولادوں کے واسطے دینے شروع کر دئے جن سے پیدا ہو جانے سے پہلے ہی یتیم ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا اور ہماری حالت اس بکرے کی سی تھی جس کو ذبح کرنے کے لئے قصائی اس کے سامنے ہی چھری تیز کر رہا ہو ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ موت ناگزیر ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اُسے بہادری سے گلے لگایا جائے آنکھیں بند کر کے موت کا انتظار شروع کر دیا مگر وہ کم بخت بھی نہ آئی تو آنکھیں کھول دیں دیکھا کہ ہمارے ایک بہت ہی عزیز سیاسی قسم کے دوست عیادت کے لئے تشریف لائے ہیں ایک آدھ جملہ خیریت کا پوچھنے کے بعد انہوں نے ملکی سیاست پر تبصرہ فرمانا شروع کر دیا اور اپنے سیاسی مخالفین کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ فرمانے لگے کہ فلاں لیڈر ملک و قوم کے غدار ہیں کیونکہ انہوں نے ہماری پارٹی پر تنقید کی ہے چند ایک لیڈروں پر انہوں نے امریکی ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا۔ انہوں نے اپنے مطالبات بھی ایک کاغذ نکال کر پڑھے اور یہ بھی بتایا کہ انہیں کون کون سی باتیں نامنظور ہیں چند باتیں بھول گئے تو فرمانے لگے کہ یاد تو نہیں پڑتا کہ وہ کیا باتیں ہیں جو ہمیں نامنظور ہیں مگر بہر حال ہم اسے نامنظور کرتے ہیں۔ اسی وقت ہمارا چھوٹا بھائی ہمارے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آیا کیوں کہ اس نے انہیں یہ کہہ کر ڈرا ہی دیا کہ ایک پولیس والا ان کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر ہمارے در پر کھڑا ان کے بارے میں پوچھ رہا ہے یہ سنتے ہی اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ گھر کے پچھلے دروازے اس ملک کی سابقہ حکومتوں کی طرح نکل بھاگے، ان کے جانے کے بعد ہم نے اپنے حواس کو مجتمع کرنا شروع کر دیا۔ جو اُن کی آمد سے اُس جلوس کی طرح منتشر ہوگئے تھے جس پر لاٹھی چارج کیا گیا ہو، ابھی ہم ان کے دیئے ہوئے صدمات سے سنبھل نہ پائے تھے کہ ہمارے ایک بزنس مین دوست پان کھاتے اور بال سنوارتے وارد ہوئے ہمیں دیکھ کر انہوں نے اس طرح کا منہ بنایا جیسے منڈی کا بھاؤ گر گیا ہو مگر پھر فوراً سنبھل کر ہماری خیریت دریافت کی ابھی ہم اپنا حال بتا ہی رہے تھے کہ انہوں نے اپنی ٹیڈی پتلون کی جیب سے ایک اور پان نکالا اور اسے چباتے ہوئے منڈی کے کھلے اور بند بھاؤ بتانے لگے پھر اپنے بزنس کا رونا رونے لگے کہ اس دفعہ بہت نقصان ہوا ہے اور تین لاکھ کی بجائے صرف دو لاکھ کا نفع ہو سکا ہے ہم ابھی ان کے فائدے نقصانات پر غور کر رہے تھے کہ انہوں نے ہم سے بازار جانے کی اجازت مانگی کیونکہ روئی کے وعدوں میں منڈی کے پہلے کا اعلان کر دیا گیا تھا اور انہیں بہت سے کام تھے ہم کچھ نہ سمجھ سکے اور خدا کا شکر ادا کرتے انہیں اجازت دی اور اپنی ذہنی منڈی کی طرف توجہ دی جس کے ایک ایک کل پرزے کا بھاؤ گر چکا تھا۔

دل ہی دل میں ہم اپنے مہربانوں کو اور اس وقت کو کوستے رہے جب بیماری کا منحوس خیال ہماری عقل خام میں آیا تھا گھر میں ایک ایک کا چہرہ بے چارگی سے دیکھنے لگے کہ شاید انہیں اس کے بعد کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو مایوسی کی حالت میں دوبارہ آنکھیں بند کر کے آخرت کی فکر کرنے لگے اور سوچنے لگے کہ مرنے سے پہلے کوئی ایسا نیک کام کر جائیں کہ ہمارے نام کا ڈنکا سارے جہاں میں گونجنے لگے کبھی ذہن میں یتیم خانہ کھولنے کا خیال آیا تو کبھی ٹرسٹ

عیادت

اشرف ظہیر احسن انصاری
(سالِ چہارم)

عرصۂ دراز سے ہم اس فکر میں تھے کہ بیمار پڑ کر دیکھیں کیونکہ بیماری کے دوران گھر والے عموماً اور امی جان خصوصاً جس طرح نخرے اٹھاتی ہیں ہمیں اس کا مزہ چکھے ایک عرصہ گزر چکا تھا اس کے علاوہ عیادت کرنے والے بھی جس طرح تانتا باندھے چلے آتے ہیں اس قسم کا نظارہ دیکھے بہت دن ہو چکے تھے لہذا بیمار ہونے کی ٹھانی اور اپنی ان پنج نمازوں میں جو ہم خاص خاص موقعوں پر پڑھا کرتے ہیں اپنی بیماری کے لئے خلوصِ دل سے دعا مانگنی شروع کر دی اور اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سربسجود ہو گئے کہ اب تو تیرے در سے بغیر بیمار ہوئے نہ جائیں گے مگر صاحب کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر ہم نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بدپرہیزی شروع کر دی اور ایک ٹھیلے والے سے چھولے کھانے شروع کر دیئے کہ شاید قدرت کو اسی طرح ہم پر رحم آجائے (ویسے اسے چھولے کہنا چھولوں کی سراسر توہین ہوگی کیونکہ وہ ٹھیلے والا پلیٹ میں کچھ اس قسم کی چیز دیا کرتا تھا جس میں چھولے ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتے تھے شاید وہ چھولوں کا حلوہ تھا) مگر صاحب توبہ کیجئے یہ تمام بدپرہیزیاں بھی ہمارے نرم و نازک جسم کو بیمار نہ بنا سکیں اور ہم اسی آس کو دل میں لگائے اکثر غمزدہ اشعار الاپنے لگے۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آنہ دو آنہ والی ملائی قلفی کھاؤ بیماری کے لئے بے حد سود مند ہے اور ہیضے وغیرہ کا حملہ تو اس قلفی کو دیکھتے ہی شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک دن ہم نے اللہ کا نام لے کر کئی قلفیاں کھا ڈالیں اور خوشی خوشی گھر پہنچے اور بستر کے پاس ٹہلنے لگے کہ شاید اب بیماری ہمیں کسی ہی دم میں بستر پر لا پھینکے گی مگر گھنٹوں نے دنوں اور دنوں نے ہفتوں کی صورت اختیار کر لی مگر کم بخت بیماری کو نہ آنا تھا نہ آئی ہم اپنے اس دوست اور قلفی والے کو برا بھلا کہتے رہ گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔

جب تمام ہی ترکیبیں ناکام ہو گئیں تو ایک رات ہم یہ پلان بنا کر سوئے کہ اگر اب ہماری طبیعت نازک مزاج ناساز نہ ہوئی تو ہم بیمار ہونے کی اداکاری فرمائیں گے یہ پلان ہمیں بہت پسند آیا اور مارے خوشی کے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لئے بغیر ہی ہم سو گئے صبح جب آنکھ کھلی تو جسم میں درد سا محسوس ہوا اور جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی اپنا بوجھ ناتواں ٹانگوں پر نہ اٹھا سکے اور چکرا کر گر پڑے امی جان ہماری طرف لپکیں اور ہمیں اٹھاتے ہوئے انہوں نے انکشاف فرمایا۔ کہ ہمیں شدید قسم کا بخار ہے اب تو ہم بڑے خوش ہوئے کیونکہ ایک عرصہ کے بعد تمنائیں اور مرادیں بر آئیں تھیں اور تمام خواب بغیر اداکاری ہی کے پورے ہوتے دکھائی دیئے۔ ہم نے اسی خوشی میں بڑے زور سے ایک نعرۂ مستانہ لگایا جو ہمارے منہ سے ایک کمزور سی کراہ کی صورت میں نکلا آنکھیں نیم وا کئے ہم نے سارے گھر کا جائزہ لیا تو سب لوگوں کو پریشانی میں مبتلا پایا کسی نے اسی حالت میں ڈاکٹر کو بلانے کا مشورہ دیا ہمارے تو ہوش اڑ گئے کیونکہ ڈاکٹر کے آنے کی صورت میں شام تک ہمارے ٹھیک ہو جانے کا خطرہ تھا اور ابھی کچھ عرصہ تک ہم بیمار ہی رہنا چاہتے تھے کیونکہ ابھی تو شوق بھی پورا نہ ہوا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر کو بلانے کی سخت مخالفت کی مگر وہ جب آ ہی گئے تو دوا ہم نے سب کی نظر بچا کر پھینک دی کیونکہ

غزل

یاسمین محبوبؔ۔ سال اوّل

ریت پہ قدموں کے ہر نقش مٹاتے جاؤ
یادِ ماضی کی ہر ایک یاد بھلاتے جاؤ

چوٹ کھا کر دلِ ناداں نے تڑپنا سیکھا
جاتے جاتے کوئی ٹھوکر تو لگاتے جاؤ

میرے اشکوں کے چراغوں کی ضیاء ہے مدھم
آؤ اِک بار مجھے اور رُلاتے جاؤ

میرے گھر سے شبِ فرقت کی سیاہی تو مٹے
یادِ ماضی کی ہر اک شے مٹاتے جاؤ

ساغرِ وصل تو ہونٹوں سے لگے یا نہ لگے
جامِ حسرت سے میری پیاس بجھاتے جاؤ

خود بخود سامنے آجائیگی منزل راہی
راہ کے سنگِ گراں کو تو ہٹاتے جاؤ

شہرِ جاں میں اضطرابِ سوزِ فن دیکھے گا کون
میرے اندر ایک قلزم موجزن دیکھے گا کون

مضمحل سوچوں کے اس جھلسے ہوئے ماحول میں
تیرا حسنِ قامتِ سرو سمن دیکھے گا کون

رات نے آنکھوں میں بھر دیں کس قدر تاریکیاں
صبح تو ہو گی مگر پہلی کرن دیکھے گا کون

میرے گیتوں سے مری حالت کا اندازہ نہ کر
میری سوچوں میرے خوابوں کی تھکن دیکھے گا کون

مستقل بے خوابیوں کا عکس چہرے پر نہیں
اور میرے سرِ دلبستر کی شکن دیکھے گا کون

اپنی اپنی آگ میں آنکھیں جھلس کر رہ گئیں
تیرے لب کے پھول تیرا بانکپن دیکھے گا کون

ہو سلامت بھی تو کوئی کس کو عبرت آئے گی
میں تو پہنچوں پر سرِ دار و رسن دیکھے گا کون

لوگ تو اپنے گھروں میں بند ہو کر رہ گئے
میرے خوں سے سرخیِ شامِ وطن دیکھے گا کون

میرے باہر تو صبا کا لمس ہے خوشبو بھی ہے
مجھ میں آ کر میرے اندر کی گھٹن دیکھے گا کون

لوگ تو پوجیں گے خود میرے تراشیدہ خدا
کون ہے آذر خدائے فکر و فن دیکھے گا کون

غزل

شائستہ ظفر۔ سال اول

وفا کی راہ میں شمعیں جلانا کس کو آتا ہے
ہیں رہبر تو بہت رستہ دکھانا کس کو آتا ہے
ہنسی کی اوٹ میں غم کو چھپانا کس کو آتا ہے
تکلف برطرف الفت نبھانا کس کو آتا ہے
نصیحت کے ہزاروں پتھروں کی زد میں ہے مریم
مسیحاؤ! صلیب اپنی اٹھانا کس کو آتا ہے
گلوں سے پوچھئے اخار و خزاں کا ذکر لاحاصل
ہیں قاتل تو بہت مرہم لگانا کس کو آتا ہے
جنوں والے امیرِ کارواں سے پوچھ بیٹھے ہیں
رہِ الفت سے پتھر ہٹانا کس کو آتا ہے
گلو! اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر یہ تو بتلاؤ
اندھیری رات میں آنسو بہانا کس کو آتا ہے
کسی کی یاد پر چاک گریبان سحر قرباں
بہت بسمل ہیں لیکن زخم کھانا کس کو آتا ہے

غزل

٭سید مفتاح الحسن زیدی۔ سال سوئم٭

جب کبھی بھی میں ترا ذکر کیا کرتا ہوں
رنگ سو طرح کے پھولوں میں بھرا کرتا ہوں
اس خرابے میں بھی تم کاش نکل ہی آئے
کتنی مدت سے میں راہوں کو تکا کرتا ہوں
میرے سینے میں ترے غم نے جو بھڑکائی ہے
میں اسی آتشِ سوزاں میں جلا کرتا ہوں
عشق کی منزلِ گم گشتہ کو پانے کے لئے
راہبر اپنا ترا نقش کفِ پا کرتا ہوں
جب کبھی آلامِ زمانہ نے ستایا ہے مجھے
بھولنے والے تجھے یاد کیا کرتا ہوں
دورِ حاضر کی روش کتنی ہے مہمل راہیؔ
میں اسی فکر میں دن رات گھلا کرتا ہوں

○

غزل

میاں بشیر احمد نسیم (سال چہارم)

زُلف کی خوشبو سے ابر کا سایا ملے
زندگی میں عافیت کا کوئی تو گوشہ ملے

نشہ چھا جائے میرے دل پر کسی کے قرب کا
پھول کوئی زخمِ جاں میں اس طرح کھِلتا ملے

آڑی ترچھی سی لکیریں عظمتِ فن ہو گئیں
کاش ان اندھوں میں کوئی شخص تو بینا ملے

زندگی کی وحشتوں میں یوں خیال آیا تیرا
جیسے پیاسے کو اچانک دشت میں چشمہ ملے

زندگی جن کی تبسّم کے شفق کا نام تھی
اُس گلابی شہر میں وہی کبھی تنہا ملے

چھپ کے دیکھا چاہیئے منظر نیاز و ناز کا
عشق کم آمیز سے جب حُسن بے پروا ملے

رات کی بے مہریوں کے داغ تھے جن کے لباس
وہ دھندلکے بھی نسیمؔ! اب تو سحر سے آملے

غزل

نثار احمد چیمہ

کیا خوب ہے کہ عشقِ بتاں میں جدھر گئے
تکمیلِ آرزو کے فسانے بکھر گئے

مشرق کو لالہ زار بنا کے لہو سے وہ
ہم شب زدوں کو دے کے پیامِ سحر گئے

کتنے خوش نصیب مرے ہمسفر کے رفیق
وہ راہِ عشق طے بڑی سُرعت سے کر گئے

وہ دوست وہ رفیق وہ ساتھی وہ ہم قدم
یارب وہ غمگسار ہمارے کدھر گئے

کچھ تو بتاؤ کہ غنچۂ دل کب کھلے گا دوست
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

ہم خونِ آرزو کے جلاتے رہے چراغ
گلشن کے رنگ روپ نہ جب تک نکھر گئے

ہوتا کسی کا کون ہے اس دور میں نثار
آنسو بھی اپنے ریت پر گر کر بکھر گئے

غزل

★ عذرا جمال (سال دوئم) ★

دل کی نگری ویراں ویراں، گیت خوشی کے گائے کون
سارا جگ ہے انجانا سا، راستہ اب بتلائے کون
اُجلے چہرے من ہیں کالے، پیار کے ہیں سب رُوپ نرالے
کون کسی کو اپنا سمجھے، دل کو روگ لگائے کون
کیسی یادیں کیسی باتیں، کیسے دن اور کیسی راتیں
بیت گیا سب چپکے چپکے، اب دل کی آگ بجھائے کون
سکھ کے سائے دکھ میں پنہاں، خواہشِ منزل رقصاں رقصاں
رستہ مشکل، خواب سنہرے، دل کو اب سمجھائے کون
ہنستے چہرے، خواب کی باتیں، بیتے دن کی بوجھل یادیں
وقت کی جلتی دھوپ میں ساتھی گزرا گیت سنائے کون
آنکھیں نم اور دل ویراں ہے، سنگی ساتھی پاس نہیں
عذراؔ آخر اپنے سے بھی دل کا بھید چھپائے کون

غزل

شہابؔ جاوید۔ سال دوم

کب تک ہم محروم رہیں گے خوشیوں کی سوغاتوں سے
کب تک ہم ٹکرا نہ سکیں گے ظلم کی لمبی راتوں سے

ہم بھی سادہ لوح تھے کتنے، کتنی جلدی رام ہوئے
کتنے کڑوے زہر پیے ہیں میٹھی میٹھی باتوں سے

خودداری کیا شے ہے یارو، ہم کو اب معلوم ہوا
ہم نے دل کا شیشہ توڑا خود اپنے ہی ہاتھوں سے

عہد وفا، پیمانِ محبت، ہم تو سب کچھ بھول گئے
دل کو ہم بہلائیں کیسے جھوٹے رشتے ناتوں سے

نظرِ کرم اور ہم پر یارب سنتے ہیں کچھ لوگ ابھی
اپنے گناہوں کو دھوتے ہیں بخشش اور خیراتوں سے

غزل

سید سبط حسن ۔ سالِ دوم

یوں موت زیست کی تو کبھی ہمسفر نہ تھی
اتنی کٹھن کبھی تو تیری رہگزر نہ تھی

کیوں تم بھی جلتے جاتے اپنا زخم دے گئے
اس دل کے ٹوٹنے میں تو باقی کسر نہ تھی

پہلے ہی جل رہا تھا میرا آشیاں مگر
سنتے ہیں کہ بجلیوں کو اس کی خبر نہ تھی

مقدور بھر تو ہم نے سحر کی تلاش کی
تقدیر میں لکھی ہوئی شاید سحر نہ تھی

سبطِ نشانِ راہ بھی اب تو ہوا محال
منزل بھی اپنی دور یہ اتنی مگر نہ تھی

غزل

محمد الیاس (سالِ چہارم)

غزل

محمد ابراہیم ۔ سالِ چہارم

چراغ زخم جلاؤ حسین بہاروں میں
کہیں سے روشنی لاؤ حسین بہاروں میں
خزاں میں اہلِ گلستاں کا حشر کیا ہوگا
نہ یہ سوال اٹھاؤ حسین بہاروں میں
خیالِ یار کی ناگن نے ڈس لیا ہم کو
خدارا یاد نہ آؤ حسین بہاروں میں
مٹا کر حفظ مراتب کے سارے بت خانے
بڑے ہی شوق سے گاؤ حسین بہاروں میں
بڑے خلوص سے کہتا ہے آج ابراہیم
مناؤ جشن مناؤ حسین بہاروں میں

مجھ پہ کبھی دل کے راز کو افشا نہ کیجیے
اپنا خیال کیجیے، میرا نہ کیجیے
دشواریاں بہت ہیں محبت کی راہ میں
یارب کسی کو شیدا کسی کا نہ کیجیے
دل کا گلہ سنیں، کہ جگر کی شکایتیں
کس کا خیال کیجیے، کس کا نہ کیجیے
دو دن کی چاندنی ہے مگر پھر اندھیری رات
صاحب غرورِ حسن پہ اتنا نہ کیجیے
جائز نہیں یہ عشق کے مذہب میں اہلِ دل
ہرگز کسی کا بھول کے شکوہ نہ کیجیے

غزل

• زمین السالکین •
سالِ چہارم

ہائے میں نے کیا کیا اظہارِ ارماں کر دیا
رازِ دل کہہ کر انہیں بھی کیوں پشیماں کر دیا

پھیر کر اپنی نگاہیں تم نے مجھ سے دفعتاً
شہرِ دل کو لوٹ کر تاراج و ویراں کر دیا

یہ تبسم یہ خدام ناز یہ انگڑائیاں
میرے مرمٹنے کا تم نے جمع ساماں کر دیا

بزمِ انجم کے شرارے آگ برسانے لگے
شورشِ دل نے مجھے بھی پھر غزل خواں کر دیا

جب یقینِ سوزِ الفت ہو گیا سالکؔ مجھے
آنسوؤں کو میں نے اس کا عہد و پیماں کر دیا

غزل

● اسماء صدیقی۔ سالِ اوّل ●

دن سے خوف آتا ہے اب رات سے جی ڈرتا ہے
صبح کی کشف و کرامات سے جی ڈرتا ہے
وہ ہو غیروں کی جفا یا کہ وفا اپنوں کی
اب دنیا کی ہر اک بات سے جی ڈرتا ہے
ظلم و بیدادِ عزیزاں کا گلہ کیا معنی
اپنے معصوم خیالات سے جی ڈرتا ہے
مجھ کو بگڑے ہوئے اطوار زمانہ کی قسم
اب سنورتے ہوئے حالات سے جی ڈرتا ہے
اس شکر خائی و شیریں سخنی کے باوصف
زندگی! تلخیٔ حالات سے جی ڈرتا ہے
پھول کے بوجھ سے ہر شاخ چمن ٹوٹ گئی
موسمِ گل کی عنایات سے جی ڈرتا ہے
جورِ اغیار سے اسماءؔ کو شکایت تو نہیں
ہاں بس اپنوں کی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

غزل

● عذرا جمال۔ سالِ دوئم ●

اک غم مسرتوں میں سمایا کبھی کبھی
گزرا زمانہ یاد جو آیا کبھی کبھی
منزل کی دوریوں سے بھی لذت مجھے ملی
راہوں کے پیچ و خم نے ستایا کبھی کبھی
کسی نے خزاں کی راہ میں کلیاں بکھیر دیں
مثلِ بہار کون یہ آیا کبھی کبھی
خود اپنی ذات سے میں گریزاں ہوں جس طرح
یوں دور دور رہتا ہے سایا کبھی کبھی
ہر ساز بج رہا تھا مگر خامشی کے ساتھ
ایسا اداس وقت بھی آیا کبھی کبھی
یادوں کی اک دھنک میرے دل میں اتر گئی
نغمہ کسی نے ایسا سنایا کبھی کبھی
عذراؔ کسی کی یاد میں ہم ایسے گم ہوئے
ڈھونڈا ہزار خود کو نہ پایا کبھی کبھی

دیر ہوگئی ۔ ابھی تو پرانے ہوسٹل بھی چلنا ہے ۔ کالج سے تین فرلانگ کے فاصلہ پر اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہوگیا ہو اور کچھ ہی دن کا مہمان ہو۔ ہاسٹل میں رہنے والے جب بعد دوپہر کالج سے ہاسٹل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں تو ان کے دل ایک انجانے خوف سے لرز رہے ہوتے ہیں۔ مگر جونہی ان کی نظر ہاسٹل پر پڑتی ہے تو اسے صحیح وسلامت دیکھ کر بیساختہ ان کے ہاتھ بارہ گاہ ایزدی میں اٹھ جاتے ہیں اور ہاسٹل کی درازیٔ عمر کی دعا ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے ۔ ہاسٹل کا دروازہ سرنگ کی طرح ہے اور کمرے بلا مبالغہ چوہوں کے بلوں کی مانند مگر چونکہ میکلوڈ روڈ پر واقع ہے اس لئے باکمال لوگ لاجواب سروس کا متحمل نظر آتا ہے ۔

ہاں چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ ایک گرلز ہاسٹل بھی ہے تاکہ طالبات احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا ہے یہ ہسپتال میں T.M.H وارڈ کے سامنے واقع ہے اور افسوس کہ اس کے علاوہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ اس طرف کا رخ کرتے ہوئے ہی ڈر لگتا ہے کہ آج کل لڑکیوں میں موٹے موٹے تلے والی سینڈلز کا زیادہ رواج ہے ۔

آیئے اب آپ کو ہاسٹل زندگی کے بارے میں بتائیں کہ کن کن نشیب و فراز سے گزر رہی ہے ۔ سب سے پہلے آپ کی ہاسٹل کے ملازمین servants سے ملاتے ہیں ۔ ہر ایک مختلف طبیعت کا مالک ہوتا ہے ۔ بعض تو تھوڑا بہت کام کر کے ہم پر احسان کر دیتے ہیں لیکن اکثر کا سلوک تو ناقابل بیان ہی سمجھیں ۔ البتہ عید کے بعد جب آپ گھر سے لوٹیں تو ہر ایک آپ کو بڑھ چڑھ کر ایک عدد شاندار فوجی سیلوٹ ملے گا ۔ جس کا مطلب ہمارے علاوہ شاید دوسرے نہ سمجھتے ہوں اور ہم جو ایک عدد نئی پینٹ بنوانے کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا ۔ وہ دیکھیے سامنے ہی پستہ قد جھکی ہوئی گردن اور منحنی سا آدمی ہمارا دن کی ڈیوٹی کا چوکیدار ہے ۔ جب کہ رات کی ڈیوٹی کا چوکیدار ملاحظہ ہمارے پرنسپل صاحب کا وہ مفرور ڈھانچہ ہے جسے وہ اکثر سال اول کی کلاس میں لاکر طلبہ کو demoralize کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں ۔

چوکیدار تو تمام ہاسٹلز کے ایک جیسے ہی اہم ہوتے ہیں مگر گرلز ہاسٹلز کا چوکیدار کچھ خاص ہی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعہ ماحول (Atmosphere)..

آیئے اب ڈائننگ ہال چلیں جسے عرف عام میں (Mess) کہا جاتا ہے ۔ لمبی سی میز کے گرد لڑکے صبح و شام باورچیوں کے رحم و کرم پر کھانے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں ۔ کھانے کا معیار اور بینگن و چکن فرائی میں فرق تو صرف باورچیوں اور ان کی بیگمات کے موڈ پر ہی ہوتا ہے مگر ہاسٹل سے باہر رہنے والے تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہاسٹل میں من و سلویٰ نازل ہو رہا ہے مگر ہاسٹل میں آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نظر آنے والا من و سلویٰ دراصل نذر یوں کو بانٹنے والا کھانا یا کسی میلہ پر تقسیم کی گئی کوئی نیاز ہوتی ہے اور اگر کبھی کسی نے اس دنیاوی من و سلویٰ پر احتجاج کیا تو جواب حاضر ہوتا ہے کہ صاحب کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ . . . . اور صاحب اپنا سا منہ لے کر اسی پر شاکر نظر آنے لگتا ہے ۔

آیئے ہاسٹل والوں کے مشاغل سنیئے ۔ چونکہ ہاسٹل میں گراؤنڈ یا لان وغیرہ تو سرے سے ہے ہی نہیں ۔ اس لئے شام کو جب طبیعت میں جولانی کیفیت موجزن ہوتی ہے تو پھر کسی راہ گیر پر پانی پھینک کر یا کسی محو گفتگو جوڑے کو ڈسٹرب کر کے اپنے لئے تفریح کے مواقع فراہم کرتے ہیں بعض ڈھیٹ قسم کے راہ گیر یہ سوچتے ہیں کہ وارڈن کو شکایت کر کے رہیں گے ۔ مگر افسوس کہ انھیں یہ کون سمجھائے کہ ہم جنہیں کئی کئی سال رہتے ہوتے ہو گیا ہے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وارڈن صاحب رورل ایریا میں یا اربن ایریا میں رہتے ہیں اور سیکریٹری صاحب کون سے آسمان کی سیر کو گئے ہوئے ہیں ۔ وہ کس سے شکایت کریں گے اس کے بعد Sunday issue میں یہ خبر پڑھ کر کہ ہاسٹل میں رہنے والوں نے راہ گیروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ ہمیں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ شاید ہی کسی ٹیم کو اخبار میں اپنی فتح کی خبر پڑھ کر ہوتی ہو ۔ اس کے علاوہ ہاسٹل کی چھت پر کرکٹ کھیلنا ۔ کمروں میں بیڈمنٹن کھیلنا بھی مشاغل میں شامل ہے اس کے علاوہ اگر کبھی بچپن کی یادیں تازہ کرنی ہوں تو گلی ڈنڈا اور مار دھاڑ بھی ہو جاتی ہے ۔

آیئے اب ہاسٹل میں داخلے کے مراحل سے گزریں (Admission)
اصولی طور پر تو آپ درخواست کے بعد وارڈن صاحب اور پرنسپل

● تنویر صادق - سال اوّل ●

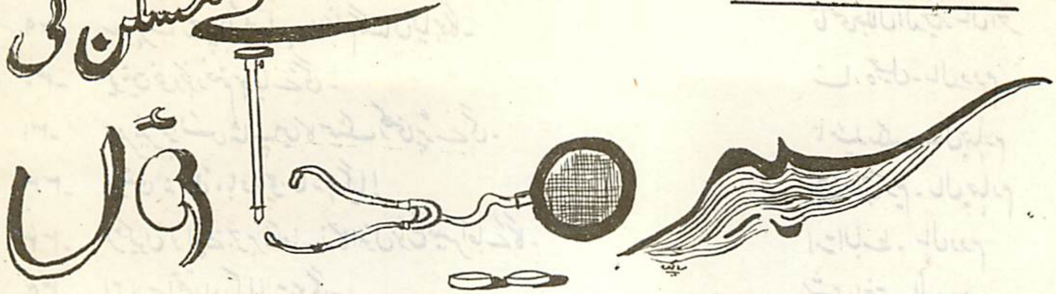

سیر مسیحاؤں کے مسکن کی

آیئے آپ کو ڈائو کے ہاسٹلز ری HOSTELS کی سیر پہ لے چلیں۔ سب سے پہلے ہاسٹل نمبر۳ کے درشن ہو جایئں۔ محترم جانا بلی بی روڈ پر واقع ہیں۔ اپنے سینئرز سے سنتا آیا ہوں کہ کسی زمانے میں کراچی یونیورسٹی کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک زمانے میں اسے اسکول رہنے کا شرف ضرور حاصل ہوا ہو گا کیونکہ اس پر ایک اسکول کا نام کندہ ہے اور اکثر کمروں میں بلیک بورڈ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو گا کہ محترم ایک بزرگ ہستی کے مالک ہیں اور بلا مبالغہ بزرگی ٹپکتی ہے۔ آیئے اب اس کے کمروں کا جائزہ لیں بہ نظر غائر دیکھیں تو کمرہ کم اصطبل زیادہ نظر آتا ہے مگر غور سے دیکھنے پر اس کی خوبیاں ظاہر ہو جاتی ہیں کہ کشادہ بھی ہے ہوادار اور روشن بھی ہے کیونکہ ہر کمرہ کے چار بڑے بڑے دروازے، دو دو کھڑکیاں اور چار کنگ سائز روشن دان ہیں کھڑکی اور دروازوں کی زیادتی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ شاید اس زمانے میں لکڑی سیمنٹ سے سستی ہو اور انجنیئر صاحب سستے ہی چھوٹ جانے کے خواہاں ہوں البتہ اگر انجنیئر صاحب زندہ ہوتے تو اس لکڑی کو صندل نہیں تو کم از کم ساگوان ضرور ہی بتاتے۔

آیئے اب ہاسٹل نمبر۲ چلیں کیونکہ یہ نزدیک واقع ہے۔ لیجئے یہ رہا ہاسٹل نمبر۲ گیٹ پر ہی پبلک فون، خطرے کا نشان بنا کھڑا ہے جیسے کہ سامنے کسی سڑک کی کھدائی ہو رہی ہو۔ یہ فون اکثر خراب ہی رہتا ہے اور بہت زیادہ بیٹو ہے۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے کبھی فون کھڑ کھڑاتا ہو تو ڈیوٹی پر موجود چوکیدار کا موڈ آف ہوتا ہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے صاحب کی غیر حاضری کی اطلاع دے دیتا ہے۔ ہاسٹل کے کمرے نسبتاً چھوٹے ہیں اور بظاہر جیل کی "بی" کلاس کی کوٹھڑیوں کے مشابہ ہیں۔

ہاسٹل نمبر۲ کے سامنے ہی ہاسٹل نمبر۱ (نیو) اپنی شان و شوکت کے ساتھ سینہ تانے کھڑا ہے کیونکہ ابھی عہد جوانی ہے۔ اس کے کمرے اور جائے وقوع نسبتاً بہتر ہے۔ ساتھ ہی مسجد ہے جو کہ صرف محلے والوں کے دم سے رونق افروز رہتی ہے۔ ساکنانِ ہوسٹل تو کبھی کبھار جمعہ کے دن یہ سوچ کر چلے جاتے ہیں کہ شاید آج کوئی اور نہ آیا ہو یا پھر اکثر امتحانوں کے نزدیک ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے۔

ہاسٹل نمبر۴ ہسپتال میں پرائیویٹ وارڈ کے سامنے واقع ہے باہر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کبھی کوئی وارڈ ہی ہو۔ مگر اس کی پیشانی پر لگا ہوا بورڈ چیخ چیخ کر یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ بیماروں کا نہیں مسیحاؤں کا مسکن ہے۔ ہاسٹل زیر زمین بلڈنگ کے مشابہ ہے۔ کیونکہ نہ ہوادار ہے اور نہ ہی روشن۔ اگرچہ کہ روشن دان موجود ہیں۔ اس کی خوبی اس میں رہنے والے ہیں کہ یہاں زندگی رقصاں ہے۔

۲۶۔	روزانہ ڈرامے ہوا کریں گے۔	اقبال رانا دایا۔ سال دوم
۲۷۔	تو طلباء یونین آفس کے چکر کاٹتے نظر آئیں گے۔	ظفر پرویز۔ سال چہارم
۲۸۔	موجودہ دو عہدے ہی کافی ہیں۔	جاوید صغیر۔ سال آخر
۲۹۔	؎ ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہو گا۔	قاضی جلال الدین۔ سال آخر
۳۰۔	یونین خود بخود ختم ہو جائے گی۔	سارہ جمیل۔ سال دوم
۳۱۔	پھر فیئر پرائس شاپ میں کاسمیٹک رکھنی پڑے گی۔	نائیلہ ملک۔ سال چہارم
۳۲۔	یونین نہ ہوئی، باورچی خانہ ہو گیا!	امین حاجی کریم۔ سال چہارم
۳۳۔	لڑکیوں کو اپنے جوہر دکھانے کا انمول موقع میسر آجائے گا۔	امۃ الباسط۔ سال دوم
۳۴۔	اس سے اچھی اور کیا بات ہو گی۔	شیریں اختر۔ سال دوم
۳۵۔	یونین کی شہرت میں اضافہ ہو جائے گا۔	طاہر حسین۔ سال دوم
۳۶۔	روزانہ جنرل باڈی میٹنگ کا مطالبہ ہو گا۔	فاروق بادشاہ۔ سال دوم
۳۷۔	طلباء میں بے چینی پھیلے گی اور اس کا نتیجہ........	محمد خورشید۔ سال سوم
۳۸۔	حماقت، حماقت، سراسر حماقت۔	شکیل احمد۔ سال سوم
۳۹۔	پرواز تو دونوں کی ہے اس ایک فضا میں : کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور	سجاد۔ سال آخر
۴۰۔	دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟	ندیم الدین۔ سال دوم
۴۱۔	کیوں! اپنی شامت بلاتے ہیں۔	نیر اقبال۔ سال چہارم
۴۲۔	مار دھاڑ ختم، بلکہ زبان کی لڑائی	شہنازہ۔ سال آخر

اگر انجمن طلبا کے تمام عہدے صرف طالبات کیلئے مخصوص کر دیئے جائیں تو

۱۔	واہ بھئی! چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔	فاطمہ قدسیہ۔ سال دوم
۲۔	کسی بھی مسئلے پر اتفاق رائے مشکل ہوجائے گا۔	محمد شریف حسین۔ سال دوم
۳۔	پھر جمخانہ سیکرٹری نٹنگ کا مقابلہ کروائیں گی۔	انوار احمد ملک۔ سال چہارم
۴۔	ہائے اللہ! کتنا مزا آئے گا۔ ہم سب سے پہلے املی کا درخت لگائیں گے۔	بدر النساء۔ سال دوم
۵۔	کام کم اور باتوں کا سلسلہ لامتناہی۔	شاہین ناز۔ سال دوم
۶۔	کم از کم اس سال تو انہیں یہ مراعات دیدی جائیں۔ آخر یہ INTERNATIONAL WOMEN YEAR ہے۔	سہیل احمد انصاری۔ سال دوم
۷۔	مخلوط تعلیم میں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔	سید نذر علی۔ سال دوم
۸۔	خوشحال پاکستان کی طرف مفید قدم ہوگا۔	جعفر خان رمزی۔ سال چہارم
۹۔	تو لڑکوں کی مصروفیات کا دائرہ صرف یونین آفس تک ہی محدود ہوکر رہ جائے گا۔	شائستہ ظفر۔ سال دوم
۱۰۔	یونین آفس بیوٹی سینٹر بن جائے گا۔	نجم الثاقب۔ سال چہارم
۱۱۔	مطالبات منوانے کا ذریعہ بھوک ہڑتال کے بجائے رونا دھونا ہو جائے گا۔	قاضی معین الدین۔ سال دوم
۱۲۔	دنیا میں آج تک اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ لڑکیاں ایک ساتھ رہیں۔	ہمایوں ظفر۔ سال دوم
۱۳۔	آڈیٹوریم کو بھی یونین آفس بنانا پڑے گا۔	محمد فیروز ظفر۔ سال دوم
۱۴۔	یونین فنڈ سے سب سے پہلے لڑکوں کو چوڑیاں پہنائی جائیں گی۔	شاہدہ نصیب۔ سال دوم
۱۵۔	مطالبات جلد منظور ہو جایا کریں گے۔	ضیاء العارفین۔ سال دوم
۱۶۔	سنگھار میز بھی یونین آفس میں رکھنی پڑے گی۔	عبید الرحمٰن۔ سال دوم
۱۷۔	بھئی! پہلے ایک دو عہدے تو دے کر آزما لیا جائے۔	اسلام جنید۔ سال دوم
۱۸۔	ہائے! الیکشن کے وقت کیا منظر ہوگا۔؟	محمد ادریس۔ سال سوم
۱۹۔	پھر ہر فنکشن ONLY FOR LADIES	شبانہ سعید۔ سال دوم
۲۰۔	ممکن ہے طالبات یہ کام بہتر طور پر انجام دے سکیں۔	پرویز احمد۔ سال دوم
۲۱۔	مطالبات منوانے میں سہولت رہے گی۔	محمد گڈرا۔ سال دوم
۲۲۔	کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوگا۔	صفدر ضمیر۔ سال دوم
۲۳۔	تو طلبا کیا کریں گے؟	اختر بٹ۔ سال آخر
۲۴۔	تو کالج کا خدا ہی حافظ۔!	اظہار القمر۔ سال آخر

اگر آپ کو انجمن طلبا کا صدر بنا دیا جائے تو

۱۔ جناب! میں اپنی زندگی سے ابھی اتنی بیزار نہیں ہوئی۔ — شائستہ ظفر۔ سال دوم

۲۔ کالج کی چھٹی — عبدالماجد۔ سالِ آخر

۳۔ میں مارشل لاء نافذ کر کے تاحیات صدر بن جاؤں گا۔ — انوار احمد ملک۔ سال چہارم

۴۔ پہلے یونین فنڈ ہضم کرنے کا نسخہ تو بتائیں۔ — محمد کڑوا۔ سال دوم

۵۔ کالج میں گنجائش کے مطابق نشستیں کم کرا دوں گا۔ — پرویز احمد۔ سال دوم

۶۔ سیمسٹر سسٹم نافذ کرانے کی کوشش کروں گا۔ — ظفر پرویز۔ سال چہارم

۷۔ اس کے بغیر بھی تو کام چل سکتا ہے۔ — ہمایوں ظفر صدیقی۔ سال دوم

۸۔ گندی سیاست اور صوبائیت کا قلع قمع کرا دوں گا۔ — نامر نظام مغل۔ سال دوم

۹۔ کیوں بور کر رہے ہو یار؟ — محمد ادریس۔ سال سوم

۱۰۔ نشستوں کی منصفانہ تقسیم کرانے کی کوشش کروں گا۔ — سید شاہنواز۔ سال دوم

۱۱۔ ٹھیک ہے بن جائیں گے۔ — جمیل رضوی۔ سال آخر

۱۲۔ سب سے پہلے انتظامیہ درست کروں گا۔ — حافظ محمد عابد اعوان۔ سال دوم

۱۳۔ پھر یونین فنڈ کا حساب نہ لیا جائے۔ — جاوید صغیر۔ سالِ آخر

۱۴۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ میں کیا کروں گا۔ — محمد علی کلیزی۔ سالِ آخر

۱۵۔ آزما کر دیکھ لو۔ — نادر علی خان۔ سال دوم

۱۶۔ میرے پاس پہلے ہی کار موجود ہے۔ — تمیز الحسن۔ سال دوم

۱۷۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور سال اوّل میں طلباء کی تعداد کم کرنے کی کوشش کروں گا۔ — معین رنگین والا۔ سال دوم

۱۸۔ دو چار کوٹ تو اور آ ہی جائیں گے۔ — قاضی تقی الدین عادل۔ سال آخر

۱۹۔ ایمان سے! کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ ابا ماریں گے۔ — عبید الرحمٰن۔ سال دوم

۲۰۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ — نعیم اختر۔ سال دوم

۲۱۔ خوابوں کی حسین دنیا کی باتیں نہ کریں۔ — مقصود حسن۔ سال دوم

۲۲۔ وقت تو آنے دو۔ — منیر احسان پیرزادہ۔ سال دوم

۲۳۔ پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ — ضیاء العارفین۔ سال دوم

۲۴۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ — سید نذر علی۔ سال دوم

۲۵۔ کیوں! مجھے یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ — سعید اختر۔ سال دوم

۲۶۔ تو میں ڈی۔ایم۔سی میں پارلیمانی طرز حکومت قائم کروں گا۔ — مصطفےٰ علی خان۔ سال آخر

۲۷۔ ایسی باتیں نہ کرو، جاؤ کھیلو۔ — سہیل احمد انصاری۔ سال دوم

اگر امتحانات ملتوی کرانے اور کرنیوالوں کیلئے کڑی سزا مقرر کردی جائے تو

۱۔ لیکن گھنٹی کون باندھے گا؟؟؟ — فاطمہ قدسیہ۔ سال دوم

۲۔ بہتر تو یہ ہے کہ امتحانی مرکز، سینٹرل جیل کراچی ہو۔ — جعفر خان۔ سال چہارم

۳۔ میں اس سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ — معین بخش والا۔ سال دوم

۴۔ جو سزائے موت سے کم نہ ہو۔ — اختر بٹ۔ سال آخر

۵۔ کرنے والوں کو اگر سزا دی جائے تو کرانے والے خود ہی بھاگ جائیں گے۔ — عبدالغنی۔ سال دوم

۶۔ کینٹین اور کیفے ویران ہو جائیں گے۔ — محمد کڑوا۔ سال دوم

۷۔ M.B.B.S صرف پانچ سال کا رہ جائے گا۔ — صفدر ضمیر۔ سال دوم

۸۔ نہ رہے بانس! نہ بجے بانسری! — شبین ناز۔ سال دوم

۹۔ امتحان پھر اساتذہ کو دینا پڑے گا۔ — اقبال رانادایا۔ سال دوم

۱۰۔ پاکستان کی جیلیں بھر جائیں گی۔ — عبیدالرحمن۔ سال دوم

۱۱۔ نہیں! کیونکہ ہم جیسے طالب علموں کا فائدہ ہوتا ہے۔ — محفوظ پیش امام۔ سال دوم

۱۲۔ سزا کے بجائے EXTRA CLASSES کا انتظام کیا جائے۔ — سید تنویر اختر۔ سال دوم

۱۳۔ سزا دینے والوں کو سزا دی جائے — فاروق بادشاہ۔ سال دوم

۱۴۔ وہ نہ بدلے تھے، نہ بدلے ہیں، نہ بدلیں گے کبھی۔ — بدرالنساء۔ سال دوم

۱۵۔ بال سفید ہونے سے پہلے کالج سے نکلنا پڑے گا۔ — سعدیہ واحد۔ سال چہارم

۱۶۔ حکومت کا تختہ اسی دن الٹ جائے گا۔ — محمد اقبال یوسف۔ سال دوم

۱۷۔ کالا پانی مناسب رہے گا۔ — امین حاجی کریم۔ سال چہارم

۱۸۔ کہیں ان لوگوں کی صفوں میں آپ تو شامل نہیں؟ — زینب نور محمد۔ سال دوم

۱۹۔ ہمت ہے؟ — سارہ جمیل۔ سال دوم

۲۰۔ نیک خیال ہے۔ — شاہین فاطمہ۔ سال دوم

۲۱۔ اپنے لئے تو سزا تجویز کرنا مشکل ہے۔ — شبانہ سعید۔ سال دوم

۲۲۔ سزا گاہ وسیع بنایئے گا ذرا! — شائستہ ظفر۔ سال دوم

۲۳۔ سزا دینے والوں میں ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔ — شیریں اختر۔ سال دوم

اگر لڑکیوں کی نشستیں میڈیکل کالج سے ختم کر دی جائیں تو

۱۔	لڑکیوں سے مت پوچھنا، مصیبت آجائے گی ۔	محمد فیروز اظفر۔ سال دوم
۲۔	پھر ہم کہاں جائیں ؟	نجم الثاقب۔ سال چہارم
۳۔	پھر کیا بچے گا۔ لڑکوں کی تعداد بھی نصف رہ جائے گا ۔	محمد فاروق۔ سال آخر
۴۔	ابے لے !	ضیاء العارفین۔ سال دوم
۵۔	تعلیم کا معیار بلند ہو جائے گا ۔	محمد ادریس ۔ سال سوم
۶۔	سراسر ظلم ہوگا ۔	شفیق علی بیگ ۔ سال دوم
۷۔	بہت سے مسائل کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا	سارہ جمیل۔ سال دوم
۸۔	لڑکے میڈیکل کالج کا راستہ بھول جائیں گے ۔	فاطمہ قدسیہ۔ سال دوم
۹۔	تو پڑھائی میں دل نہیں لگے گا ۔	عبد الغنی ۔ سال دوم
۱۰۔	لڑکے خود بخود داخلہ لینا چھوڑ دیں گے ۔	بدر النساء۔ سال دوم
۱۱۔	بوائز کامن روم تباہ ہو جائے گا ۔	شاہین فاطمہ۔ سال دوم
۱۲۔	لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی ۔	عبد الغنی۔ سال دوم
۱۳۔	حوا کی بیٹیاں میڈیکل کالج کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گی ۔	آمنۃ الباسط۔ سال دوم
۱۴۔	لڑکے تڑپ جائیں گے ۔	نائیلہ ملک۔ سال چہارم
۱۵۔	لڑکوں کی نشستیں خود بخود کم ہو جائیں گی ۔	محمد بختیار حسین ۔ سال دوم
۱۶۔	لڑکے زیادہ پاس ہوں گے ۔ والدین کا خرچ بھی بچے گا ۔	زینب نور محمد۔ سال دوم
۱۷۔	میں اس کے خلاف ہوں، کیونکہ ان کے لئے یہ ہی ایک معزز پیشہ ہے ۔	سید افضال حیدر۔ سال دوم
۱۸۔	لڑکے پڑھنا چھوڑ دیں گے ۔	شہلا اختر۔ سال دوم
۱۹۔	ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ ورنہ لڑکے بھی اپنی نشستیں ختم کرانے کیلئے سڑکوں پہ نکل آئیں گے ۔	شائستہ ظفر۔ سال دوم
۲۰۔	رونق ختم ہو جائے گی ۔	جمیل رضوی۔ سال آخر
۲۱۔	اس سے بڑا ظلم تو کوئی نہ ہوگا ۔	محمد منہاج ۔ سال سوم
۲۲۔	ضرور۔ لیڈیز ڈاکٹر کی ضرورت کے پیش نظر ۔	محمد عابد اعوان۔ سال دوم
۲۳۔	تو گرلز کامن روم کے آرام دہ فرنیچر سے لطف اندوز ہونے کا موقع تو مل سکے گا ۔	قاضی جلال الدین۔ سال آخر
۲۴۔	ظاہر ہے کالج ویران ہو جائے گا ۔	جاوید صغیر۔ سال آخر
۲۵۔	ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔	اسامہ سبائی ۔ سال آخر
۲۶ ۔	آبادی کا مستقبل روشن ہو جائے گا ۔	نیر اقبال۔ سال چہارم

اگر میڈیکل اسٹوڈنٹ کے ایپرن پہننے پر پابندی لگا دی جائے تو

۱۔	درزیوں اور دھوبیوں کی آمدنی میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔	نیر اقبال ۔ سال چہارم
۲۔	بالکل غلط خیال ہے۔ عام طالب علم اور طب کے طالب علم میں فرق ختم ہو جائے گا	حافظ محمد عابد اعوان ۔ سال دوم
۳۔	کپڑے کے تاجروں کا استحصال ہوگا۔	محمد وقار صغیر ۔ سال چہارم
۴۔	ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ سارا بھرم کھل جائے گا۔	انوار احمد ملک ۔ سال چہارم
۵۔	صنف نازک واقعی نازک نظر آئیں گی۔	ظفر پرویز ۔ سال چہارم
۶۔	کالج میں فیشن میں اضافہ ہو جائے گا۔	صفدر ضمیر ۔ سال دوم
۷۔	ڈاؤ میڈیکل کالج کلب قائم ہو جائے گا۔	اسلام جنید ۔ سال دوم
۸۔	رنگ پیراہن کی خوشبو، زلف لہرانے کا نام	نجم الثاقب ۔ سال چہارم
۹۔	ع۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔	سید نذر علی ۔ سال دوم
۱۰۔	کیوں بیچارے لڑکوں کو "ٹلر" بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔؟	بدر النساء ۔ سال دوم
۱۱۔	پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ	امین حاجی کریم ۔ سال چہارم
۱۲۔	بہت اچھی بات ہے اگر ہمارے FEMALE ساتھی ناراض نہ ہوں۔	جعفر خان زمری ۔ سال چہارم
۱۳۔	لڑکیوں کو دیکھنے میں آنکھوں پر زیادہ زور پڑے گا اور نتیجتاً EYE O.P.D میں دُگنا رش	شبین ناز ۔ سال دوم
۱۴۔	فیشن کا مقابلہ کچھ زیادہ ہی بڑھ جائے گا۔	شہلا اختر ۔ سال دوم
۱۵۔	رنگ و بو کا ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہو جائے گا۔	شاہین فاطمہ ۔ سال دوم
۱۶۔	کار خیر میں دیر چہ معنی دارد؟	سعدیہ واحد ۔ سال چہارم
۱۷۔	بے ہودہ خیال ہے۔	اظہار القمر ۔ سال آخر
۱۸۔	پھر لڑکوں اور لڑکیوں کو پہچاننے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔	طارق ظہور عالم ۔ سال آخر
۱۹۔	یہ بہتر ہے کہ لڑکوں کو برقع پہنا دیا جائے اور لڑکیوں کے ایپرن پہننے پر پابندی لگا دی جائے۔	زینب نور محمد ۔ سال دوم
۲۰۔	ہسپتال جانا مشکل ہو جائے گا۔	خالد چوہان ۔ سال دوم
۲۱۔	کچھ نئے انکشافات ہوں گے۔	ابو نعیم فاروقی ۔ سال آخر
۲۲۔	ضرور لگائیں جناب۔	قاضی تقی الدین عادل ۔ سال آخر
۲۳۔	بالکل پسند نہیں کریں گے۔	ڈاکٹر کیپٹن مظفر حسین ۔ سال آخر
۲۴۔	سب حجام لگیں گے۔	محمد علی ۔ سال آخر
۲۵۔	اچھا خیال نہیں ہے۔	اسامہ سبائی ۔ سال آخر

شگفتہ شگفتہ

مسیحاؤں کی یہ بستی اور اس کے باسی دور سے دیکھنے والوں کو جتنے مصروف اور سنجیدہ اور باوقار نظر آتے ہیں۔ قریب سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خشک کتابوں اور نشتروں کے پس منظر میں زندہ دل نوجوان مسیحا انتہائی ذوق و شوق سے درسِ مسیحائی کے ساتھ دنیا کے رنگ و بو میں اپنی خوش مزاجی کی شگفتہ شگفتہ خوشبو ہر سمت بکھیر رہے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ یہی شگفتگی اس البیلی بستی کے باسیوں کو حیرت انگیز امکانات اور حقیقت کی دنیا سے دور کسی اور مختلف دنیا کی، جسے آپ افسانوں کی دنیا کہہ لیں، سیر نہ کرا سکے۔

تو صاحب ایک لمحے کے لئے ذرا اپنے ان سنجیدہ بند خولوں سے باہر نکل آیئے تاکہ ہم آپ کو بھی اس امکانی مسیحاؤں کی بستی کی سیر کرا سکیں، جہاں میڈیکل اسٹوڈنٹ کو ایپرن پہننے کی قطعی اجازت نہ ہو۔ جس کی یونین کی تمام نشستیں طالبات کے لئے مخصوص ہوں۔ جس کی انجمن اتحاد طلباء کے صدر آپ ہوں۔ جہاں آپ اپنی مرضی سے نشستیں سینکڑوں نہیں ہزاروں تک بڑھا سکیں۔ اور امتحانات ملتوی کرنے والوں کو بھیا......... سے لے کر کسی بھی اور قسم کی سزا دے سکیں۔ المختصر آپ ہی اس بستی کے مختارِ کل ہوں، تو آیئے باری باری دیکھتے ہیں کہ مستقبل کے یہ مسیحا ہمارے اس قسم کے شگفتہ بلکہ حیرت انگیز سوالات کے کیا امکانی جواب دیتے ہیں۔ تو تھامیئے دستار ـــ بلکہ ایپرن ـ! کہ ہمارے سوالات شروع ہوتے ہیں۔

میں یونانی، شامی، عربی، ایرانی اور ہندوستانی ماخذ دیئے ہیں اور آخر میں انہوں نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ دواسازی پر انہوں نے "کتاب الاسرار" نامی کتاب تصنیف کی جس میں کیمیاوی مادوں کی تیاری اور ان کے استعمال پر بحث کی گئی ہے

جب بھی مسلمانوں کی طبی خدمات کا ذکر کیا جائیگا ابوالقاسم الزہراوی کا نام سرفہرست ضرور آئیگا جو مغرب میں "الکاسس" کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اسپینی خلیفہ الحکم ثانی کے طبیب تھے اور عظیم ترین مسلم سرجن تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی زیادہ شہرت کا باعث ان کی طبی انسائیکلوپیڈیا "التصریف" ہے جو طبی سائنس سے متعلق تیس حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کی تین آخری اہم ترین جلدیں علم جراحت (سرجری) سے متعلق ہیں۔ ان میں لوہا گرم کرکے زخموں کو داغنے، مثانہ سے پتھری ریزہ ریزہ کرکے نکالنے اور زندہ جانور کی چیر پھاڑ اور تشریح کی ضرورت سے متعلق نئے نظریات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ "التصریف" میں تصعید اور تقطیر کے ذریعہ دواسازی کا دلچسپ اور واضح طریقہ موجود ہے۔ سرجری کی جلدوں کے ایک حصے میں دایہ گیری اور سرجری کے ذریعے آنکھ، کان اور دانتوں کے علاج سے بحث کی گئی ہے۔ وہ ایک ممتاز دندان ساز تھے اور ان کی کتاب میں دندان سازی سے متعلق آلات کی تصاویر دی گئی ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں دندان سازی کے متعدد طریقے درج کئے ہیں۔

الزہراوی ایک ماہر دندان ساز تھے جو خراب دانت کی جگہ کامیابی کے ساتھ مصنوعی دانت لگانے میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے پہلی بار مہلک ہیموفیلیا کی توضیح کی۔ "امراض نسواں" کے بارے میں بھی ابوالقاسم زہراوی نے التصریف کی ایک جلد میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور ان کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔

بوعلی سینا کی لاثانی تصنیف "القانون فی الطب" عربی زبان میں طب کی بیش بہا کتاب ہے جو پانچ جلدوں میں علم طب کی انسائیکلوپیڈیا ہے اس میں ۷۶۰ مرکبات کے علاوہ عام ادویات، مفردات اور سر سے لے کر پیر تک ساری بیماریوں کی تفصیل اور ان کا علاج مندرج ہے۔ اس کتاب میں امراض کی تشخیص اور ان کی ادویات کی بہت تفصیل سے دی ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے پیچیدہ وبائی امراض کا علاج بتایا ہے اور انہیں روکنے کے طریقے بیان کئے ہیں۔

اسپین کے مسلمان اطباء میں ابوالقاسم زہراوی کے بعد ابن الرشد کا نام آتا ہے جو بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الکلیات فی الطب" بھی شامل ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے اور طب کے تمام شعبوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ امراض کی تشخیص۔ علاج اور ان کی روک تھام سے متعلق تمام امور پر بحث کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی شخص کو دوسری بار چیچک کی بیماری نہیں ہوتی ہے۔

ابن بیطار اگرچہ ماہر نباتات تھے مگر انہوں نے ادویات کی انسائیکلوپیڈیا "کتاب المغنی فی الادویۃ المفردہ" لکھی جس میں ایسے مفردات کی تفصیل اور خصوصیات مندرج ہیں جو سرطان، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی بیماریوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ بہت سی دوائیں اور امراض کے نسخے مندرج ہیں۔

علی ابن عباس مجوسی کی تصنیف "کتاب المالکی" طبی معلومات کا ایک خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ ابن نفیس نے ولیم ہاروے سے چار سو سال پہلے جسم کے دوران خون کا صحیح پتہ اور اندازہ لگایا۔ ابن قطینہ نے جو اسپین کا مشہور و معروف طبیب تھا طاعون پر ایک بہت مستند کتاب چھوڑی۔ ابن اسحٰق الکندی نے طب پر ۲۲ کتابیں لکھیں۔ ابن الہیثم اگرچہ ماہر طبیعات کی حیثیت سے مشہور ہیں مگر انہوں نے ڈارون کے "نظریہ ارتقاء" کو اس سے کئی سو سال پہلے پیش کیا۔

مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں سائنس اور طب کی جو خدمات انجام دیں ہیں ان کی نظیر نوع انسانی کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے سائنس کی بنیاد رکھی اور دنیا کو سائنس کے طریق کار اور طرز تحقیق سے روشناس کیا۔ آج ہم ثقافتی دور سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ سائنس کے عجائبات دیکھتے ہیں تو حیرت انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ان ساری تحقیقات اور ان ساری کامیابیوں کے اصل بانی ہم خود ہیں اور یہ تسخیر فطرت ہمارا فرض ہے جسے ہم بھلائے ہوتے ہیں۔ اگر یہ فرض ہماری گذشتہ نسل نے نہیں ادا کیا ہے تو آیئے ہم کوشش کرتے ہیں۔ شاید ہم میں سے کوئی ڈاکٹر برنارڈ پیدا ہو، کوئی ڈاکٹر فلیمنگ کوئی پاسچر پیدا ہو۔

- علم کے برابر کوئی ہمنشیں اور ہم کلام نہیں۔ علم انسانیت کا علمبردار ہے۔
- علم ایسا نور ہے جس سے سب مستفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے حصول کے لئے پروانے کی طرح جلنا ضروری ہے۔
- علم ایسا نور ہے جو روح کو ایک انوکھی روشنی سے منور کر دیتا ہے۔

مرسلہ: بلقیس محمد ناظر۔ سال اول

شوکت علی ملک۔ سال چہارم

مسلمانوں کی طبی خدمات

"میں اپالو دیوتا کی قسم کھاتا ہوں تمام دیوی دیوتاؤں کو گواہ بنا کر میں یہ عہد ہمیشہ پورا کروں گا اور اس تحریر شدہ معاہدہ کو اپنی بہترین صلاحیتوں کی مدد سے پورا کروں گا"

یہ عہد نامہ آج بھی ہر طب کے فارغ شدہ طالب علم کو بزبان خود ادا کرنا پڑتا ہے جسے یونانی طالب علم بقراط کی جانب منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ اس شخص کی اپنی شخصیت آج بھی ہزاروں شبہوں میں ڈوبی ہوتی ہے۔ جب کہ ہم صرف سات سو برس پہلے گزرے ہوئے اشخاص کو مکمل بھول چکے ہیں جن کی تصانیف کے ترجمے اب بھی ہو بہو موجود ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمیں اپنے مشاہیر طب سے واقفیت نہیں۔ آیئے دیکھیں محمدؐ کے غلام آج سے سینکڑوں سال پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

قرآن حکیم نے مظاہر فطرت کو علم النفس اور تاریخ انسانی کے ساتھ ساتھ علم کا اہم ماخذ قرار دیا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ارض و سما پر غور کریں۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے مسلمان اس اصول پر عمل کرتے رہے اور اس دور نے ذکریا رازی ابن سینا اور مجوسی جیسے لاثانی ماہر طبیب پیدا کئے۔

مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اسپتال قائم کئے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا اسپتال جندیشاپور میں "بیمارستان" کے نام سے قائم ہوا۔ عباسی خلفاء کے عہد میں ۳۴ سے زائد اسپتال کام کر رہے تھے۔ بغداد کا سب سے پہلا ہسپتال ہارون الرشید نے قائم کیا۔ گیارہویں صدی میں اسلامی ممالک میں گشتی شفاخانوں کا رواج عام ہو گیا تھا۔ عہد عباسی کے بڑے اسپتالوں میں حکماء کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا۔ ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اسناد دی جاتی تھیں اور حکماء کے رجسٹریشن کا بھی قاعدہ رائج تھا۔ اسپتالوں میں عورتوں اور مردوں کے علیحدہ علیحدہ حصے مخصوص تھے۔ بڑے بڑے اسپتالوں میں طبی کتب خانوں کا بھی انتظام تھا۔ سلطان محمود سلجوقی نے سب سے پہلا فوجی طبی دستہ قائم کیا۔

اسلامی دور طب کے سب سے بڑے رہنما ابوبکر محمد ابن ذکریا الرازی تھے جو دسویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔ وہ تہران کے قریب رے میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ انہوں نے طب کے میدان میں "الحاوی" کتاب المنصوری، اور کتاب الجدری والحصبہ جیسی یادگار اور عظیم الشان طبی تصانیف لکھیں۔ کتاب المنصوری میں انہوں نے طب یونانی سے بحث کی ہے۔ چیچک یا خسرہ پر ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "الجدری والحصبہ" اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔ چیچک کے اسباب، علامات اور علاج سے متعلق جو اصول بیان کئے گئے ہیں وہ آج بھی صحیح مانے جاتے ہیں رازی نے ہی چیچک کی مدافعت کے لئے ٹیکہ ایجاد کیا۔ رازی کی عظیم الشان تصنیف "الحاوی" طب کی جامع ترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ذاتی تجربہ اور علم کی روشنی میں ہر طبی مسئلہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے ہر بیماری کے سلسلے

رات ۱۰ بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا۔ حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی حکومت قائم کرنے کا مجاز نہیں کیا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردوپیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لئے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں بلکہ نومبر ۱۹۴۸ء میں جنگ بندی کا فیصلہ کیا۔ اس فلسطین کے رقبہ کا ۷۰ فیصد سے بھی کچھ زیادہ رقبہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لئے چیکوسلواکیہ سے آئے تھے جو آج خود ظلم کا شکار ہے۔

اقوام متحدہ کا ریکارڈ شاہد ہے کہ اس زمانے میں اس سلسلے میں جو بحثیں ہوئیں عربوں کی مخالفت میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام دونوں پیش پیش تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

نومبر ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی حکومت کا رقبہ ۷۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے بیت المقدس اور باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحد شام کی پہاڑیوں پر قبضہ کر کے اسرائیلی ریاست کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ کیا۔ ۱۴ - ۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے اسرائیل کو اس مکارانہ حملے کی منظوری امریکہ نے دی اور اسے یقین دلایا کہ اگر یہودیوں کو نقصان ہوگا تو امریکہ جنگ میں کود پڑے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے اس جنگ میں یہودیوں کے گروہ کی ہر ممکن امداد کی۔ اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے۔

(۱) صدر جانسن نے ہاٹ لائن پر روس کے وزیر اعظم کوسیگن سے رابطہ قائم کر کے کہا کہ صدر جمال عبدالناصر کو مشورہ دیں کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جنگ کا آغاز کریں۔ اس کے علاوہ خلیج عقبہ کا مسئلہ پر امن طور پر طے کرنے کے لئے ان کی امداد طلب کی۔

(۲) صدر جانسن نے صدر ناصر کو پیغام بھیجا اور خبردار کیا کہ وہ جنگ نہ شروع کریں۔ صدر ناصر نے جواب میں انہیں یقین دلایا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کبھی پہل نہیں کرے گا۔

(۳) امریکہ نے عربوں کو جھوٹی تسلی دی کہ خلیج عقبہ کا مسئلہ سفارتی سطح پر طے کیا جائے گا اور یہ کہ نائب صدر ہمفرے آئیں گے اور اس مقصد کے لئے عراقی وفد کا واشنگٹن میں استقبال کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ صیہونیت کے جنگی منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ نیویارک ٹائمز نے ۱۹ جون ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھا کہ جنگ کے پہلے گھنٹوں کے دوران وہائٹ ہاؤس پر غیر یقینی صورت چھائی ہوئی تھی۔ جنگ سے پہلے امریکہ کے چیف آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو یقین دلایا کہ اسرائیل بڑھ کر ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر تین چار دن کے اندر اندر عربوں کو مار دے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پورے طور پر مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہلمیس سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کی توقعات کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان کر لیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لئے عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

(۴) تل ابیب کے یہودی گروہ کو متحدہ عرب جمہوریہ، شام، اردن اور عراق کے تمام ہوائی اڈوں کے نقشے اور دیگر تفصیلات مہیا کی گئیں۔

(۵) چھٹے بیڑے کے ذریعے متحدہ عرب جمہوریہ، شام، عراق اور اردن کی راڈر مشینوں کو جام کر دیا گیا تا کہ انہیں اسرائیل کے مکارانہ حملے کا پتہ نہ چل سکے اور جارحیت کے شروع ہی میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔

(۶) امریکہ نے تل ابیب کے یہودیوں کو نیپام بم اور دوسرے بم مہیا کئے اور رن وے تباہ کرنے کے لئے راکٹ پاؤڈر بھی دیئے۔

(۷) سلامتی کونسل میں امریکہ کا صیہونی نمائندہ آرتھر گولڈ برگ نے جارحیت کی روک تھام کے لئے سلامتی کونسل کی کوشش کو ناکام بنایا تا کہ یہودی اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں۔

روس عرب دوستی کا بھی حال یہ ہے کہ جس صبح مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی رات کو روس نے عبدالناصر کو یہ یقین دلایا کہ کوئی حملہ نہیں ہونے والا۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہیں کرے گا۔

عربوں کے ساتھ روس کے رویہ پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر پھینک دیتی ہے۔

تیسرا آدمی وہی حاقام صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کو کہا تھا، مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات برس پہلے ہی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سنکر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجئے کہ سلطان کے دل پہ کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کے سامنے ان کی معزولی کا پروانہ لے کر کھڑا ہوگا۔

پہلی جنگ عظیم میں ابتداءً حکومت جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے انہوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوادے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے وہ یہ تھی کہ اس جنگ میں ترکی کی حکومت جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کرے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین DR. WEIZMAN آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ ان کی ساری قوت وقابلیت انگلستان امریکہ اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے اگر ہم کو آپ یہ یقین دلائیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوائیں گے۔

جب صیہونی ۱۶ راپریل ۱۹۱۷ء میں امریکہ کو جنگ و جدل میں جھونکنے میں کامیاب ہوگئے تو انہوں نے اپنا مطالبہ دہرایا کہ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے خفیہ معاہدے کی تحریری تصدیق کردی جائے۔ لندن اور نیویارک میں صیہونی لیڈروں کے طویل مذاکرات کے بعد ایک مسودہ تیار کر کے برطانیہ کی جنگی کابینہ کے سامنے پیش کیا گیا پھر اسے آخری شکل دیکر معاہدہ "بالفور" کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودی قومی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے انگریزی حکومت سے ۱۹۱۷ء میں وہ پروانہ حاصل کرلیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔

یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یہ یقین دہانی کراتے رہے کہ ہم عربوں کو ایک خودمختار ریاست بنا کردیں گے۔ اس غرض سے انہوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کرکے فلسطین اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرایا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔

یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریز قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ آئے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہ دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیشن پاس ہوسکتا تھا چند روز قبل اس تحریک کے حق میں اتنی بھی اکثریت نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائبیریا سے اس کی تائید کرائی۔

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رو سے ۵۵ فیصد رقبہ ۳۳ فیصد یہودی آبادی کو اور ۴۵ فیصد رقبہ ۶۷ فیصد آبادی عرب کو دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسطین کا ۶ فیصد رقبہ یہودیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوتے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔

اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کئے گئے تھے اونلڈ ٹائن بھی انکے متعلق اپنی کتاب STORY OF HISTORY میں کہتا ہے کہ وہ کسی بھی طرح ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کئے۔

دیر یاسین میں ۹ راپریل ۱۹۴۸ء کے قتل عام کا خاص طور پر اس طرح ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں مردوں اور بچوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ ہم نے دیر یاسین میں عربوں کے ساتھ یہ کیا اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ یہ نہ ہو تو یہاں سے نکل بھاگ کھڑے ہو۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا کسی ایسی قوم کا یہ کارنامہ ہوسکتا ہے جس میں رتی برابر بھی شرافت اور انسانیت موجود ہو۔

ان حالات کے دوران ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جب کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے معاملے پر بحث کر رہی تھی یہودی ایجنسی نے

موسم گرما میں، اور موسم گرما میں پیدا ہونے والے میوے موسم سرما میں پیدا کئے گئے ۔ یہیں یہودیوں کی دیوارِ گریہ اور عیسائیوں کا مقدس کلیسا ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے بیت المقدس صرف مسلمانوں کے ہی نزدیک نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے بھی پاک اور باعظمت جگہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

بیت المقدس اور فلسطین میں تقریباً ۱۳۰۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوتے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہوگئے تھے ۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے ۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل کے نام خود بائیبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور بائیبل کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کرکے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (RED INDIAN) کو فنا کرکے امریکہ پر قبضہ کرلیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کو میراث کردیا ہے اس لئے ان کو حق پہنچتا ہے کہ ان باشندوں کو بے دخل کرکے بلکہ مٹا کر اس پر قابض ہوجائیں ۔

بیت المقدس کی شان وعظمت کا پہلا دور دورِ سلیمانؑ تھا آٹھویں صدی عیسوی میں "اسیریا" نے شمالی فلسطین پر قبضہ کرکے اسرائیلیوں کا قلع قمع کردیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو عربی نسل تھے ۔ پھر چھٹی صدی عیسوی میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کرکے تمام یہودیوں کو جلاوطن کردیا ۔ بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ہیکل سلیمانی (TEMPLE OF SOLOMON) کو جسے دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا اس طرح پیوند خاک کردیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی ۔

ایک طویل مدت تک جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر جنوبی فلسطین میں آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر شروع کی لیکن یہ وقفہ بھی تین چار برسوں سے دراز نہ ہوسکا ۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کردیا ۔ پھر ۱۳۵ء میں شاہ ہڈرین کے عہد میں ایک دوسری بغاوت کو کچل کر رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا ۔ ۳۲۶ء میں یہاں ایک مسیحی حکومت قائم ہوئی ابھی عیسائی شہر اور کلیسا تعمیر کر ہی رہے تھے کہ ۶۱۴ء میں شاہ ایران فروسانی اور بارہ برس بعد شاہ ایران ہرقل نے ایرانیوں کو شکست دے کر اپنا قبضہ جمالیا ۔ ۶۳۷ء میں عمرو بن العاص کی قیادت میں بیت المقدس فتح ہوا ۔ ۱۰۹۵ء میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز کیا ۔ ان ہی معرکوں کے دوران ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی زبردست جدوجہد کے بعد بیت المقدس پر دوبارہ قابض ہوا ۔

بیت المقدس پر قبضہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا۔ فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کے لئے صیہونیت کی سیاسی تحریک ۱۸۹۵ء میں ایک یہودی تھیوڈر ہرزل کی کتاب "یہودی ریاست کی اشاعت" سے شروع ہوتی ۔ تھیوڈر کو صیہونیت کا بانی کہا جاتا ہے ۔

صیہونیت کی سیاسی کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ میں ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہودیوں کے لئے ریاست کا قیام فلسطین میں کیا جائے ۔ اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہرتزل نے سلطانِ ترکی سلطان عبدالحمید خاں کو حاخام قرہ صو آفندی کے ذریعے باقاعدہ پیغام پہنچایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دیں ۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام کو صاف ٹھکرادیا اور کہا ۔

جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک سلطنت ترکی موجود ہے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کردیا جائے ۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں ۔

ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرے ۔ اس پر بس نہیں بلکہ سلطان کا جواب سن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو یہ صاف صاف دھمکی دیدی گئی کہ تم اس کا برا نتیجہ دیکھوگے ۔

چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹنے کی کوششیں شروع ہوگئیں یہاں تک کہ سات سال کے اندر سلطان عبدالحمید کی حکومت کو معزول کردیا گیا ۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرت ناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر گئے ان میں دو ترک تھے اور

بیتُ المقدس

کوہ صیہون پر واقع ہے۔ بحرروم کی سطح سے ۳۶۰۰ فٹ اور بحیرہ مردار کی سطح سے ۲۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ انجیل میں اس کا نام "سالم" ہے اس کا ابتدائی نام "یبس" تھا جو بعد میں "یروشلم" پڑ گیا۔ یروشلم دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی جائے امن یا دارالامان کے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دارالامان میں صرف اسلامی دور ہی میں امن رہا۔ یہ شہر چاروں طرف سرسبز شاداب پہاڑیوں، زیتون، انگور اور نارنگیوں کے باغات سے گھرا ہے۔

بیت المقدس کو نبیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں جتنے پیغمبر اس ارض پاک میں پیدا ہوتے، آتے رہے، کسی اور خطے میں نہیں ملتے بیت المقدس کا یہ شہر حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ حضرت لوطؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ کی تبلیغ کی جولانگاہ رہا ہے۔ اور یہی ان سب کی آخری منزل رہی۔ حضور اکرمؐ نے یہیں نبیوں کی امامت فرمائی اور یہیں سے معراج پر تشریف لے گئے۔ جہاں پر خدا کی طرف سے خاتم النبیینؐ کو مسلمانوں کے لئے نماز کی فرضیت کا حکم ملا۔ مسجد اقصیٰ میں ایک انچ بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پر نماز نہیں پڑھی گئی ہو۔ کعبہ شریف کو قبلے کا درجہ ملنے سے پہلے رسول اکرمؐ نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا اور سترہ ماہ تک اسی کی طرف رخ کر کے مسلمانوں کو نماز پڑھاتے رہے اس مقدس شہر نے حضرت سلیمانؑ کے پایۂ تخت کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

خداوند کے حکم کی تعمیل میں اس شہر کے کوہ زیتون پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے لاتے۔ یہیں حضرت یعقوبؑ نور الٰہی سے خواب میں فیضیاب ہوتے اور یہی وہ مقام مقدس ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوتے اور تبلیغ و عبادت کی تکمیل کی یہیں حضرت سلیمانؑ کو بیت المقدس کے صحرا کے ڈھونڈ نکالنے کی اجازت عطا ہوئی۔ اور یہ چٹان بننے والی دنیا کا پہلا کونہ تھا۔ اس چٹان کے متعلق خداوند قدوس نے فرمایا۔

"تو میری قوت ہے اور بے شک میں اپنی دوستی تجھ سے قائم رکھوں گا تاکہ میری مخلوق قیامت کے روز تجھ پر جمع ہو سکے"۔

یہاں حضرت مریمؑ کے لئے موسم سرما میں پیدا ہونے والے پھل میوے

غزل

(محمد یوسف ضیا سونیجا ۔ سال سوئم)

تاب کے یوں اس کو دیکھا چاہیئے
دل کے شیشے میں اتارا چاہیئے

غم کے مارے ہیں ہمیں کیا چاہیئے
ان نگاہوں کا سہارا چاہیئے

کیسے آئے کیا ہے آنے کا سبب
ہم سے بھی کچھ حال پوچھا چاہیئے

چشمِ نم بھی دامن تر بھی نصیب
زندگی سے اور اب کیا چاہیئے

تو تاسف کر نہ میرے حال پر
ہم کو تیرا حال اچھا چاہیئے

کم نگاہی کا نہ دے ساقی ثبوت
یوں خطِ ساغر نہ کھینچا چاہیئے

زندگی کو ساتھ ہم بھی لائے ہیں
تیری جانب سے اشارہ چاہیئے

غم کا اندازہ نہ رُخ سے کیجئے
میرا زخمِ دل بھی دیکھا چاہیئے

شاعری بھی اے ضیا آساں نہیں
جذبۂ دل کا سہارا چاہیئے

غزل

(سیّد اسلم شاہ ۔ سال چہارم)

میرا غم میری آنکھوں میں نہاں ہے
لکھی چہرے پر دل کی داستاں ہے

محبّت کی قسم کھائے ہوئے ہیں
یہی وردِ زباں وردِ زباں ہے

فلک تک تو صدا پہنچی ہی ہوگی
مگر سنتا نہیں یہ آسماں ہے

تمہاری بے وفائی کی شکایت
نہیں آتی ہمیں، رسمِ جہاں ہے

کسی کی انجمن سے اُٹھ کے اے دل
خدا جانے تری منزل کہاں ہے

کدھر کو جا رہی ہے زندگی اب
نہ کوئی رہگزر نہ کارواں ہے

ذرا خاموش رہ اسلم نہ سُن لے
زمانہ تیرے لب پر جو فغاں ہے

محمد ابراہیم بلوچ ۔ سال اوّل

سندھی ادب سے ترجمہ

کل اور آج

کل ایک فرشتے نے ایک خاک کے پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو معتوب ہوا۔ مطعون بنا زائدہ درگاہ ٹھہرا۔

اور آج کروڑوں خاک کے پتلے اپنے خالق کی ہستی ہی سے منکر ہوئے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تجربہ شاہد ہے۔ انکی ترقی کا راز اسی انکار پر مضمر ہے۔

کل جب اللہ کے بندے کو دنیا والوں نے اس جرم پر سولی پر چڑھا دیا تھا کہ وہ اللہ کا نام لیتا تھا۔ وہ سولی پر مسکراتا رہا اور کہتا رہا میرے اللہ ان کو معاف کر دے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

اور آج جب مجھے کوئی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف پہنچتی ہے۔ یا ذرا سی مصیبت آجاتی ہے تو دل میں رنج اور غصہ کی ایک ایسی لہر اٹھتی ہے جو نفرت اور بغاوت کا طوفان بن کر میرے دل اور دماغ کو تاریک کر دیتی ہے اور میں انسان کو تو کیا (نعوذ باللہ) خدا کو بھی معاف نہیں کر سکتا۔

کل جب دونوں جہاں کے بادشاہ سرور کائنات اللہ کے پیارے رسولؐ نے اپنی بیٹی کو حضرت علیؓ کے عقد میں دیا تھا تو ایک چارپائی ایک بستر، ایک چادر، ایک مشکیزہ اور دو چکیاں بطور جہیز عطا فرمائی تھیں۔

اور آج میں سوچ رہا ہوں کہ میں چوری کروں یا ڈاکہ ڈالوں کسی طرح اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رقم پیدا کروں جو خاندان میں عزت رہے ورنہ ناک کٹ جائے گی۔

کل قرن میں رہنے والے اللہ کے ایک بندے نے رسول پاکؐ کی زیارت سے محروم رہنا گوارہ کر لیا۔ اس لئے کہ مدینہ منورہ جاتا تو بوڑھی ماں کی خدمت میں فرق آجاتا۔

اور آج میرا بیٹا اپنی ماں سے لال پیلا ہو کر کہہ رہا تھا اگر اپنی بیوی سے میں نے پھر کبھی تمہاری شکایت سنی تو تمام عمر تمہاری منحوس صورت نہیں دیکھوں گا۔

کل جب سرور کائناتؐ کو بتایا گیا کہ جو بڑھیا اُن پر آتے جاتے کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی بیمار ہے۔ تو میرے آقا خود اس کے گھر تشریف لے گئے۔ تیمارداری کرنے اور یہ پوچھنے کہ کچھ درکار ہو تو بتاؤ، لا دوں۔

اور آج میرے گھر کے سامنے ایک غریب بڑھیا تڑپ رہی تھی۔ خون تھوک رہی تھی اور کوئی نہ تھا جو اس کے منہ میں پانی کے دو قطرے ڈال دیتا۔ وہ تڑپتی رہی اور کراہتی رہی۔ خون تھوکتی رہی۔ اور مسلمان متہ موڑ موڑ کر گزرتے رہے اور میں نے کواڑ بند کر لئے تاکہ دم توڑتی بڑھیا کے پھیلتے ہوئے خون کے جراثیم کہیں میرے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔

جب، دکھوں کے یہ لمحے اَشکوں میں ڈھل جاتے ہیں
تلخ سے کچھ احساس میری سوچوں میں گھل جاتے ہیں
سوچتا ہوں کہ دُنیا میں تنہا ہی میں غم گیں نہیں
لاکھوں انساں ایسے ہیں جن کی سحر رنگیں نہیں
میری دھرتی کا دہقاں ڈھیروں فصلیں اُگاتا ہے
بننے کی فرقی آنے پر وہ فاقوں سے مَرجاتا ہے
میرے ملوں کے یہ مزدور تھانوں کپڑا بناتے ہیں
ایک ہی دھوتی میں لیکن ہر موسم وہ سہے جاتے ہیں
بھوک کے مارے وہ بےکس جن کی بھیگی آنکھوں میں
جینے کی چند خواہشیں جھوٹی آس بندھاتی ہیں
چاندی کی کرنیں آنگن میں ناچ کے دھومیں مچاتی ہیں

حقائق

• فاطمہ قدسیہ (سالِ اوّل) •

آج بھی ہو جو کوئی مردِ مسلماں پیدا
آج بھی ہو جو کوئی حاملِ قرآں پیدا
آج بھی ہو جو کوئی واقفِ عرفاں پیدا
ذرّے ذرّے میں ہو امکانِ بیاباں پیدا
بس وہی قسمتِ خفتہ کو جگا سکتا ہے
بگڑے کاموں کو اشاروں سے بنا سکتا ہے
دشت وصحرا میں بھی وہ پھول کھلا سکتا ہے
ریگ زاروں کو بھی کشمیر بنا سکتا ہے
آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

سوچ

اقبال ہاشم۔ سال دوم

مدھم سُروں میں راتیں جب تاروں کو لوری سناتی ہیں
چاند کی کرنیں آنگن میں ناچ کے دھومیں مچاتی ہیں
رات کے اس سنّاٹے میں ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے
سوچتا ہوں کہ تو بھی کہیں چھپ کے اکیلی روتی ہے
شاید تیرے خیالوں میں یادوں کا میری گزر نہ ہو
تیرے رسیلے ہونٹوں پر ماضی کا کوئی ذکر نہ ہو

جب بھی ایسا سوچا ہے، یادیں تیری تڑپاتی ہیں
چاند کی کرنیں آنگن میں ناچ کے دھومیں مچاتی ہیں

سوچتا ہوں مرے جذبے میں شاید کوئی گہرائی نہ تھی
یا پھر میری باتوں میں شاید کوئی سچائی نہ تھی
یا میری طلب ہی کھوٹی تھی، شاید تو ہرجائی نہ تھی
شاید میرے ہاتھوں میں خوشیوں کی وہ ریکھا ہی نہ تھی

گہرے دکھوں کی تند لہریں دل کو آکے جلاتی ہیں
چاند کی کرنیں آنگن میں ناچ کے دھومیں مچاتی ہیں

یاد ہیں مجھ کو وہ گھڑیاں جب کہ تیرا نیلام ہوا
میری محبت پر تو نے غربت کا الزام دھرا
پھر سپنے میرے ٹوٹ گئے، امیدیں میری چھوٹ گئیں
میری بوجھل پلکوں سے خوابوں کی پریاں روٹھ گئیں

اب بھی اکثر راتوں میں آنکھیں میری بھر آتی ہیں
چاند کی کرنیں آنگن میں ناچ کے دھومیں مچاتی ہیں

بیادِ مالک شہید

عزیزہ انجم (سالِ اوّل)

سازِ ہستی سے انا الحق کی صدا آتی ہے
زندگی جرمِ محبت کی سزا پاتی ہے
جب کبھی سجتی ہے صلیب و در قفس کھلتا ہے
جذبہ شوقِ شہادت کو ہنسی آتی ہے
ہر طرف خون کے قطرے ہیں مثالِ انجم
کہکشاں ان کی شعاعوں سے ضیا پاتی ہے
شوقِ دیوانگی کچھ اور فزوں ہے مالک
تیرے مرنے کی ادا موت کو شرماتی ہے
ہر طرف پھیل گئی تیرے کفن کی خوشبو
تیرے ایماں کی دھنک روشنی پھیلاتی ہے
قافلے والو ذرا اور کرو تیز قدم
اس کے مقتل کی زمیں سے یہ صدا آتی ہے
میرے ضرار تجھے دامنِ خولہ کا سلام
تیری عظمت کے ترانے یہ سدا گاتی ہے

علم عرفان و تقدس کا گلستان حسین
جہل انکار و معاصی کا خزاں زاد مکین

جہل تثلیث ہے الحاد ہے زندیقی ہے
علم توحید ہے اسلام ہے صدیقی ہے

علم ہے ضامن آزادیٔ افکار و خیال
جہل ہے نکہت و افلاس کی مکروہ مثال

جہل نے گلشن و گلزار کو برباد کیا
علم نے کوہ و بیاباں کو بھی آباد کیا

علم انوارِ سحر اور بہارِ نوخیز
جہل تاریکیٔ شب اور خزاں غم ریز

علم فردوس خیالات کی تابندہ سحر
علم تہذیب و تمدن کا انمول گہر

علم پُرہول اندھیرے میں پہاڑی کا چراغ
علم اس پیکر خاکی میں ہے یزداں کا دماغ

جہل چڑھتے ہوتے سورج کا پجاری ہے ہنوز
جہل پس خوردہ نوالوں کا بھکاری ہے ہنوز

جہل نے مقتل و زنداں کو سنوارا پھر سے
جہل نے دار و رسن کو ہے سجایا پھر سے

جہل نے سانگ رچایا ہے جوانمردی کا
حکم ہے آج قفس میں بھی زباں بندی کا

تم کہ امیدِ جہانِ گزراں ہو یارو
تم کہ انسانوں کی عظمت کا نشاں ہو یارو

تم کہ آثار ہو اک صبح یقیں کے یارو
تم کہ آغاز ہو اک دور حسیں کے یارو

تم نے تو جہل کو ہر دور میں للکارا ہے
تم نے یخ بستہ تمناؤں کو گرمایا ہے

تم کہ بگڑی ہوئی تقدیر بدل سکتے ہو
تم جہالت کے سنپولوں کو مسل سکتے ہو

تم کہ زنداں میں بھی تعلیم دیا کرتے ہو
تم کہ سولی پہ بھی تلقین کیا کرتے ہو

تم جہالت کو بھی عرفان عطا کرتے ہو
تم اندھیرے کو ضیا بار کیا کرتے ہو

تم کہ ہر دور میں تلخابۂ غم پیتے ہو
تم کہ پیمانۂ امروز میں سم پیتے ہو

تم سرِ دار بھی اقرار وفا کرتے ہو
تم صلیبوں کو بھی اعزاز دیا کرتے ہو

تم ترقیٔ زمانہ کے امیں ہو یارو!
تم ہی انگشت سلیماں کے نگیں ہو یارو

تم براہیمی دعاؤں کا اثر ہو یارو!
محو حیرت ہیں نگاہیں کہ کدھر ہو یارو

آؤ اک صبح درخشاں کی ضیا بن جائیں
سوزش علم سے ہر قلب و نظر گرمائیں

علم کے ساز پہ عالم کو غزل خواں کر دیں
مُور بے مایہ کو ہمدوش سلیماںؑ کر دیں"

• عزیز حمیدی •

علم

لالہ زارِ ادب و علم کے نورس غنچو
دردمندانِ گلستاں کی طرف بھی دیکھو
مشعلِ انوار یہ پیغامِ وفا پھیلاؤ
اے شبستانِ حوادث کی نئی قندیلو
یہ حقیقت نہ نگاہوں سے کبھی ہو اوجھل
ایک مشعل سے جلا کرتی ہیں لاکھوں مشعل
اک محبت کی نظر بانیٔ صد قصۂ حیات
اک تبسم کی جھلک محمل صد حسن و صفات
ایک شانے سے سلجھ جاتے ہیں لاکھوں گیسو
پھیل جاتی ہے بس اک پھول سے ہر سو خوشبو
ایک جلوے نے سنواری ہیں ہزاروں محفل
ایک رہبر نے ہزاروں کو دکھائی منزل

رہبری علم نہ رکھے تو جنوں ہو جائے
اور جنوں وادیٔ انساں پہ لہو برسائے

کیونکہ ہے علم ہی معمارِ شبستانِ وجود
علم ہی حسن نگارانِ جہانِ موجود
علم استادِ ازل اور امامِ ملکوت
جہل شاگردِ شیاطین و غلامِ ہاروت
جہل تنہائیٔ آدم و فراقِ حوا !
علم گلزارِ عدن اور ہے آغوشِ وفا
جہل کا فطرتِ قابیل سے یارانہ ہے
علم ہابیل وفا پیشہ کا افسانہ ہے
جہل ہے بردہ فروشوں کے ستم کی جھنکار
علم ہے یوسفؑ معصوم کے عظمت کی پکار
علم سقراط و فلاطون و ارسطوئے جہاں
جہل اسکندر و چنگیز و ہلاکوئے زماں
علم ہے نطقِ محمدؐ و پیامِ یزداں
جہل تصویرِ ابولہب بہ قلبِ شیطاں
علم ہے مریمؑ و زہرہؓ کے تقدس کا جمال
علمِ صدیقؓ کے ایماں کی درخشندہ مثال
علم عثمانؓ کا کردار علیؓ کا ایثار
علم فاروقؓ کے ہاتھوں میں خدا کی تلوار
علم ایمان و عقائد کا امامِ اعظمؒ
جہل ہے رہبرِ تشکیک و توہم کا علم
علم توریت و اناجیل و زبور و قرآں
جہل اوراقِ فریب اور کتابِ عصیاں
جہل ہے تورۂ چنگیز و قوانینِ ستم
علم آئینِ محبت و دساتیرِ کرم
جہل ایماں فروشوں کے ضمیروں کی دکاں
جہل ہے اکبرِ ناداں کے عقائد کی زباں
جہل نے دانشِ صادق کی بھی بینائی لی
علم نے کور نگاہوں کو بھی بینائی دی

غزل

حسن اکبر کمالؔ

ہم لاکھ تیرے شوق میں بے خانماں ہوئے
پورے ابھی وفا کے تقاضے کہاں ہوئے

ہم خاک ہوگئے مگر اس عشق کے طفیل
یہ اہلِ حسن زینتِ صد داستاں ہوئے

آنکھوں کے سب چراغ ہوئے گل تمہارے بعد
چہرے تمام زرد برنگِ خزاں ہوئے

شاید وفا سے کوئی بھی نسبت نہ تھی انہیں
جن کے لیے ہم اہلِ ہنر بے نشاں ہوئے

اپنے ہی غم کی تھی مری آواز میں تڑپ
تھے جو بھی زخم خوردہ، مرے ہمزباں ہوئے

حسنِ خیال حسنِ بیاں تک نہ آسکا!!
کب میرے خواب حرف و ہنر میں بیاں ہوئے

اپنے دکھوں پہ رونے جو بیٹھے تو یہ کھلا!
آنسو کمالؔ نذرِ غمِ دوستاں ہوئے!

لے کر میرے من میں آن اترے پھولوں کی سگندھ میں میں نے تمہارے خواب دیکھے۔ بے پناہ۔ بے کراں۔ تنہائیوں میں تمہارا ہاتھ تھام تھام لیا۔ اتنا بے قرار بے پناہ تکلیف دینے والا پیار۔ میں تمہیں کسی کا ہوتے نہیں دیکھ سکی۔ مجھے تو اس دھوپ سے بھی جلن محسوس ہوتی جو تم پر سے ہو کر گذرتی ہے۔ میں ہوا کے اس جھونکے سے بھی رقابت محسوس کرتی ہوں جو تمہارے دامن کو چھو کر گذرتا ہے۔ میں کسی بھی نگاہ کو برداشت نہیں کر سکتی جو تمہیں پیار سے ایک لمحہ بھی دیکھ لے۔ تم میرے ہو، صرف میرے۔

اور یہ سب چھن گیا تو میں پگلی!

کس چاند کو پکاروں گی؟

اور تب میں اپنے مالک سے دعا کرتی ہوں کہ اب سارے کانٹے میرے آنچل میں ڈال دے اور پھولوں سے تمہارا دامن بھر دے تمہارے پاؤں میں چبھنے والا کانٹا میرے دل میں اتر جائے اور تمہاری راہیں سدا پھولوں سے ڈھکی رہیں۔ میں نے روزِ ازل سے سارے اندھیرے اپنے لئے مانگے اور تمہارے لئے روشنیاں اور بھرپور اجالے۔

مگر دیکھو۔ اس انتہا۔ اس منزل پر پہنچ کر میں رُک گئی ہوں۔ اور حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتی ہوں۔ میں کہاں آن پہنچی۔ یہ چاند کی نگری ہے۔ یہ ستاروں کا دیس ہے۔ یہاں پھولوں کی سندرتا ہے۔ انوکھے نشیلے خواب ہیں۔ مگر یہ کیا غم ہے، کیسی کسک ہے۔ آج رہ رہ کر دل کی دھکن کیوں بڑھ رہی ہے۔ ذرا میرے دل میں جھانک کر دیکھو تمہیں کیا معلوم آج کس قیامت کی رم جھم مچی ہے۔ آج میرے دل کی دھکن کا وہ عالم ہے کہ یہ آنکھیں ساون تو کیا سمندر کی طرح بہیں تو بھی دل چین نہ پا سکے گا۔

میں ان دنوں تمہارے لئے بہت بے چین رہی ہوں۔ میرا دل چاہتا رہا کہ تم آؤ تو ہم ان دکھوں کو بانٹ لیں۔ میں ان کرب آمیز لمحوں کی تلخی کم کر سکوں تم سے سب کچھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لوں، مگر ایک عجیب سی تلخی، دُکھ زدہ احساس میرے وجود پر چھا گیا۔ ایسے لمحوں میں ہم دوستوں کے ہوتے ہوئے سدا تنہا رہتے ہیں۔ سدا تنہا دُکھ اٹھاتے ہیں۔

ان آنسوؤں میں ان اندھیروں میں تمہارا چاند سا چہرہ نہ چمکا تو میں نڈھال ہو جاؤں گا۔ اب میں یہاں کھڑی ہوں۔ اتنی چھوٹی سی بات میرے جی کی خلش بن گئی تو میں نے سوچا۔ تم ہر بار میری خواہش پر میرے قریب نہیں آسکتے۔ تمہاری بھی مصروفیات ہیں، ذمہ داریاں ہیں۔ میں کیوں اتنی نادان بنی جاتی ہوں۔ میں کیوں تمہاری ذرا سی لاپرواہی نہیں سہہ سکتی۔ میں نے جینے کے غلط طریقے کیوں اپنا لئے۔ میں عقل و خرد کو کہاں بھول بیٹھی۔ میں نے خوشیوں کیا تھا اپنی روح کے لئے یہ کانٹے کہاں سے سمیٹ لئے۔ مجھے کوئی سمجھائے، زندگی یوں نہیں گزاری جاتی۔ دوستوں سے لپٹ کر بھی سوچا جاتا ہے۔ یہ چاند ایسے چہرے یہ لازوال پیار۔ خلوص قریب رہے تو سدا جگمگاتا ہے۔ فاصلے ان روشنیوں کو چھین لیتے ہیں اور یہ سب چھن گیا تو میں پگلی۔

کس چاند کو پکاروں گی ؟

کس سورج کو طلوع ہونے کا واسطہ دوں گی ؟

کن روشنیوں کا تعاقب کروں گی ؟

سدا میری پلکوں پر خوشیوں کے دیئے جلتے رہیں۔ یہ کہاں ممکن ہے مگر دیکھو یہ کیسی دکھن ہے جو سہی نہیں جا رہی اور میں سوچ رہی ہوں۔ میں سدا دکھے دل کو تھامے ایک پیاسی روح کو لئے کراہتی رہوں گی۔

میں تنہا ہوں۔

میں تنہا ہوں۔

بقیہ: اور وہ ہار گیا

کھٹکٹایا۔ اختر بھائی نے دروازہ کھولا اور وہ باجی باجی کہتا ہوا باجی کی طرف بھاگا۔ باجی اُسے دیکھ کر پریشان ہو کر پلنگ سے نیچے اُتر آئیں۔ اور وہ باجی سے لپٹ کر سسک پڑا۔ "باجی گھر چلیئے نا، میں اب آپ کو تنگ نہیں کروں گا — "باجی" — اور باجی وہ بھی اُسے سینے سے لگا کر بے اختیار رو پڑیں۔ اختر بھائی دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ !

نورجہاں رحمت اللہ - سال دوم

تم نے کبھی میری آنکھیں غور سے دیکھی ہیں؟

ان آنکھوں میں کوئی خاص بات تمہیں نظر نہیں آئی؟ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ آنکھیں نہیں ساون کے گھنگھور بادل ہیں۔ امنڈتی بدلیاں جواب برسیں کر تب برسیں۔ کبھی جی نہیں چاہا کہ ان آنکھوں کو ہنسنا سکھا دو۔

میں تم سے کہہ رہی ہوں عاضی۔

ہاں تم سے۔

تم جو میری زندگی کے آسمان پر روشن چاند کی طرح جگمگاتے ہو۔ جس کے وجود سے میری زندگی قوس وقزح کی طرح رنگین ہو گئی ہے۔ لیکن میں اس حقیقت کو کیسے بھولوں کہ روشن چاند بھی کبھی نہ کبھی اپنی جگمگاہٹ کھو کر نظروں سے دور ہو جاتا ہے۔ بہاروں سے بھری قوس وقزح اپنی جھلک دکھا کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ میری آس کتنی فضول ہے اور میں کتنی بے بس و ناداں ہوں کہ خوشیوں کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی۔

میں جانے کن بہاروں کی باتیں کرتی ہوں۔

تمہارے میرے جیسی نگاہوں کی جوت۔ ان میں امنڈتا پیار۔ میرے جی پر شبنم کی طرح گرا جاتا ہے۔ میری راہوں میں جگمگاتے جاتا ہے اور تم جانو۔

پیار تو وہ انمول بیج ہوتا ہے جو خشک صحراؤں کو سرسبز وشاداب کر دیتا ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں میں۔ جانے پہچانے چہروں میں میری روح صدا خود کو تنہا تنہا محسوس کرتی ہے۔ تم نے مجھے بڑے کرب آمیز لمحوں میں سہارا دیا ہے۔ تمہاری قربت کے احساس نے مجھے بے پناہ خوشیاں بخشیں۔ تم نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا انہوں نے مجھے زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔ میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کے ..... تم نے جب چاند کی جگمگاہٹ اور پھولوں کی سندرتا میری روح پر بکھیری تو میرا جی دھڑکنا بھول گیا۔ جی چاہا۔ شدت سے چاہا۔ اسی ایک لمحہ میں مر جاؤں۔ ممکن ہے اس کے بعد اتنی بھرپور خوشی جیون میں کبھی نہ ملے لیکن میں مر نہ سکی، اس لئے کہ مجھے تمہارے دامن میں بھرے ہوتے خوشبو کے اور بھی پھول سمیٹنے تھے۔ اور غم یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد میں جی بھی نہ سکی۔ یوں جینے کو جی رہی ہوں۔ لیکن محبت میں سب کچھ ہار دینے کے بعد یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے۔

میں یہ خوشیاں سنبھال پاؤں گی؟

اتنی بے پایاں خوشی کیسے برداشت کروں۔ جی چاہتا رہا۔ چاند کو۔ ستاروں کو، پھولوں کو، ساری دنیا کو رازداں کر لوں۔ مجھے خوشی مل گئی۔ یہ احساس میرے سارے وجود کو ہلا گیا۔ میں اپنے من کی معصوم سی آرزو کو ٹھکرا نہ سکی میں تمہیں شب کے اندھیروں میں پکارتی رہی۔ چاندنی میں تم بے پناہ جگمگاہٹ

نے بھی نہیں۔ جس کا دل چاہا کرتا تھا کہ ہر وقت منہ ہی چلاتا رہے۔ پر نہ جانے آج کیا بات تھی کہ بھوک قطعاً غائب تھی۔ شاید اختر بھائی باجی کے ساتھ بھوک کو بھی لے گئے تھے۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ کسی پل چین نہ تھا۔ وہ شام سے کئی مرتبہ بھنورے کی مانند اندر باہر کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ اس کا معصوم ذہن سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ انتہا خوشی ہے یا کوئی غم جو اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا۔ ایک بار تو وہ باورچی خانے بھی گیا تھا وہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔ خالی خالی۔ بجھا بجھا۔ کسی قبرستان کی مانند۔ وہ کچھ دیر بجھے چولھے کو دیکھتا رہا اور پھر اسے محسوس ہوا جیسے باجی چولھے کے پاس کھڑی ہیں اور کچھ پکا رہی ہیں۔ باجی ..... باجی ..... باجی ..... یہ باجی کا خیال کیوں گھڑی گھڑی آنے لگا ہے۔ اس نے اپنے سر پر ایک چپت ماری اور تیزی سے باورچی خانے سے نکل آیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا تھا آج پتہ نہیں اتنے ڈھیر سارے خیالات نے کیوں یلغار کر دی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر باجی کی چارپائی کی جگہ پر دیکھا آج چارپائی وہاں نہ تھی وہ سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھی۔ آج نہ جانے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ جب باجی ہوتی تھیں تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سلا دیتی تھیں۔ اور آج وہ چاہتا تھا کہ نیند آ جائے مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ اس نے باجی کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ وہ کتنی اداس نظر آ رہی تھی۔ آج ہر کوئی اداس تھا۔ لیکن وہ خوش ہونا چاہتا تھا۔ وہ سارے جہاں کی مسرتوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا لیکن اداسی کسی موسم کی طرح پورے گھر پر چھا گئی تھی۔ دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا، ایک کسک سی تھی، ایک ہوک سی اٹھتی تھی جو دل و دماغ کو نچوڑے جا رہی تھی۔ اس کو اس میں بھی ایک عجیب طرح کی لذت انگیز بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھے رکھے مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ، دائیں کروٹ ہو کر آنکھیں موند لیں۔ بالآخر نیند کی دیوی نے اسے آ گھیرا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو ابھی ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسی وقت دور کسی گھڑیال نے پانچ گھنٹے بجائے۔ وہ حیران تھا کہ آج اتنی جلدی کیسے آنکھ کھل گئی بے اختیار اس کی نظریں باجی کی چارپائی کی طرف اٹھ گئیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ چارپائی بھی تمام رات باجی کے انتظار میں جاگتی رہی ہے۔ وہ باجی کے خیال کو جتنا جھٹکنا چاہتا تھا وہ اتنا ہی سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ آج تو اسے آرام سے اٹھنا تھا۔ لیکن آج نیند ہی خود بخود اڑ گئی۔ آج تو باجی اسکول جانے کا حکم نہیں چلائیں گی۔ "آج تو اپنی مرضی ہے۔" وہ یونہی سوچتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ اور کبھی کبھی خاموش چارپائی کو دیکھ لیتا۔ دور چھ بجنے کی آواز آئی اس کے اٹھنے کا وقت ہو گیا..... اسے ایسا محسوس ہوا جیسے باجی کی آواز آ رہی ہو۔ "اٹھو۔ جلدی اٹھو۔" اس نے دوبارہ جماہی لے کر کروٹ بدلی۔ لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ اسے دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ اس نے دوسری طرف کروٹ لی۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ اس کا دماغ بھکنے لگا۔ "باجی ..... باجی.. باجی ..... تم کہاں ہو باجی ..... مجھے اٹھاؤ نا۔ وہ بالآخر سسک پڑا، "آج مجھے کون تیار کرے گا باجی۔" ایک لاوہ سا تھا جو پھٹ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بستر پر پڑا سسکتا رہا۔ اور پھر وہ کسی خیال سے، بستر سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی جلدی الٹا سیدھا تیار ہوا، کتابیں پکڑیں اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ امی نے باورچی خانے سے ہی آواز لگائی۔

"آج اتنی سویرے سویرے۔ ناشتہ نہیں کرنا۔"

"آج جلدی بلایا گیا ہے۔ ناشتہ اسکول ہی میں ملے گا۔"

بہانے تو اس کی نوک زبان پر ہر وقت رہتے تھے۔

باہر نکل کر وہ اڑتے اڑتے خالہ کے گھر پہنچا۔ خالہ نے دروازہ کھولا۔ اسے اتنی سویرے دیکھ کر خالہ پریشان سی ہو گئیں "خیریت تو ہے۔؟" اس نے سر ہلا کر خالہ کی طرف کتابیں بڑھائیں۔ خالہ نے بھی غیر ارادی طور پر فوراً کتابیں پکڑ لیں۔ اور وہ تیزی سے اختر بھائی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ خالہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے سانسیں درست کئے بغیر دروازہ

(باقی صفحہ ۱۲۴ پر)

فلم دیکھنے پہنچ گیا۔ مگر اس دل کا کیا کیا جائے یہ قابو میں تھوڑا ہی رہتا ہے۔ تمام راستے یہ مسلسل دھک دھک کرتا رہا۔ عجیب سی بے چینی اور اضطراب تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جتنی جلد ہو سینما ہال میں گھس جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُڑ کر اندر داخل ہو جائے، وہ منہ چھپائے راشد کے ساتھ پوسٹر دیکھتا رہا۔ مگر ہر لحہ یہی خوف دامن گیر رہا کہ مبادا کوئی جاننے والا دیکھ لے، ورنہ شامت ہی آجائے گی۔ اور پھر اگر اس لمحے اُس سے ذرا سی بھی چوک ہو جاتی تو وہ یقیناً دیکھ لیا جاتا۔ سامنے باجی اور اختر بھائی چلے آرہے تھے، اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور فلم دیکھنے کا خیال ہوا ہو گیا۔ راشد نے بہتیرا روکنا چاہا لیکن اس پہ تو اتنا خوف سوار ہوا کہ وہاں سے چلتے ہی بنی۔ پوچھے بغیر آنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ ابّو سے نہیں ڈرتا تھا، اسے معلوم تھا کہ جب کبھی ابّو جلال میں آگئے تو اس کی خیر نہیں۔ اور اگر باجی نے ابّو کو بتا دیا تو ...... یہ سوچتے ہوئے وہ اس طرح سر پٹ بھاگا کہ راشد اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ خطرے کی حدود سے نکل کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں راشد نے بھی اُسے جا لیا اور چھوٹتے ہی ایک موٹی سی گالی دے کر اس طرح اچانک بھاگ جانے کی وجہ پوچھی، لیکن وہ اُسے کیسے بتاتا کہ سامنے ملک الملوث کھڑی تھی یہ اُس کی عزّت کا سوال تھا۔ راشد نے اُسے آئندہ اپنے ساتھ نہ لانے کی قسم کھا کر ایک دھپ رسید کی تھی اور الگ ہو گیا تھا اس کا سارا موڈ چوپٹ ہو چکا تھا۔

اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند لپکا۔ امی سے باجی کی پٹائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے امی کے حیرت ظاہر کرنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔ "آج فنکشن کینسل ہو گیا۔" سانس دُرست کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔ "معلوم ہے امّی باجی کہاں گئی ہوئی ہیں۔" اُس نے فاتحانہ انداز میں اس طرح کہا جیسے بہت بڑا انکشاف کرنے جا رہا ہو۔

"ہاں۔ ہاں کہاں گئی ہوئی ہیں۔؟"

"باجی اختر بھائی کے ساتھ سینما میں پہنچی ہوئی ہیں۔" اس نے اپنی دانست میں بم چھوڑا۔

"ہائے ہائے ۔۔ وہ مجھ سے پوچھ کر ہی تو گئے ہیں۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" امّی نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ پوچھتیں کہ اُس نے اُن دونوں کو کیسے دیکھ لیا تھا۔ امّی تو یہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھیں، مگر اس کی سلی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ جو دل میں آیا باجی کے نام کر دیا۔ "یہ کمبخت باجی کبھی کہیں پوچھے بغیر جاتی ہی نہیں۔ خود ہر جگہ چلے جاتی ہیں اور مجھے جانے ہی نہیں دیتیں۔" اُسے بڑی زہر لگتی تھی یہ باجی کی بچی، دال دال کچی! ...... اس نے باجی کی کتاب اور پین اٹھا کر نیچے پٹخا دیا۔ ایسے موقعوں پر اس کے ہاتھ، باجی کی جلد شادی کی دعا مانگنے کے لئے اُٹھ جاتے۔ آخر کب تک اس کی دُعا قبول نہ ہوتی۔ شادی کا دن بھی آپہنچا۔ اس کو تو اس بات کی خوشی تھی کہ چلو آج باجی سے جان چھٹ جائے گی۔ اسی لئے وہ دوڑ دوڑ کر کام کر رہا تھا۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو اس نے باجی کو پہلی مرتبہ روتے ہوئے دیکھا۔ باجی ابو کے کندھے سے لگ کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ابّو باجی کی پیٹھ کانپتے ہاتھوں سے تھپتھپاتے رہے۔ اس کی تیز نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ ابّو کی عینک کے پیچھے بے شمار قطرے جھلملا رہے ہیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اختر بھائی سے کہا تھا۔ "بیٹا، آج ہم تمہاری امانت تمہیں لوٹا رہے ہیں۔ تم خود ہی دیکھ لو ہم نے تمہاری امانت میں کوئی خیانت نہیں کی ہے۔" اور پھر جذبات ابو کے قابو میں نہ رہے اور ابو تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ امّی سے گلے مل کر باجی اس کی طرف آئیں اور اس کو بھی گلے لگا کر بُری طرح رو پڑیں۔ بلو کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خوشی کے موقع پر یہ رونا دھونا کیسا۔ باجی نے اسے کتنی ہی بار چوما اور پیار کیا تھا۔ "ہوں اب پیار کرنے سے کیا فائدہ۔" وہ بڑبڑایا

بالآخر باجی، اختر بھائی کے ساتھ سدھار گئیں اور چہل پہل بھی ساتھ ہی لے گئیں۔

اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ابو اپنے کمرے میں ہی بند ہو گئے تھے۔ رات کا کھانا کسی نے بھی تو نہیں کھایا تھا حتیٰ کہ اس

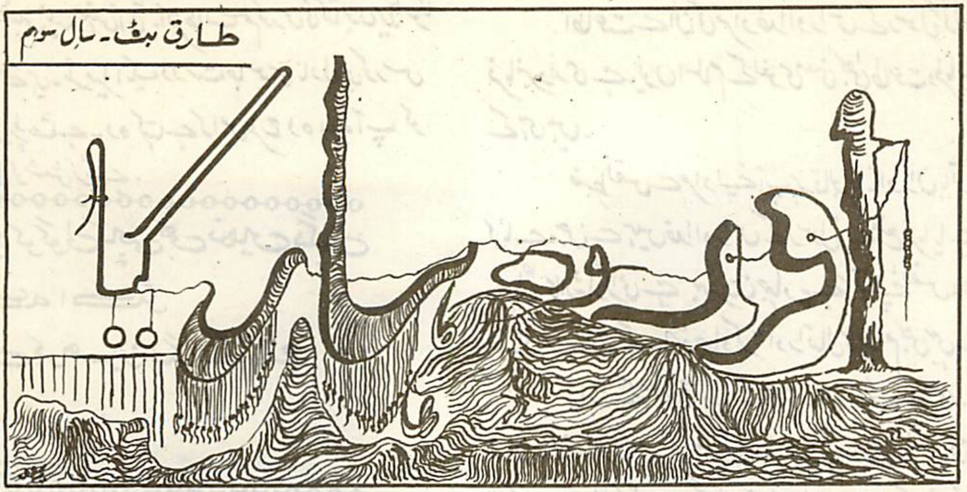

طارق بٹ۔ سالِ سوم

باہر سیٹی کی تیز اور مخصوص آواز گونجی اور اس کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ اُس نے کتاب سے چوری چوری نظریں ہٹا کر باجی کی طرف دیکھا، باجی بغور مطالعے میں مصروف تھیں اُس کی نظریں پھسلتی پھسلتی دائیں طرف چلی گئیں، ابّو بڑے انہماک سے اخبار کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے، باہر دوسری سیٹی گونجی اور اُس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، اُسے کتاب کے الفاظ کیڑے مکوڑوں کی مانند نظر آنے لگے، اُس نے صفحوں کو جلدی جلدی پلٹا۔ صفحوں کی سرسراہٹ سے باجی نے اُسے نظر اٹھا کر دیکھا ماتھے پر سلوٹیں اُبھریں پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کچھ کہے بغیر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ بُری طرح بے چین تھا، بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں چلے۔" باجی تو جیسے اس کے انتظار میں تھیں۔ ابّو نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا تھا، مگر وہ دوبارہ اپنی دبیز عینک کے نیچے دَب گئے تھے۔ "وہ..... وہ..... پانی پینے جا رہا ہوں۔" وہ ہکلایا اور وہ پانی پینے کے بہانے غسل خانے میں پہنچ گیا۔ ابھی غسل خانے میں پہنچا ہی تھا کہ تیسری سیٹی کی گونج بڑے زور سے سُنائی دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ یہ آخری سیٹی تھی۔ اُس نے غسل خانے کے روشندان سے جو باہر کی طرف کھلتا تھا، نلکے کی ٹونٹی پر چڑھ کر دیکھا، راشد واپس جا رہا تھا۔ وہ بجھے بجھے دل سے نیچے اُترا اسے باجی پر بے حد غصّہ آ رہا تھا۔ "الّو کی پٹھی" وہ بڑبڑایا۔ اس نے یہ الفاظ باجی کو ڈانٹتے ہوئے ابّو کے منہ سے سُنے تھے۔ راشد سے مل کر اس نے آج مچھلی کے شکار کا پروگرام بنایا تھا اس کا خیال تھا کہ باجی حسبِ معمول کالج سے دیر سے آئیں گی اور امّی کو چکر دینا تو چٹکیوں کا کام تھا۔ لیکن باجی تو باجی ابّو بھی آج جلدی آگئے تھے۔ اور اس کا سارا پروگرام چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ لیں، دو تین مکّے دیوار پر مارے۔ لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ باجی سے اُس کی روح فنا ہوتی تھی۔ لیکن ہر دفعہ تو ایک سی حالت نہیں رہتی، روح بار بار تو نہیں جھنجھلاتی۔ اللہ کبھی کبھی ایسا مہربان ہوتا ہے کہ روح کے زخم پر پھایا سا محسوس ہوتا ہے۔ اس دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو باجی گھر پر نہیں تھیں اس کا آج فلم کا پروگرام تھا۔ آج خوشی کے مارے تو اس سے نوالہ بھی حلق میں نہیں اُتر رہا تھا اور اس نے تھوڑی سی روٹی کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ "بس"، امّی نے حیرانگی ظاہر کی تھی۔ "ہاں پیٹ بھر گیا ہے اور ویسے بھی آج اسکول میں فنکشن ہے وہاں بھی تو کچھ کھانا ہے۔" بہانے گھڑنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور — پھر وہ راشد کے ساتھ

جاسوسی ناول نہ پڑھنے کا عہد کرتا ہے اور ہر سابقہ عہد کی طرح اس عہد کو توڑ دیتا ہے۔ بعض حضرات جب تک ایک عدد جاسوسی ناول ختم نہ کریں رات کو انھیں نیند نہیں آتی۔ اکثر طالب علم کورس کی کتابوں میں جاسوسی ناول چھپا کر پڑھتے ہیں۔ مگر میرا ایک دوست جاسوسی ناول میں کورس کی کتاب چھپا کر پڑھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

ہیرو کو گولی کبھی بھی نہیں لگتی

بلکہ اکثر

گولی کو ہیرو لگ جاتا ہے

اور

گولی کا.........

ہمارے جاسوسی ادیبوں میں صفی خاندان نے بڑا نام پیدا کیا ہے بہت سارے صفی حضرات جاسوسی ناول لکھ کر کاغذ اور پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ بازار میں ابن صفی۔ این صفی، نجمہ صفی۔ صدمہ صفی ڈھمکا صفی اور یونہی صفی قسم کے مصنفوں کے ناول سستے داموں آسانی سے مل جاتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود مجھے جاسوسی ناول پسند ہیں فرصت کے اوقات میں میں جاسوسی ناول ضرور پڑھتا ہوں اور کیوں نہ پڑھوں کیا جاسوسی ادب لکھنے والے انسان نہیں ہوتے کیا ان کا ہم پر کوئی حق نہیں۔ جو لوگ جاسوسی ناول نہیں پڑھتے وہ ان غریب ادیبوں کا استحصال کرتے ہیں ان پر ظلم کرتے ہیں ان پر پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں ایسے تمام لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو الگ کمرے میں بند کر دیا جائے اور جب تک روزانہ پانچ کے حساب سے جاسوسی ناول ختم نہ کریں انھیں کھانا نہ دیا جائے تب ان کو معلوم ہوگا کہ ظلم کی سیاہ رات چاہے کتنی لمبی کیوں نہ ہو آخر ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہتی ہے۔ دراصل یہ رات اس لئے بھی ختم نہیں ہوتی کہ سورج ذرا دیر سے نکلنے کا عادی ہو گیا ہے۔ ہاں تو جاسوسی ادب، ظلم کی رات، ظالم مجرم اور ظلم کا سایہ پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا۔

بقیہ: اقبال کا فلسفۂ خودی

اطاعت سے ان کی مراد خدا اور اس کے رسول صلعم کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ یوں اسلام کے لغوی معنی بھی اطاعت و فرمانبرداری کے ہی ہیں۔

ضبطِ نفس سے مراد اپنے آپ پر قابو پانا اور ان باتوں کا ترک کرنا ہے، جن سے ہمیں خدا اور اس کے رسول صلعم نے منع فرمایا ہے۔ رسول صلعم کا ارشاد گرامی ہے "بہترین جہاد یہ ہے کہ تو اپنے نفس، اور نفسانی خواہشات کے ساتھ جہاد کر" اور اقبال کا پیغام بھی یہی ہے۔

نیابت کے معنی قربت کے بھی ہیں اور نائب کے بھی۔ جس انسان نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی اور اپنے نفس کو قابو میں کیا، وہ خدا کے قریب ہو گیا اور خدا نے اس مردِ مومن کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ گویا اپنے آپ کو، خود کو پہچان کر جس نے خدا کو پہچان لیا، اس کا وجود قیدِ زماں و مکاں سے بالاتر ہو گیا، اور اسے حیاتِ جاوداں مل گئی۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
ترے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ہمارا جاسوسی ادب

ھمایوں ظفر (سال دوئم)

کسقدر خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب میں جاسوسی کہانیاں لکھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ لوگ جو جاسوسی ناول لکھتے ہیں اسے پڑھنے کے بعد ہمیں یہ جاسوسی کرنی پڑتی ہے کہ اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ جس کی بناء پر اسے جاسوسی ناول کی تہمت سے نوازا گیا ہے۔

جاسوسی ناولوں میں عموماً ایک جاسوس ہوا کرتا ہے جو مجرموں کے لئے لوہے کا چنا ہوتا ہے اکثر مجرم اسے چناجور گرم کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ہیرو خوبصورت بھی ہوتا ہے ذہین بھی، ساتھ ہی ساتھ نیک شریف، بااخلاق بھی ہوتا ہے۔ نہ جانے یہ ایک ساتھ اتنی ساری خصوصیات ہیرو میں کیسے جمع ہو جاتی ہیں۔

ہیرو کو گولی کبھی بھی نہیں لگتی بلکہ اکثر گولی کو ہیرو لگ جاتا ہے اور گولی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جس کے چالیسویں کا انتظام مصنف انجمن بہبود مسلمانان کے چندے سے کرتا ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہیرو کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر ہیرو کے جسم پر خراش تک نہیں آتی۔ مصنف یہ نہیں بتاتا کہ ہیرو کے جسم پر کس پیر کا دیا ہوا تعویز بندھا ہوا ہے (غالباً کاروباری راز ہوتا ہے)

ہمارے جاسوسی ادب کا مجرم بالکل بے وقوف، نالائق اور بدصورت ہوتا ہے اس کے علاوہ وہ طاقتور بھی ہوتا ہے مگر پھر بھی لڑنے سے گریز کرتا ہے اور ذہنی لڑائی کو ترجیح دیتا ہے جس کا نتیجہ ہتھکڑیوں کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ بعض اوقات مجرم اپنے عزائم میں ناکام ہو کر خودکشی بھی کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ زہر کا کیپسول کھاتا ہے جو اس کے حلق میں بنی ہوئی ایک جیب میں پڑا ہوتا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جیب کس درزی سے بنواتا ہے کسی صاحب کو علم ہو تو مطلع کرکے عنداللہ ماجور کریں۔ ویسے عنداللہ ماجور کا مطلب خود مجھے بھی معلوم نہیں۔

جاسوس کے ساتھ ساتھ ایک ایڈیشنل جاسوس بھی ہوتا ہے۔ جس کا کام عشق کرنا یا لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے یہ صاحب بھی خوبصورت اور ذہین ہوتے ہیں۔ جیسے علی بابا کی کہانی میں خوش بختی قاسم بابا سے دور دور بھاگتی ہے کئی بار تو میں سوچتا ہوں کہ ان جاسوسی ناولوں کے مقابلے تو علی بابا کی کہانی ایک بار اور پڑھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ علی بابا کی کہانی میں چالیس چور ہوتے ہیں جبکہ جاسوسی ناولوں میں صرف ایک چور کا ہونا ضروری ہے اور وہ بھی ایسا ویسا۔

جاسوسی ناولوں میں عموماً اس قسم کے سین ہوا کرتے ہیں" رات تاریک تھی ایک کتا زمین پر ٹہل رہا تھا باقی کتے آسمان پر اڑ رہے تھے اور کچھ سمندر میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ یکایک ایک سایہ تاریکی میں سے ابھرا۔ وہ بالکل اندھیرے کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ (مگر چونکہ مصنف نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی عینک لگا رکھی تھی اس لئے وہ اسے نظر آ رہا تھا) سایہ کوٹھی کے پھاٹک سے کود کر احاطے میں داخل ہوا اور اب وہ دھیرے دھیرے ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ یکایک برآمدہ روشن ہو گیا ایک عورت شب خوابی کے لباس میں کھڑی تھی سایہ تھر تھر کانپنے لگا۔ عورت بولی۔

"آج آپ پھر دیر سے آئے ہیں"

تمام جاسوسی کہانیوں کا اختتام ایک جیسا ہوتا ہے یعنی پڑھنے والے کو وقت اور پیسے کی بربادی کا فوری احساس ہو جاتا ہے۔ وہ آئندہ

"چالیس سے کچھ اوپر ہی ہوگی کہتی تو کچھ اور تھی"۔ فرمایا :۔
"تو کیا تمہارے خیال میں اس کی قریب کی نگاہ بالکل ٹھیک ہوگی اس کو PRESBYOPIA نہیں ہوگا ؟"

باجی اب تو واقعی جھلا گئیں۔ "ٹھیک ہو یا نہ ہو بھلا درد سے اس کا کیا تعلق ؟" ۔ بقراط کی خالہ بولیں :۔ تمہاری جہالت نہ گئی بھئی اس عمر میں CALIARY MUSCLES ڈھیلے پڑ جاتے ہیں ۔ لہٰذا SUSPENSORY LIGAMENTS کا تناؤ بھی ماند ہو جانا لازم ہے ۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے LENS گول ہو جاتا ہے ۔ اور مریض کو قریب کا نظر نہیں آتا لیکن دور کی نظر پہ کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ ان مریضہ کو چونکہ اخبار پڑھنے کا خبط ہے لہٰذا یہ اس کو دو تین فٹ کے فاصلے پہ رکھ کر پڑھتی ہیں ۔ ان کی باہوں میں نہیں تو کیا تمہاری باہوں میں درد ہوگا ۔" فاتحانہ انداز میں دوبارہ مخاطب ہوئیں ۔ :۔

"اب بتاؤ آنکھوں کے وارڈ میں بھیجنا چاہیئے یا نہیں ؟ یہ سب تو اچھی HISTORY لینے سے ہی معلوم ہوتا ہے ۔"

ایک دم جیسے ان کو ہماری موجودگی کا احساس ہوا ، دوستی کا پورا حق ادا کرنے کی غرض سے بولیں :۔

"یہ تم منہ پھلائے کیوں بیٹھی ہو ! ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تم کو NEPHRITIS ہو گیا ہو ، آنکھیں تو تمہاری پہلے ہی سے چھوٹی ہیں ، شاید ورم چڑھ گیا ہے ۔ جو یہ مجھے آج کچھ اور بھی چندھی چندھی لگ رہی ہیں ۔ باجی کو مخاطب کر کے کہا ، مجھے تو CONGESTION بھی لگ رہا ہے کہیں CONJUNCTIVITIS تو نہیں ہو گیا ! تم ذرا دور دور ہی رہنا کہیں تم کو بھی نہ ہو جائے"۔

باجی کو حکم دیکر وہ جس تیزی سے آئی تھیں اسی تیزی سے پیچھے ہٹ گئیں اور فرمایا :۔

" گھر میں ڈاکٹر موجود ہے ، میں بھی آتی رہتی ہوں آخر اتنے دن سے کہا کیوں نہیں ۔ اب یہ کوئی بات نہیں کہ ہم لوگ پکڑ پکڑ پوچھیں کہ بھئی خدانخواستہ نصیب دشمناں ، طبیعت تو خراب نہیں ! اچھا یہ تو بتاؤ کبھی آنکھوں کے سامنے کالے کالے ترمرے تو نہیں ناچتے ؟"

مودبانہ عرض کیا :۔ "جی نہیں !" ۔

فرمایا :۔ "اچھا تو پھر ایسا لگتا ہوگا جیسے آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی ہو ، کنپٹیوں میں بھی درد ہوتا ہوگا ۔ جو کہ بعد میں سارے سر میں پھیل جاتا ہوگا اور آنکھوں میں خارش بھی ہوتی ہوگی ، اور پانی بھی بہتا ہوگا ، اکثر دل بلیوں اچھلنے لگتا ہوگا ۔ اور کبھی کبھی ڈوبتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہوگا ۔ شاہدہ کہہ رہی تھی کہ جگر تو تمہارا پہلے ہی خراب ہے"۔

ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم اتنے علیل ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ باجی اور اس کی سہیلی نے اتنی سی دیر میں ہمیں پکا یقین دلادیا تھا کہ ہم اتنے سخت علیل ہے کہ بس لب گور ہی ہیں ۔ اور ہم کو یوسفی صاحب کے وہ سیٹھ دوست یاد آگئے جو روزانہ شام کو بندر روڈ پہ اپنی کار میں چہل قدمی کرتے تھے ۔ اور اپنے پوشیدہ مرض پہ اتنا روپیہ صرف کر چکے تھے کہ کتنے تھے ۔

"خدا کی قسم اب اگر کسی اور بیماری میں مرنا پڑا تو خود کشی کر لوں گا"۔ اور ہم اس زنانے بانے میں الجھ کر رہ گئے کہ اگر خدانخواستہ وہ ہماری باجی اور ان کی سہیلی کے پلے پڑ گئے تو نہ جانے کتنی بار خود کشی کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔

بقیہ : پیغام اقبال

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

وہ مسلسل حرکت اور عمل پیہم کی ترغیب دیتے ہیں ۔ اقبال کا پیغام پیغام جہاد ہے ۔ وہ مسلمانوں کو عشق کی زبردست قوت سے لیس دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر انہیں وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا درس دیتے ہیں ۔ مختصراً ایک مسلمان کے لئے پیغام اقبال یہ ہے کہ :

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں - ہم اچھے بھلے تو ہیں"۔

کمبخت چھینک نے بھی اس وقت ہمارا گھر دیکھ لیا تھا - وہ دوسری جو آئی تو یہ معلوم ہوا جیسے باجی کو کرنٹ لگا ہو - فوراً ہمیں بستر پر دھکا دیکر وہ تڑپ کر اندر بھاگیں - ہماری باجی سے آپ واقف نہیں -

(آجکل ہم بھی نہیں ہیں - پہلے تو بہت اچھی ہوتی تھیں)

یہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں سال چہارم کی طالبہ ہیں، لیکن کچھ انہوں نے خود اور کچھ ان ، جیسے نیم ڈاکٹروں نے ان پر ڈاکٹری مسلط کردی ہے - تختۂ مشق تو ظاہر ہے کہ چھوٹے بہن بھائی ہی بنتے ہیں - آئے دن ہم پر کوئی نہ کوئی نیا تجربہ کیا جاتا ہے - بلکہ اکثر و بیشتر تو طرح طرح سے ٹھونک بجا کر بھی اپنا شوق پورا کرتی ہیں - اس پر طرّہ یہ کہ جیسے ہم پر احسان کیا جارہا ہو - ہم سب چھوٹے بہن بھائی ہیں تو اکثر باجماعت گاتے پھرتے ہیں کہ :-

ہم پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

لیکن کون سنتا ہے فغانِ طفلاں -

لیجئے وہ واپس آگئیں مع اپنے ہتھیاروں کے اور حکم صادر ہوا - "اِدھر آؤ اور کرسی پر بیٹھ جاؤ - ہم دم سادھے کرسی پر بیٹھ گئے اور اس طرح اس ناگہانی آفت کا انتظار کرنے لگے جیسے بکرا چھرا دیکھ کر اپنی باری کا انتظار کرتا ہے - عجیب و غریب وضع کے اوزار دیکھ کر کئی بار ہماری روح قفس عنصری سے پرواز کرتے کرتے رہ گئی، حکم ہوا منہ کھولو، کھولو بھئی آرام سے زبان باہر نکالو، چلو اندر ہی رہنے دو مگر نہیں نکال ہی لو تو اچھا ہے - یہ کہہ کر انہوں نے چمچہ سا اٹھایا اور ڈنڈی ہمارے منہ کے قریب لائی تھیں کہ ہم نے زور سے ابکائی لی - ارشاد ہوا - گھبراؤ مت ہم بس ذرا تمہارا گلا تمہارا دیکھیں گے -

منت سماجت سے تنگ آکر ہم نے منہ کھول دیا اور انہوں نے چمچہ کی لمبائی اور ہمارے حلق کی گنجائش کا موازنہ کئے بغیر چمچہ ہمارے منہ میں گھسیڑ دیا - ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے چمچہ ہمارے حلق کو چھیدتا ہوا باہر نکل آیا ہو - ہم نے ایک فلک شگاف صدائے احتجاج بلند کی

تو ڈانٹ کر بولیں -

"تمہارے جیسے دو چار مریض اور پیدا ہو جائیں تو بس کام ہوگیا - دیکھو تمہارے واویلا میں لیمپ لانا بھی بھول گئی، جاؤ ذرا بھاگ کر لیمپ تو لے آؤ" پھر خود ہی فرمایا - چھوڑو تمہاری طبیعت خراب ہے تم کہاں جاؤ گی - رہنے دو ہم ٹارچ سے ہی سے کام چلا لیں گے بس ذرا تم اس کو پکڑ لو - ہم نے ٹارچ کا رُخ اپنے منہ کی طرف کیا اور منہ کھول دیا - باجی نے وہی چمچہ سا ہمارے منہ میں ڈالا ہی تھا کہ پھر ایک بار زبردست قسم کی ابکائی آئی باجی نے جھلا کر سر پر ایک چپت رسید کی - (اپنے نہیں ہمارے) جھٹکے سے جو دانت بند ہوئے تو باجی کی انگلی ہمارے دانتوں کی زد میں تھی -

ابھی پوری طرح ڈانٹ سے لطف اندوز ہونے بھی نہ پائے تھے ..... کہ باجی کی عزیز از جان سہیلی (جن کو ہم نازلی باجی کہتے ہیں) آوارد ہوئیں ان کی مختصر سی تعریف یہ ہے کہ ان کو اپنے سوا ہر کوئی مریض دکھائی دیتا ہے - بشرطیکہ وہ آئینہ نہ دیکھیں - بلا تکلف اور بلا معاوضہ مشورہ دینا ان کی گھٹی میں پڑا ہے - ان سے ملنے کے بعد ہر شخص کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ عنقریب اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہے زبان اس روانی پر چلتی ہے کہ :- ؎

وہ بولا کئے اور ہم دیکھا کئے یا جیسے ریشم پہ قینچی

آتے ہی یوں پھٹ پڑیں کہ جیسے برسوں سے بولنا نصیب نہ ہوا ہو - شاہدہ وہ کل والی مریضہ یاد ہے ارے وہی جس کے بارے میں سب کہہ رہے تھے کہ ARTHRITIS کا کیس ہے جب میں نے اکی HISTORY لی تو وہ مجھے سو فیصد آنکھوں کے وارڈ کا کیس لگا - میرے خیال میں تو اسے REFER کر دینا چاہیئے"۔

باجی چونک کر بولیں - "دماغ تو صحیح ہے - کہنیوں کے درد کا آنکھوں سے کیا تعلق"۔

نازلی باجی تمسخرانہ انداز میں مخاطب ہوئیں :-

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس کی عمر کیا ہے؟" باجی نے جواب دیا :-

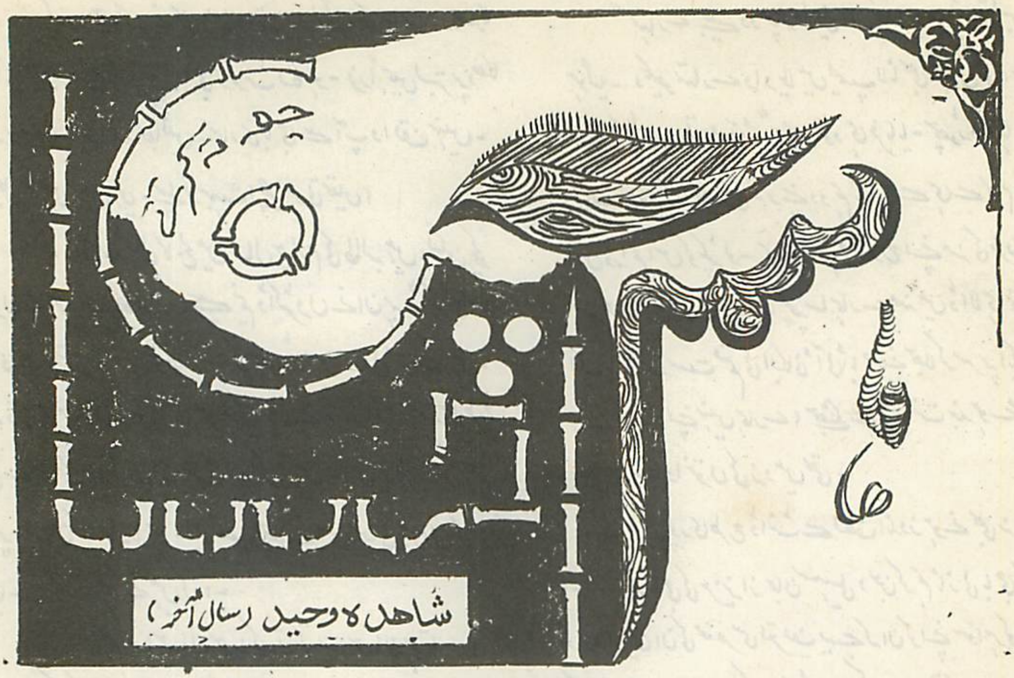

ابھی ہم چھینک کر سنبھل بھی نہ سکے تھے کہ باجی نے آدبوچا ہماری ناک کا بغور مطالعہ کیا۔ اپنے دست مبارک سے اس کو چھو کر دیکھا، گردن پر طائرانہ نظر دوڑائی، ماتھا چھوا، رخساروں پر دست شفقت پھیرا۔ نبض ٹٹولی اور پھر اس تفصیلی طبی معائنہ کے بعد نہایت تشویشناک لہجہ میں فرمایا :۔

"تمہاری تو طبیعت کافی خراب معلوم ہوتی ہے، ہمیں بتایا کیوں نہیں!"

ہم ہنس دیئے مگر باجی کہاں ٹلنے والی تھیں۔ ہماری لاکھ چیخ و پکار کے باوجود کہ ہم بالکل خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت کے بھی خواہاں ہیں۔ وہ اپنی مسیحائی پر اڑی رہیں اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر یوں گویا ہوئیں :۔

"بس بس! بیکار کی باتیں نہ کرو یہ صحت دیکھیئے اور رات رات بھر کی جگائی ملاحظہ ہو الٰہی اگر ہم اپنی پڑھائی کی خاطر جاگیں تو خیر کوئی بات بھی ہو، لیکن تمہارا جاگنا چہ معنی دارد ؟

حیرت سے عرض کیا :۔ "کون جاگا رات بھر! کمال کرتی ہیں آپ بھی۔" جواب ملا :۔

"رات کو بارہ بجے تک تم نہیں تو کیا میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔"

جھنجھلا کر عرض کیا :۔ "حد ہے باجی! انسان ٹی وی بھی نہ دیکھے، کل اتنی اچھی پکچر آرہی تھی۔

مادرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

"بھلا تمہاری صحت بھی کہیں اس کی متحمل ہوسکتی ہے کہ تم بارہ بارہ بجے تک جاگو، چھوٹی موٹی سی تو تمہاری جان ہے، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ان باتوں کا ابھی اندازہ نہیں ہوگا۔ آگے جاکر ہی لاپرواہیاں ہی پروان چڑھیں گی۔ تو ہوش آئے گا۔ ابھی پچھلے مہینے تمہارا جگر بڑھا ہوا تھا جب ہی تو تمہیں بھوک نہ لگنے کی شکایت تھی"۔

عرض کیا۔ "کاش کہ ایسا ہوسکتا کہ ؎

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

اور آپ اس کو فٹے سے ناپ تول کر دیکھ لیں۔ بغور مطالعہ کرلیں تاکہ کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔ باجی آپ بھی بعض اوقات

مزید یہ کہ طبی تعلیم سے قبل کی ابتدائی تعلیم پر مزید توجہ دی جائے اور اسکولوں میں خصوصاً تھوڑی بہت طبی تعلیم مثلاً ابتدائی طبی تعلیم (فرسٹ ایڈ) دی جائے۔

(۷) ـــــ قومی صحت کی بہتری کیلئے سب سے پہلے ہمیں طبی تعلیم کی بہتری کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اس کے بعد ان تمام مسائل کا حل قومی صحت کی بہتری کے لئے لازمی ہے۔ جنکا ذکر میں نے پچھلے سوال میں کیا ہے۔

اسسٹنٹ پروفیسر مالک اے شیخ

س (۱) ـــــ یہ بالکل درست ہے۔ اس تعلیمی ڈھانچہ میں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کے حامل طلباء ہیں۔ اور یہ طالب علم مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اپنے آپ کو اس بات کے اہل ثابت نہیں کر رہے کہ انہیں میڈیکل کالجوں میں داخلہ تک دیا جائے۔

ڈاکٹر تیار کرنا تو ایک الگ بات ہے ایسے طلبہ کو ان حالات میں کسی قسم کی مفید ٹریننگ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس لائق بھی نہیں ہیں کہ اس ٹریننگ کو سمجھیں۔ طبی تعلیم سے پہلے انہیں انگریزی زبان کی تعلیم دینا شاید زیادہ ضروری ہوگا۔ دراصل ہماری پری میڈیکل تعلیم کا معیار اتنا ہوا ہے کہ ہمارے ایک عام طالب علم کو نویں کلاس کے سائنسی مضامین کی چیزیں معلوم نہیں ہوتیں۔

(۲) ـــــ پہلے سوال میں میں نے جو وجوہات بیان کی ہیں انکی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف طلبہ کو ہی اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

(۳) ـــــ میرے خیال میں اس وقت ہمیں ابتدائی طور پر دو تین اہم اقدامات کرنے ہونگے۔ پہلا یہ کہ انفرادی اہلیت یا قابلیت کو جانچنے کے نظام کی نئے سرے سے منصوبہ بندی کی جائے۔ دوئم یہ کہ امتحانات وقتِ مقررہ پر ہوں۔ سوئم یہ کہ وہ طلباء جو نصابی سرگرمیوں میں اپنی خارجی اور اپنی عملی تربیت مکمل نہ کر سکیں۔ انہیں امتحانات میں بیٹھنے کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔

(۵) ـــــ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اس لئے کہ لوگ نت نئے فیشن اور مہنگے سے مہنگے کپڑے پہننے کیلئے تو ہر قسم کے اخراجات برداشت کر لیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ فیشن اور کپڑے اسی وقت کام آسکتے ہیں جبکہ انکے پہننے اور نمائش کرنے کے لئے ایک صحت مند جسم موجود ہو۔ میرا بیس سالہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر کی فیس لوگ اتنی خوشی سے نہیں دیتے جتنا ڈاکٹر کے مطب کے ساتھ کیمسٹ کی دکان سے اعلیٰ مہنگی ادویات لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور اگر یہاں بھی دستیاب ہوں تو نیویارک اور لندن سے منگوانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان حالات میں طب مشرق کو اپنا کر چند روپوں کو بچا لینے سے میں نہیں سمجھتا کہ کچھ فائدہ حاصل ہو جائے گا۔

(۶) ـــــ میرے خیال میں یہ ترتیب کچھ اس طرح سے بنتی ہے۔

نمبر ۱ - میڈیکل کالج میں داخلے سے پہلے مناسب معیارِ تعلیم۔

نمبر ۲ - ہائیجین اور انسدادِ طب۔

نمبر ۳ - عوام کی طبی تعلیم و تربیت۔

نمبر ۴ - متعدی بیماریاں۔ انکی روک تھام اور بچاؤ کا طریقِ کار۔

(۷) ـــــ میرے نزدیک فی الوقت یہ اقدامات بالترتیب اشد ضروری ہیں۔

نمبر ۱ - میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لئے صحیح بنیاد

نمبر ۲ - اساتذہ کیلئے انفرادی قابلیت یا اہلیت جانچنے کا صحیح نظام اور طریقِ کار۔

نمبر ۳ - بااصول اور سخت گیر انتظامیہ کا قیام

نمبر ۴ - سوال نمبر ۶ میں بیان کردہ تمام مسائل کا فوری حل۔

ڈاکٹروں پر کام کی زیادتی کا جو دباؤ ہے وہ بھی کم ہو جائے گا۔

جہاں تک ڈاکٹروں کے معاشی مسائل کا تعلق ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ ڈاکٹروں کی تنخواہیں اتنی ہونی چاہیئے ہیں کہ وہ اچھی زندگی گذار سکیں۔ اور دوسری طرف نظریں نہ اٹھائیں کہ انہیں کچھ اور بھی کرنا ہے خصوصاً اساتذہ کا اس سلسلے میں خیال رکھنا لازمی ہے۔ جن ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت نہ ہو یا نہ کرنا چاہیں تو ان کو انکی تنخواہ کے برابر نان پریکٹسنگ الاؤنس (NON PRACTICING ALLOWENCE) دیا جائے۔ نیز جنکی LIABILITIES زیادہ ہوں انہیں زیادہ ٹیچنگ الاؤنس دیا جائے۔

یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ ایک ڈیمانسٹریٹرز کو ڈاؤ میڈیکل کالج میں تین سو، اسسٹنٹ پروفیسر کو ڈھائی سو اور پروفیسر کو دو سو روپے ٹیچنگ الاؤنس ملتا ہے۔ اس تناسب کی درستگی کے لئے علاوہ طلبہ اور اساتذہ کے تناسب کا ہمہ وقت خیال رکھنا لازمی ہے۔ ایک مثالی کلاس میں ۵۰ طلباء ہوں۔ ان کے علاوہ ہمیں ہر شعبہ کی کارکردگی پر نظر رکھنی ہوگی۔ کئی شعبوں کی موجودہ ابتر حالات کے پیش نظر اسکی ضروریات اور اسکے مسائل کو حل کرنے میں پوری توجہ دینی ہوگی۔

میرے خیال میں اگر ان تمام تجاویز کو ان اقدامات میں شامل کر لیا جائے تو کافی حد تک طبی تعلیم کے مسائل حل کیئے جاسکتے ہیں۔

(۴) ——— میرے نزدیک دونوں طریقہ علاج کے بنیادی اصول ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طب مشرق کے حصول میں وقت کم لگتا ہے اور طالب علم جلد حکیم بن جاتا ہے۔

اس دور کا حکیم اناٹومی، فزیالوجی، پیتھالوجی کے علاوہ تمام جدید تصورات و حقائق طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہا ہے

اگر ہمیں عوام (MASSES) کا علاج کرنا ہے تو ہمیں عملی طور پر اسکے لئے چند فوری اقدامات کرنے ہوں گے۔

پہلا قدم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ ڈاکٹروں کی تیاری ہوگا۔ یعنی ہم طب کے لیئے میٹرک کے بعد طالب علموں کو میڈیکل کالجوں میں داخلہ دیں اور ایم بی بی ایس کے بجائے انکو کوئی اور ڈپلومہ مثلاً ایل ایس ایم ایف، جو پہلے ملتا تھا۔ اُسے دوبارہ جاری کیا جائے۔ اس طرح سے تین سال کی بچت ممکن ہو جائے گی۔ اور گریجوئیٹس کے بجائے LICENTIATES تیار ہوں گے۔

اس طرح سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ دیہی علاقوں سے متعلق LICENTIATES اپنے گاؤں میں رہنے کو ترجیح دے گا اور یوں ہمارا دیہی صحت کا مسئلہ بلکہ قوم کا اصل طبی مسئلہ حل ہو جائے گا۔

(۵) ——— یہ الزام قطعاً غلط ہے۔ مہنگا وہ صرف اس خیال سے کہتے ہیں کہ انہیں ڈاکٹروں کی فیس زیادہ نظر آتی ہیں رہا دوا کا تعلق تو معدودے چند مہنگی اور نایاب ادویات کے باقی ادویات نسبتاً سستی ہیں۔

حکیم عام طور سے " خام ادویات CRUDE DRUG" استعمال کرتے ہیں۔ جن میں بے شمار غیر ضروری اور ضرر رساں اجزاء بھی ہوتے ہیں۔ اس لیئے ان کا یہ کہنا کہ وہ مکمل علاج کر کے ہیں غلط ہے ——— جتنے امراض کا علاج ہم ڈاکٹر بخیر و خوبی کر سکتے۔ وہ اتنے امراض کا قطعاً نہیں کر سکتے۔ اسکے علاوہ انکے یہاں جدید جراحی کیلئے مطلق انتظامات موجود نہیں۔ انکے کینسر اور فالج کو ٹھیک کرنے کے افسانوی واقعات کا تعلق ہے وہ ظاہر ہے غیر حقیقی ہیں۔

(۶) ——— آج کل تو سب ہی مسائل اہم ہیں۔ دواؤں کی قیمتوں سے لے کر ڈاکٹروں کی فیسوں تک۔ خصوصاً اسپیشلسٹوں کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔

بہر حال اس معاشرتی و معاشی پہلو سے قطع نظر دیگر مسائل بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم اپنی زیادہ تر توجہ اور صلاحیتوں کا استعمال بیماریوں کے علاج میں کر رہے ہیں۔ ہمیں زیادہ زور بیماریوں سے بچاؤ پر دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ بیماری ہی پیدا نہ ہو جس کا علاج کرنا پڑے۔

اسکے علاوہ ٹیلیویژن فلم اور ریڈیو پر صحت کے پروگراموں کی نئے سرے سے منصوبہ بندی ہو مناسب پروپیگنڈہ ہو تاکہ عام آدمی ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

دوسرے مسائل پر گرفت مضبوط کر رہا ہے۔

ہم سب کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر بھی یہ فرض ہے کہ حکومت کے ان پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور انہیں کامیاب بنائیں جن کا بیڑہ اس نے اپنی جملہ ذمہ داریوں کے ساتھ اٹھا رکھا ہے۔

۷۔ اوپر کے جوابات میں اس سوال کے کچھ جزوی جوابات ہو گئے ہیں۔ ایک اہم چیز جس کا میں اس ضمن میں تذکرہ کرنا چاہوں گا وہ ہے تعلیم کی کمی۔ عوام میں عام تعلیم کی اس قدر کمی ہے کہ وہ ابھی صحت کے بنیادی اصولوں سے ہی ناواقف ہیں۔ انہیں بالکل ہی نہیں سمجھتے۔ اب بھی چیچک کے ٹیکے لگانے کے لئے توہم پرست ماؤں کو بہت کچھ ڈرانا دھمکانا یا لالچ دینا پڑتا ہے۔
اگر عوام یہ سمجھنے لگیں کہ ان کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا مضر۔ اور قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے حکومت کی ذمہ داریوں میں وہ کس قسم کا مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں تو بہت جلد قومی صحت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ انشا اللہ تعالیٰ۔

پروفیسر عمر خان

(۱) میڈیکل کالجوں میں طلبہ کی عوامی بھرتی کے بعد جو ڈاکٹر تیار ہوں گے وہ ظاہر ہے پوری طرح سے تربیت یافتہ نہیں ہو پائیں گے انہیں خود سے محنت کر کے بیشمار چیزیں حاصل کرنی ہوں گی۔ طلبہ کے اتنے بڑے ہجوم اور اسکے نتیجے میں اساتذہ طلبہ تعلقات کے فقدان کی وجہ سے استاد طلبہ سے اور طلبہ استاد سے قریب نہیں ہوتے اور نہ ہی ان حالات میں استاد انہیں انفرادی توجہ دے سکتے ہیں۔ اس طرح سے عملی تربیت حاصل کر کے مکمل ڈاکٹر نہیں بن سکتے صرف ڈاکٹر بن سکتے ہیں۔
یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل ضروری ہوتا ہے اور پریکٹیکل پر زور اسی وقت دیا جا سکتا ہے۔ جبکہ طلبہ کو دیہی علاقوں میں لیجایا جائے اور وہیں انہیں عملی تربیت دی جائے۔ یہ پروگرام اس طرح بن سکتا ہے کہ طلبہ کی ٹیمیں سینئر اساتذہ کی سرکردگی میں کچھ دن یا کچھ ماہ کیلئے وہاں جائیں اور تربیت حاصل کریں بالکل اسی طرح جس طرح سے طلبہ کی سرجری، میڈیسن اور دیگر ٹریننگ ہوتی ہے۔

(۲) ــــــ میرے خیال میں یہ تاثر درست ہے۔ جہاں تک اساتذہ کی ذمہ داری کا سوال ہے۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحبان جنھیں پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت ہے وہ پڑھاتے بھی ہیں۔ وہ طلبا پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے۔ جس طرح کہ ایک استاد جس کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس کی پرائیویٹ پریکٹس نہ کرنے کے لئے تنخواہ کافی دی جائے۔ یعنی اس کی تنخواہ کے برابر۔

جہاں تک طلبہ کی لگن، محنت، شوق اور جدوجہد کا تعلق ہے۔ یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر اب کہی جاتی ہے۔ کہ طلبہ ایک تو پڑھتے نہیں دوسرے غیر حاضر رہتے ہیں، تیسرے دگریس مارکس مانگتے ہیں۔ ممتحنوں پر ناجائز دباؤ ڈالتے ہیں۔ حتیٰ کہ دھمکیوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ستم یہ کہ یہ سب کچھ امتحانات میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے کے باوجود ہوتا ہے اور پھر سفارشیں بھی اساتذہ تک پہنچائی جاتی ہیں میری باتیں تلخ ضرور ہیں۔ لیکن ہمیں اگر اپنی طبی تعلیم کے معیار کے بہتر کرنا ہے۔ تو ان غلطیوں کا سدِباب کرنا لازمی ہوگا۔

(۳) ــــــ یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ پچھلے سوال کے جواب میں میں نے کچھ چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمیں سب سے پہلا قدم بے شمار شعبہ جات میں موجود اساتذہ کی آسامیوں کو پُر کر کے اٹھانا ہے۔ اسکے علاوہ انہیں زیادہ بہتر مواقع اور سہولتیں بھی فراہم کرنی ہوں گی۔ ڈیمانسٹریٹرز کے سلسلے میں خصوصی توجہ ضرورت ہے۔ کیونکہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں کی جب بحیثیت ڈیمانسٹریٹرز تقرری ہوتی ہے تو وہ تقریباً کورے بلینک ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کچھ تجربات کے بعد اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ کچھ پڑھا سکیں۔ تو انہیں زیادہ بہتر مواقع اور نوکریاں مل جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس سلسلے کے حل کے لئے اہم قدم یہ ہوگا۔ کہ بنیادی یا اساسی طبی مضامین کے اساتذہ کو کلینیکل سائیڈ میں کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سے دو فوائد حاصل ہونگے۔ پہلا یہ کہ ڈیمانسٹریٹرز کے دل میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ ڈاکٹر کم اور ڈیمانسٹریٹر زیادہ ہے۔ دوسرا یہ کہ کلینیکل سائیڈ کے

اور دوا الدین میں ہوا کرتا ہے۔ اگر ہم طلبا اور استاد کے درمیان اس خلیج کو پاٹ دیں اور مسند استادی سے اتر کر طلباء میں گھل مل کر ان کا اعتماد حاصل کرلیں تو یقیناً ہماری بات مؤثر ہوگی خواہ وہ تدریسی عمل ہو یا غیر نصابی سرگرمیاں۔ مگر بدقسمتی سے مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے (جس کے لئے میرے فاضل رفقاء مجھے معاف رکھیں) کہ ہم نے اپنی شخصیتوں پہ جو لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے مقامات سے سرمو سرکنے نہیں دیتے اور ہم کلاس لے کر کمرے میں آبیٹھنے کو ہی اپنی ذمہ داریوں کی انتہا سمجھتے ہیں۔

۳۔ میرے نزدیک تعلیمی معیار کو بہتر رکھنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ استاد اور طالب علم کے تناسب کو معقول حد میں رکھا جائے۔ ایک استاد کا ۵۰۰ طالب علموں کی کلاس لینا یا ۱۰۰ طالب علموں کی کلینک لینا، کوئی فنی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر بیس بیس طلباء کے گروہ ایک ایک استاد کو پڑھانے اور عملی تربیت دینے کو ملیں۔ تو ہر استاد اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرسکتا ہے اور طلبا بھی اس تدریس سے یقیناً کہیں بہتر استفادہ کرسکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس تجربہ گاہوں میں زیادہ گنجائش کا نکالنا، وارڈوں میں زیادہ بستروں کا ہونا، اور آپریشن تھیٹر میں مزید طلباء کے داخل ہوکر استفادے کے مواقع میسر ہونا، وغیرہ وغیرہ، وہ ضمنی ضرورتیں ہیں جن کا بہم پہنچا کر تعلیم کے معیار کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

۴۔ جی، قطعی نہیں! بلکہ میرے خیال میں ان دو طریق علاج کے اشتراک سے جو "ملغوبہ" تیار ہوگا۔ وہ کسی اور ذی روح کے لئے بہتر ہو تو ہو انسان کے لئے مفید نہیں ہوگا۔

اس سے تو ہمیں قطعی انکار نہیں ہے کہ طب جدید، طب مشرق ہی کی ارتقائی شکل ہے۔ لیکن اب ان دو اجزا کے امتزاج کے چہ معنی دارد؟

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مرسڈیز کار میں بیل گاڑی کے پہیے لگانے سے اس کی رفتار یا کارکردگی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اس کا عقلی اور منطقی جواب یقیناً آپ کے پاس نفی میں ہے۔

یہ ایک خام خیال ہے اور طب مشرق کو طب جدید کے دوش بدوش لانے کا جنون آمیز تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں!

۵۔ میرے خیال میں یہ دونوں اعتراضات بے بنیاد ہیں اور طب جدید کو بدنام کرنے اور طب مشرق کو عام کرنے کے سستے پروپیگنڈے ہیں، جہاں تک مہنگائی کا تعلق ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے کہ ہمیں اپنی اکثر ادویہ زرمبادلہ خرچ کرکے بیرونی ممالک سے درآمد کرنی پڑتی ہیں جس کی وجہ سے اندرون ملک ان کی قیمتیں زیادہ ہوگئی ہیں۔ بنفشہ، سنا اور عناب کی طرح ایلوپیتھی کی ادویات کبھی جڑی بوٹیوں اور جھاڑیوں سے حاصل ہوتی ہیں بلکہ ان ہی چیزوں (ادویہ) کے اجزائے ترکیبی کو مصفا کرنے میں جو رقم خرچ ہوتی ہے۔ اسے حساب کس گوشوارے میں ڈالا جائے گا۔

یہاں میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ہم ڈاکٹر اپنے پیشے کے تقدس اور ملکی معاشی معیار کے پیش نظر عوام کو سستا یا کسی حد تک مفت علاج فراہم کردیں تو اطباء کا یہ الزام بھی بالکل کالعدم ہوسکتا ہے۔

جہاں تک اس طریقۂ علاج کے عارضی ہونے کا الزام ہے۔ یہ بات غالباً انھیں لوگوں کی کہی ہوئی ہوگی جو امراض کی علت اور اسباب شناسی کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پیٹ میں 'اپنڈکس' نکلنے کے بعد پھر 'اپنڈکس' پیدا ہو جائے گی یا نس بندی کے بعد بھی آبادی میں اضافہ ممکن ہے ہاں! وہ بیماریاں جو جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ مریض ان سے اچھا ہوجاتا ہے۔ اور اگر پھر اسے (INFECTION) ہو جائے تو اس میں طریقۂ علاج کا کیا تصور؟ اس سوسائٹی کو کوسیے جس میں افراد تندرست کم اور بیمار زیادہ ہیں۔

ہاں! ان بیماریوں کا جو جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ حال کچھ مختلف ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مریض ایک بار اچھا ہو گیا مگر جراثیم نے پھر حملہ بول دیا تو مرض کا غلبہ دوبارہ ہو گیا۔ قوتِ مدافعت کی کمی اور جراثیم کے حملے کی شدت، یہ دو عوامل مریض کو پھر لٹا دیتے ہیں۔ اس میں ایلوپیتھی طریقۂ علاج کا کیا قصور؟

۶۔ ہر ترقی پذیر ملک مسائل سے دوچار رہتا ہی ہے۔ اس طرح پاکستان کے بھی طبی مسائل ہیں جن سے وہ دوچار ہے۔ ان میں میرے نزدیک غذا کی زیادتی اور کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں، وبائی امراض اور آبادی میں اضافہ انتہائی اہم مسائل ہیں۔

موجودہ حکومت کی کوششیں ان ہی مسائل کو حل کرنے میں بہت وقیع اور مستحسن ہے۔ اگر حکومت نے ان مسائل کو حل کر لیا تو انشاء اللہ پاکستان اپنے طبی مسائل پر اسی طرح عبور حاصل کرلے گا جس طرح آہستہ آہستہ

اور میری دلیل یہ ہے کہ میں نے ۱۹۶۱ء میں ساڑھے تین سو روپے میں (TONSILLECTOMY) کا جو آپریشن خریدا تھا اس کی مدد سے میں اب تک ساڑھے تین ہزار اوزار خرید چکا ہوں۔ سارے اوزار صحیح سلامت ہیں۔ چنانچہ ایلوپیتھی طریقِ علاج ہرگز مہنگا نہیں ہے۔

جہاں تک عارضی طریقِ علاج کا سوال ہے تو میں اس سے کبھی متفق نہیں ہوں، کیونکہ جو عضو ایک مرتبہ نکال دیا جائے، وہ ظاہر ہے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ لہٰذا ہمارا طریقِ علاج مکمل طور پر مستقل علاج ہے۔

۶۔ میرے نزدیک بالترتیب دو چیزیں انتہائی اہم ہیں یعنی حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی اور صحت کا عمومی پروگرام۔ ہماری قومی صحت کا انحصار انہی دو اہم چیزوں پر ہے۔

۷۔ پچھلے سوال میں میں نے صحت کے جن قومی مسائل کا ذکر کیا ہے میرے نزدیک ان اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

پروفیسر شاکر علی جعفری

۱۔ آپ کے اس سوال میں مجھے جو لفظ جواب طلب نظر آتا ہے۔ وہ مکمل تعلیم یا مکمل تربیت ہے۔ مکمل ایک ایسا اضافی لفظ ہے جس کی تعریف مختلف ادوار میں مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم و تربیت جو ہمارے ملکی وسائل کے پیشِ نظر مکمل سمجھی جاسکتی ہے۔ وہ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں یقیناً پست اور نامکمل ہوگی۔ لہٰذا اس سوال کا جواب اگر ہم اپنے معاشی، اقتصادی اور تعلیمی صورتحال کے پس منظر میں تلاش کریں تو جواب ملنے میں قدرے آسانی ہوجائے گی۔

آپ کو چونکہ ملکی صورتِ حال کا اندازہ ہے۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں تامل کوئی عار نہیں ہے کہ مطلب براری کے لئے ہم جو ڈاکٹر تیار کرتے ہیں۔ وہ فی الواقع ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم پانے والے ڈاکٹروں کے مقابلے میں کم تربیت یافتہ ہوتے ہیں، ہمارے اساتذہ فنی مہارت اور تدریسی تجربوں میں کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے معیاری استاد سے کچھ کم نہیں ہیں۔

لیکن اپنی استعداد اور صلاحیت کے باوجود اگر وہ "مکمل تربیت یافتہ" ڈاکٹر تیار نہیں کرپاتے تو اس تعلیمی ڈھانچہ میں کم سے کم استاد کا کوئی منفی کردار نہیں ہے۔

چونکہ آپ کے اور سوال بھی اس ضمن میں آئیں گے۔ لہٰذا میں جواب کا بقیہ حصہ کسی اور جگہ دینے کی کوشش کروں گا۔

۲۔ مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے کسی حد تک واقعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرتے ہوئے اس تعلیمی معیار کے انحطاط میں طلباء کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ لہٰذا یہ بات تو اپنی جگہ طے ہوگئی کہ تعلیمی معیار پست ہو رہا ہے۔ اب جہاں تک طلبا اور اساتذہ کی انفرادی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ان دو اہم عوامل کے علاوہ بھی کچھ غیر مرئی قوتیں (INVISIA-BLE FORCES) بھی ہیں، جو تعلیمی معیار کو پست کرنے میں "فی سبیل اللہ" اپنا کردار ادا کررہی ہیں۔ لیکن آپ نے چونکہ صرف دو ہی عوامل کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا میں اپنا جواب بھی انہی تک محدود رکھوں گا۔

کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ طالب علم اپنی عمر کی سترہ منازل طے کرنے کے بعد ہمارے پاس آتا ہے۔ اس وقت تک اس طالب علم میں کردار کی پختگی، عزائم کی بلندی، ایثار اور جذبات وغیرہ وغیرہ بڑے عمیق اور راسخ ہوچکے ہوتے ہیں۔ ہم فنی درس گاہوں میں اخلاق سدھارنے والی، احساسِ ذمہ داری کو بڑھانے والی، شرافت و انسانیت کے معیار کو بلند کرنے والی تعلیم نہیں دے سکتے۔

اس لئے طالب علم کے حصولِ تعلیم میں اس کی وہ تربیت مانع ہے، جو وہ ہمارے پاس آنے سے پہلے حاصل کرتا ہے۔ تو ہم نہ تو اس میں اس کے کردار کی حد تک کوئی تبدیلی پیدا کرسکتے ہیں۔ نہ ہی اس کے راسخ تشخص کو کسی اور ڈھانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔

یہاں وہی غیر مرئی قوتیں کام کررہی ہیں جن کا میں نے اوپر اشارہ کیا تھا۔ اس لئے مجھے اپنے عزیز طالب علموں سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تعلیمی معیار کی "بڑھیا کو ٹہلانے میں" تمہارا بھی کچھ کم حصہ نہیں۔

اب جہاں تک اساتذہ کی ذمہ داری کا تعلق ہے۔ میں ایک عام استاد کی حیثیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہفتے میں کچھ گھنٹے لیکچر لے لینا یا تجربہ گاہوں میں لگا ہے یہ لگا ہے" وعلیکم السلام" کہہ دینا ہی ہماری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا نہیں ہے۔" ایک اچھے استاد کو "کلاس روم" کے باہر بھی طالب علموں کے انفرادی مسائل اور اجتماعی ضرورتوں سے کماحقہ واقفیت رکھنا لازم ہے۔ استاد اور طالب علم میں وہی اعتماد اور اعتقاد ہونا چاہیے جو والد

۶۔ اس کے بعد غذائی معاملات ہیں۔ اور پھر ان سب سے زیادہ اہم حفظانِ صحت کے اصولوں کا پروپیگنڈہ اور ان کے اطلاق کا پروگرام ہے کیونکہ ان اصولوں کی پابندی کا کوئی جامع نظام موجود نہیں ہے۔ اس لئے ان پر عمل پیرا ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ملک میں آج بھی متعدی بیماریوں کا دور دورہ ہے۔

۷۔ پہلے یہ خیال تھا کہ صحت ایک لاحاصل شے (NON PRODUCTIVE ITEM) ہے۔ لہٰذا پچھلی حکومتوں نے صرف (UP SERVICE) کی حد تک اس مسئلہ کو اٹھا رکھا تھا۔ اب یہ مسئلہ کوئی غیر بار آور شے نہیں رہا ہے کیونکہ یہ تاثر اب زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر قومی صحت کی بہتری کے عملی اقدامات نہیں کئے گئے تو قومی ترقی ناممکن ہو جائے گی۔

اس وقت سب سے اہم قدم جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ بیماریوں سے بچاؤ کا ہے۔ پھر طبی تعلیم، بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے وغیرہ ہیں۔ ان تمام چیزوں کو بہتر بنانا ہی میں سمجھتا ہوں کہ اشد ضروری اقدام ہوگا۔

پروفیسر کیو۔ ایم۔ جلیسی

۱۔ یہ بات درست ہے کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچہ صرف ایک ڈھانچہ ہی رہ گیا ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی موجودگی میں مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر تیار کئے جا سکیں۔ اس کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ INDIVIDUAL PATIENT ORIENTATED ہے۔ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ COMMUNITY MEDICINE ORIENTED ہو۔ اس کے علاوہ اس میں تھیوری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ جبکہ اس پیشے میں کامیابی کے لئے یہ لازمی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ عملی ہو۔ پھر قابلیتوں کو جانچنے کا لاٹری سسٹم یعنی موجودہ برطانوی طرزِ امتحانات بھی بالکل غلط ہے۔ آج جو یہ شکایت کی جاتی ہے کہ طلبا کلاسوں میں نہیں آتے۔ اس کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سمسٹر سسٹم نافذ کر دیا جائے۔ اس طرح سے کم از کم انفرادی قابلیت اور صحیح طریقے سے جانچا جا سکے گا۔ اور یوں ایک طرف جہاں اساتذہ، لیکچرز اور ڈیمانسٹریٹرز وغیرہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کلاسز لیں گے تو دوسری طرف طلبا بھی ان تمام سرگرمیوں میں صحیح معنوں میں حصہ لیں گے۔

۲۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں نہ طلباء اور نہ ہی اساتذہ ذمہ دار ہیں۔ اصل ذمہ دار ہماری تعلیم کی منصوبہ بندی کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے اساتذہ کی تعداد اور لیبارٹری کی سہولتوں میں اضافہ کئے بغیر طلبا کی تعداد آسمان تک پہنچا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کلاسز شیطان کی آنت کی طرح بڑی ہوں گی تو کوئی بھی استاد طلبا پر پوری توجہ نہیں دے سکتا خصوصاً اس حالت میں جبکہ تعلیمی سہولتوں اور دیگر ضروریات کی کمی ہو۔

پھر خالص تعلیمی معاملات میں غیر تعلیمی دباؤ بہت بڑھ گیا ہے جس کے تحت نتائج میں ترامیم کرائی جاتی ہیں، امتحانات ملتوی کرائے جاتے ہیں، گریس مارکس دلوائے جاتے ہیں۔ یہ وہ تمام عوامل ہیں جن کی وجہ سے آج کی طبی تعلیم کا معیار پست ہو گیا ہے۔ اس میں نہ تو ایک استاد کا ہاتھ ہے اور نہ ہی ایک عام پڑھنے لکھنے سے مطلب رکھنے والے طالب علم کا ہاتھ ہے ہم سب تو حالات کی چکی میں پسنے والے مجبور لوگ ہیں۔

۳۔ سب سے پہلے تو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے جن کی میں نے نشاندہی کی ہے۔ یعنی تعلیمی سہولتیں، اچھی لائبریریاں، لیبارٹری کی سہولتیں۔ اس کے بعد پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے تعلیمی پروگرام کو زیادہ سے زیادہ عملی بنائیں۔ اور یہ طے کریں کہ نسبتاً اہم چیزیں کون سی ہیں، اسی طرح سے ان کی ترتیب بنائیں اور اسی کے مطابق اپنے پروگرام مرتب کریں۔ اس کے علاوہ اشد ضروری قدم یہ ہوگا کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ (COMMUNITY ORIENTED) کیا جائے، یعنی طلباء اور اساتذہ کو ہسپتال کی چہار دیواری سے نکال کر گاؤں کی کچی دیواروں میں لے لیا جائے جہاں غربت، جہالت، بھوک اور بیماریاں اپنی انتہا پر ہوا کرتی ہیں۔

نیز اس بات کی نشاندہی کرنی بھی ضروری ہے کہ ایک ڈاکٹر پہلے ایک اچھا آدمی بنے۔ دوسرے الفاظ میں طلبا میں اخلاق اور مذہبی اقدار کی بیداری لازمی ہے۔ کیونکہ ایک اچھا آدمی ہی اچھا ڈاکٹر ہوتا ہے۔

۴۔ نہیں صاحب! یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ طبِ مشرق کوئی جدا چیز نہیں ہے۔ آج کی سائنٹفک میڈیسن طبِ مشرق کی ترقی یافتہ شکل ہے ترقی یافتہ طب کی موجودگی میں یہ غیر ضروری ہوگا کہ ہم اب سے پانچ سو سال پہلے کی چیزوں کی طرف جائیں۔

۵۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ خصوصاً ایک سرجن کی حیثیت سے

نہیں آئیں گے، اس وقت تک تعلیم کے مقاصد پورے نہیں ہوسکتے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب تک طلبا جوش وخروش کا مظاہرہ نہ کریں، پڑھانا وبال لگتا ہے۔ بہرحال طلبا کی ذمہ داری کی حد تک میں یہ کہوں گا کہ انہیں محنت سے پڑھنا چاہیئے۔ میرے سامنے جو موجودہ حالات ہیں ان کے اعتبار سے میں طلباء کو اتنا الزام نہیں دوں گا۔ کیونکہ وہ بھی اس پورے نظام کا حصہ ہیں۔ ان کے مسائل بھی مجموعی طور پر دوسروں سے مختلف نہیں ہیں، مثلاً۔ مناسب ماحول، سہولتوں اور قابلیت کا فقدان۔

اب یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اساتذہ بھی معیارِ تعلیم کو پست کرنے کے پورے ذمہ دار نہیں ہیں، کیونکہ ان کے مسائل بھی کافی حد تک وہی ہیں جو طلباء کے ہیں۔ مثلاً انہیں مناسب ماحول میسر نہیں آتا۔ لائبریریوں سے مناسب کتابوں کے حصول کی سہولت موجود نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ

میرے خیال میں تعلیمی معیار کو پست کرنے کا الزام کسی ایک طبقے پر نہیں لگایا جاسکتا۔ پورے معاشرے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے اور اس کے سدِباب کے لئے حتی المقدور کوشش کرے۔ اصل میں موجودہ تعلیمی نظام فرنگیوں نے "بابو" لوگوں کے لئے بنایا تھا۔ اسے ہم نے بجائے تبدیل کرنے کے اور بگاڑ دیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکام بالا اور منصوبہ بندی کرنے والوں پہ بھی اس کی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی۔ یہ پوری قوم کی کوتاہی ہے۔

۳۔ یہ بڑا وسیع موضوع ہے۔ اس کے لئے بے شمار اقدامات کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس پیشے کے لئے طلباء کا چناؤ، قابلیت کی بنیاد اور ان کے رجحان اور مختلف علاقوں کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ جس جنرل اسٹینڈرڈ کے تحت اس پیشے میں آنے سے قبل صلاحیت کو پرکھا جاتا ہے، اسے بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ ہمارے یہاں جو تفریق کلینیکل (CLINICAL) اور پری کلینیکل (PRE-CLINICAL) کی جاتی ہے۔ اسے ختم کیا جائے پڑھائی کے علاوہ عملی کام پر زور دیا جائے۔ اور سب سے اہم یہ کہ ہمارے معاشرے کو جس قسم کے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، اس قسم کے ڈاکٹروں کو تیار کیا جائے۔ امریکی یا یورپی ملکوں کے لئے ڈاکٹروں کی پیداوار کم کی جائے۔

چند مزید اقدامات جن کی اس کے علاوہ ضرورت ہے، وہ یہ ہیں کہ اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے۔ تجربہ گاہوں کے لئے زیادہ اور بہتر سامان فراہم کیا جائے۔ ٹیچنگ بیڈز (TEACHING BED) بڑھائے جائیں۔ لائبریریوں کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے اور اہم ترین قدم عملی تربیت کا یہ ہونا چاہیئے کہ طلباء کو (ON THE SPOT TRAINING) دی جائے خاص طور پر دیہاتوں اور گاؤں میں۔

۴۔ صحیح بات میرے خیال میں یہ ہے کہ جدید طب، طبِ مشرق کی ایک شکل (FORM) ہے بلکہ ہم یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ جدید طب، طبِ مشرق کا ایک ارتقائی درجہ ہے۔ لہٰذا دونوں میں تفریق ممکن نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ طبِ مشرق پر جمود طاری ہو گیا ہے جو کچھ باقی ہے، وہ اس بری طرح سے توہمات اور غلط نظریات میں گھرا ہوا ہے کہ اسے اس کی ابتدائی حالت سے باہر نکالنا ممکن نہیں۔ اگر آپ حکیموں اور ویدوں کو ہسپتال میں بٹھانا چاہتے ہیں تو دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طبِ مشرق کے پیروکار زیادہ تر صحیح کام نہیں کرتے بلکہ (EXPLOIT) زیادہ کرتے ہیں۔ اور ہمارے لوگوں کی مشرقیت اور ہمارے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہیں۔

ایلوپیتھی بیماریوں کا حل ہے اور قومی صحت کا انحصار بیماریوں سے بچاؤ میں ہے کیسی مخلوط نظام کو اپنانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

۵۔ یہ الزام غلط ہے موجودہ طریقِ علاج مہنگائی کے دور میں دوسری ضروریات زندگی کی طرح تھوڑا بہت مہنگا ضرور ہے، لیکن عارضی ہرگز نہیں ہے قوتِ خرید اور (PER CAPITOL INCOME) کے لحاظ سے بھی یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ الزام سراسر ایک (EXPLOITATION) ہے۔ اس وقت قومی صحت کی بہتری کے لئے ہمیں دقیانوسی طریقِ علاج پر نہیں بلکہ بیماریوں سے بچاؤ کی مہم پر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔

ایلوپیتھی عارضی طریقِ علاج نہیں بلکہ (SATISFACTORY) طریقِ علاج ہے کیونکہ ہماری کوشش اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ بیماری کا خاتمہ مکمل طور پر کر دیا جائے۔

۶۔ جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے کہ پہلے ان بیماریوں کا سدِباب ہو جو غربت افلاس اور جہالت کی وجہ سے پھیلتی ہوتی ہیں۔

جو کہ قومی پیمانے پر صحت کی حفاظت اور اسے بہتر بنانے کے ضروری اقدامات کیلئے تمام تر اختیارات و مسائل استعمال کر سکے۔ جو کہ موجودہ حکومت با آسانی کر رہی ہے۔ جیسا کہ تحصیل ہسپتال، ضلعی ہسپتال، تعلقہ ہسپتال وغیرہ بنائے گئے ہیں۔

پروفیسر ایم۔ اے۔ انصاری

۱۔ میرے خیال میں تعلیمی ڈھانچے کو اگر مکمل طور پر چلایا جائے تو کسی بھی ڈاکٹر کی اہلیت کو با آسانی ثابت کر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم ایک طریق کار پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر اس میں تبدیلیاں لانا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نہ تو پرانا طریق تعلیم اور نہ ہی نیا ڈھانچہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اور اس طرح سے جو ڈاکٹر تیار ہوئے ہیں وہ زیادہ تر اپنی سمجھ کے مطابق تربیت یافتہ ہو جاتے ہیں۔ تیار نہیں کئے جاتے۔

۲۔ طب کے تعلیمی معیار کو پست کرنے میں اساتذہ خصوصاً اور طلبا عموماً ذمہ دار گردانے جا سکتے ہیں۔ اساتذہ اس لئے کہ وہ طلباء کی تعداد کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ طلباء اس لئے کہ ان کے علم کی طلب میں اساتذہ مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔ اساتذہ کی کمی اور طلباء کی زیادتی تعلیمی معیار کو پست کرنے میں اپنا پورا کردار ادا کر رہی ہے۔

۳۔ جب تک ہم اساتذہ اور طلباء کی تعداد میں توازن اور جدید طریق تعلیم کو اپنا نہیں لیتے۔ اس وقت تک طبی تعلیم کے معیار کو بلند کرنا اگر ممکن نہیں تو

۶۔ مسائل کی فہرست خاصی طویل ہے۔ حفظان صحت اور بیماریوں کے بچاؤ کے شعبے پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ماحول کی صفائی (ENVIRONMENTAL SANITATION)، حفظان صحت کی تعلیم، متعدی بیماریوں کے حفاظتی ٹیکے، ڈاکٹروں کی عملی تربیت (جو کہ آئندہ ان مسائل کو حل کرنے کے اہل ہوں گے) وغیرہ نظر آتے ہیں۔ بیرونی ماحول کی صفائی کے ضمن میں پانی کی صفائی، گھر کے مسائل، گندے پانی کی نکاسی، غلاظت، گندگی سے نجات حاصل کرنے کے طریقے اور حشرات الارض سے بچاؤ کے طریقے وغیرہ شامل ہیں۔

متعدی بیماریوں میں ملیریا، چیچک، چکن پوکس، خسرہ، خناق، پولیو، پاگل کتے کے کاٹے کی بیماری، سانپ کا کاٹا، 'MUMPS'، کالی کھانسی، میٹنس (TETANUS) گردن توڑ بخار وغیرہ شامل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام مسائل کی شماریات جمع کر کے تجزیہ کیا جائے، تاکہ آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کی جا سکے۔

۷۔ فی الوقت قومی صحت کی بہتری کے لئے اشد ضرورت مکمل غذائیت سے بھرپور، خالص غذائی اجناس اور خوراک کی فراہمی، دور دراز علاقوں سے اسے اکٹھا کرنا اور مختلف علاقوں میں تقسیم کرنا وغیرہ ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہ غذائی اجناس معاشی حالات (یعنی قوت خرید، وغیرہ) کے لحاظ سے موجود ہوں اور ہر فرد تک پہنچ جائے۔ دوسرا اہم قدم قومی صحت کی بہتری کے لئے ہر فرد کے لئے سر چھپانے کی جگہ کی فراہمی ہے۔ وقت کی تیسری اہم ضرورت آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت ہے اور چوتھی ضرورت بیماریوں سے تحفظ اور قدرتی آفات سے بچاؤ کے اقدامات ہیں۔ گویا ہر فرد کے لئے بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی قومی صحت کی بہتری کے لئے اشد ضروری اقدامات ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہو کر قوم کو ایک صحت مند راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر خواجہ معین احمد

۱۔ میرے خیال میں مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر صحیح معنوں میں کوئی چیز نہیں بلکہ ڈاکٹر کی تعلیم تاحیات جاری رہتی ہے۔ تعلیم چاہے کسی بھی پیشے سے متعلق ہو۔ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ طالب علم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور اہلیت پیدا کرے لیکن جو صورتحال ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر بننے سے پہلے جو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے وہ کسی طرح بھی معیاری نہیں ہے اور طبی تعلیم کے دوران یہ کام ہم بہتر طور پر سرانجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ بیشتر دیگر ممالک کا بھی ہے۔ اس لئے آپ کی یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچے مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر تیار کرنے کا اہل نہیں ہے۔

۲۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ حصولِ تعلیم دو طرفہ ٹریفک ہے جب:۔ اساتذہ طلبا کو پڑھانے میں دلچسپی نہیں لیں گے اور طلباء اساتذہ کے قریب

سی اچھی باتوں کو بہت جلد بھلادیتے ہیں - لہٰذا ان باتوں کا اعادہ ضروری ہوجاتا ہے - دینی تعلیم ایک ڈاکٹر کیلئے کئی گنا زائد اہمیت رکھتی ہے - یہ ان میں اللہ کا خوف، دوسرے انسانوں سے مناسب سلوک، سخت محنت اور دیگر بے شمار خوبیاں پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے - لہٰذا دینی تعلیم سے ایک طرف جہاں طلبہ کا حسنِ اخلاق نکھرے گا - تو دوسری طرف انھیں اپنے وقت کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوسکے گا - اور یوں وہ وقت کو فضول ضائع نہ کریں گے -

(د) اساتذہ کو ہر لحاظ سے اپنے طلبہ کیلئے مثالی کردار ہونا چاہیئے - تو طلبہ کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کس طرح بھی انکی اپنی اولاد سے کم نہیں ہیں - میں اس ضمن میں کہنا چاہوں گی کہ والدین، طلبہ اور اساتذہ کی مشترکہ کوششوں سے ہی طبی تعلیم کا معیار بلند ہوسکتا ہے - اور میں اس سلسلے میں اپنے عزیز شاگردوں کو بھی یہ نصیحت کروں گی کہ طبی تعلیم کے اس طویل عرصے میں انتہائی محنت اور خلوص سے علم حاصل کریں اور بلا شبہ اللہ خلوص سے کام کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے -

اساتذہ اور طلبہ کی سخت محنت اور کاوشوں کے علاوہ مناسب لیبارٹری کی سہولتیں، نیز طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے مناسب تعداد میں اساتذہ کا تقرر اور کسی بھی حالت میں طلبہ کے قیمتی وقت کے زیاں کو روکنا، تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے انتہائی ضروری ہیں - یہ تمام عناصر مل کر ہمارے معزز پیشے اور ہمارے عزیز وطن کا وقار بحال کر سکتے ہیں -

(۴) ——— میں نہیں سمجھتی کہ ان دو طریقۂ علاج کو باہم ملایا جاسکتا ہے جب تک کہ اس بارے میں خاص تحقیق نہ کی جائے - ان تحقیقات کے بعد "طب مشرق" کی اگر کچھ ادویات سود مند ثابت ہوں تو انھیں پھر جدید طب میں شامل کر لیا جائے -

(۵) ——— مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس کا نقطۂ نظر ہے - ہاں البتہ یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ "طب مشرق" کی دواؤں سے مریض ذہنی طور پر اپنے آپ کو بہتر محسوس کرنے لگتا ہے جب کہ بیماری اندرونی طور پر بڑھتی چلی جاتی ہے - اور جب بیماری آخری حدود کو چھونے لگتی ہے - تو وہ پھر ہمارے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں - اکثر اوقات بیماری اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے - کہ انکا علاج ناممکن نہیں تو خاصہ مشکل ہوجاتا ہے - اسی طرح کچھ مریض بالکل آخری سانسوں میں لائے جاتے ہیں - اگر انکا انتقال ہو جاتا ہے - تو بعض لوگوں کو جدید طب کے خلاف ایک بے بنیاد پروپیگنڈے کا بہانہ مل جاتا ہے - ہمارے روزمرّہ کے مشاہدے میں کینسر کے انتہائی آخری حدوں کے مریض ADVANCED CARCINOMA OVARIAN TUMOURS, CERVIX FIBROIDS وغیرہ ہیں - مبتلا بہت سے مریض خاصے دیر سے ہسپتال سے رجوع کرتے ہیں -

(۶) ——— اس ضمن میں ہم مسائل کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں (الف) حفظانِ صحت کے وہ تمام تر اصول و طریقہ کار کہ جنکی بنیاد پر ہر طرح کی بیماریوں کو پیدا اور پھیلنے سے روک سکیں -

(ب) بچے اور ماں کی صحت کی نگہداشت :- ایک صحت مند ماں ہی ایک صحت مند بچے کو جنم دے سکتی ہے - اور اسکی پرورش کرسکتی ہے لہٰذا ماں کی صحت پر مستقبل میں قوم کی طبعی اور ذہنی صحت کا دارومدار ہوتا ہے -

(ج) خاندانی منصوبہ بندی :- خاص طور پر اگر ہم بچوں کی پیدائش کے درمیان مناسب وقفہ رکھیں تو پورے خاندان کی صحت کو گرنے سے بچایا جاسکتا ہے -

(۷) ——— اس سلسلے میں وہ تمام اقدامات جن کا ذکر پچھلے جواب میں کیا گیا ہے - اس کے علاوہ طبی تعلیم کو پہلی جماعت سے شروع کیا جائے - گاؤں کے لوگوں کو مختلف طریقوں سے مثلاً فلم، ریڈیو ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعے صحت کی بنیادی تعلیم دی جائے - نیز نئے ہسپتالوں کی تعمیر اور انکے لیے ضروری سہولتوں کو بہم پہنچانا - اور آمد و رفت کے ذرائع کے ایسے تمام وسائل کا اہتمام کرنا کہ مریضوں کو کم سے کم وقت میں نزدیک ترین بڑے ہسپتال تک پہنچایا جاسکے - جہاں تمام تر طبی سہولتیں میسر ہوں -

اس کے لئے ایک قومی طبی پالیسی کی اشد ضرورت ہے -

اس کے علاوہ جب ایک مرتبہ طلبہ کو کچھ مراعات دے دی جاتی ہیں۔ تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ مزید ہر قسم کی ناجائز مراعات بھی حاصل کرلیں۔ خواہ وہ اس کے مستحق ہوں یا نہیں مثلاً رعایتی نمبر وغیرہ، یہ تمام چیزیں مل کر تعلیمی معیار کو عرش سے فرش پر پٹک دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیمی معیار کے گرنے میں کس کا ہاتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اساتذہ اگر شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ کچھ سختی کا رویہ بھی رکھیں اور طلبہ کے والدین، اساتذہ سے مکمل تعاون کریں تو تعلیمی معیار کو گرنے سے روکنے میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

(۲) ——— جو کچھ میں نے پچھلے سوال کے جواب میں کہا ہے۔ وہی چیزیں طب کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ انکو مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

(ا) گھر پر طالب علم کی صحیح نشوونما، خاص طور پر ماں بچے کو صحیح تربیت دے اس سے خواتین کیلئے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے۔ اسمیں دینی تعلیم، اچھی عادات و اطوار، وقت کی پابندی، بڑوں کا ادب، اساتذہ کا ادب، بچوں کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو ضرور ذہن نشین کروایا جائے۔ کہ اساتذہ کا مرتبہ، والدین کے برابر ہوتا ہے اور انکی اتنی ہی عزت و تکریم کرنی چاہیئے۔ جتنی کہ اپنے والدین کی۔ انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے۔ کہ ایک عظیم ملک کے باشعور شہری ہیں۔ اور اس پر انھیں فخر کرنا چاہیئے۔ لیکن انہیں اپنے اس ملک میں ہونے والے تمام حالات و واقعات کا علم ہونا چاہیے۔ لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ انکی تعلیم بنیادی شے ہے۔ اور باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیئے۔ کہ وہ خواہ کسی بھی شعبے میں ہوں، اپنی محنت، قابلیت اور بہترین تعلیم ہی کے ذریعہ اس ملک کے معزز شہری بن سکتے ہیں۔ تاکہ ان پر انکے والدین اساتذہ، انکا ملک ناز کرسکے۔

جہاں تک ڈاکٹروں کا تعلق ہے۔ انھیں انسانیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہونا چاہیئے۔ وہ تمام بچے جنکا رجحان طب کی طرف مائل ہو۔ انکے ذہنی میں بچپن ہی سے مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس، قربانی کا جذبہ، انسانیت کی قدروقیمت پیدا کرنی چاہیئے۔ کہ وہ آئندہ ہر قیمت پر انسانی جانوں کا تحفظ کرسکیں۔ والدین و اساتذہ یہ احساسات شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ، معقول سختی کے ساتھ بچوں میں پیدا کرسکتے ہیں۔ اور انھیں یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرادینی چاہیئے۔ کہ اگرچہ ڈاکٹر کا مرتبہ بظاہر سوسائٹی میں بہت اونچا نظر آتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کی زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہوتی ہے۔ اسے اپنا آرام و چین، انسانیت کی خدمت پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کا پیشہ تمام پیشوں میں مقدس ترین ہے۔

اگر بچوں کو اس نہج پر تربیت دی جائے تو ہم دیکھیں گے۔ کہ انشاءاللہ آئندہ حالات موجودہ صورتِ حال سے خاصے بہتر ہونگے اور اچھے نتائج کی توقع کیجاسکے گی۔

اور

تضیع اوقات تو روکنے کیلئے مندرجہ ذیل اقدامات کیئے جاسکتے ہیں۔ (ا) طلبہ کے پاس انٹر سائنس کے بعد اتنا وقت ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنا وقت ضائع کریں کیونکہ اگر ایک مرتبہ وقت ضائع کرنے کی عادت پڑجائے تو چھڑانا انتہائی دشوار ہوجاتا ہے۔ نتیجہ نکلنے کے فوراً بعد وقت کے زیاں کو بچانے کیلئے، میڈیکل کالج میں داخلے شروع ہوجائیں۔

(ب) ایسے اقدامات کئے جائیں کہ جنکی وجہ سے امتحانات کسی بھی قیمت پر ملتوی نہ کرائے جاسکیں، امتحانات کا التواء بلاشبہ تعلیمی معیار کے زوال کا بنیادی سبب ہے۔ اس موقع پر میرے خیال میں بہتر صورت یہ ہوگی کہ ہم سال میں تین مرتبہ امتحانات لیا کریں اور طلبہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں سے کسی بھی ایک امتحان میں شریک ہوجائیں۔

(ج) طبی تعلیم کے دوران بھی دینی تعلیم باقاعدگی سے دینی چاہیئے۔ اگرچہ اس عمر کے طلبہ سے یہ امید کیجاتی چاہیئے۔ کہ انھیں تمام ضروری دینی تعلیم سے آگاہی ہوگی لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم بہت

کی روک تھام اور علاج - دیہی آبادی کے لیے بہتر عام طبی ضروریات کی فراہمی۔ ہمارے وہ مسائل ہیں جن پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

معیاری ڈاکٹروں اور کم تربیت ڈاکٹروں کی بحث میں میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا - لیکن اس کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے دیہاتوں میں جہاں ملک کی بڑی آبادی بستی ہے - آج بھی طبی سہولتوں کی بہت کمی ہے - اور کوئی انصاف پسند معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا - جب تک ملک کی آبادی کے ہر طبقہ کے ساتھ یکساں سلوک کی ضمانت نہ ہو اور میرے خیال میں انصاف پسند معاشرہ ہی نہ صرف ہماری طبی ضرورت بلکہ سب سے بڑی قومی ضرورت بھی ہے۔

پروفیسر میڈم زبیدہ عزیز

(۱) ______ مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر تیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - کیونکہ کوئی شخص بھی کسی شعبے میں "مکمل" نہیں ہو سکتا کجا کہ شعبہ طب میں ؟ جو کہ نہایت تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے - اصل مسئلہ تو ایسے ڈاکٹرز تیار کرنے کا ہے جو ہمارے اپنے عوام کی ضروریات کو پورا کر سکے - میرا اپنا خیال ہے کہ اگر طبی تعلیم میں زیادہ توجہ عملی تعلیم پر دی جائے - اور خاص طور پر طلبہ کو دیہی علاقوں میں تربیت دی جائے تا کہ وہ صرف شہری علاقوں کے لوگوں کی بیماریوں اور ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکیں بلکہ وہ دیہی علاقوں کے عوام کی مشکلات اور تکالیف کو بھی اچھی طرح سمجھ سکیں - اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مستقبل کے ڈاکٹرز دیہی علاقوں کے مسائل کے متعلق بہت کم جانتے ہیں - لہٰذا وہ دیہاتوں میں جا کر خدمت کرنے سے بھی کتراتے نہیں۔

(۲) ______ تعلیم کا سب سے پہلا گہوارہ ماں کی گود ہے، جب بچے کے کان میں پیدائش کے بعد اذان دی جاتی ہے تو اذان کے یہ الفاظ جو خدائے برتر کی عظمت کو بیان کرتے ہیں - بچے کی آئندہ زندگی کے لیے ایک واضح لائحہ عمل پیش کرتے ہیں - پھر بچے کے گھر کا ماحول ، اسکی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے - اسکے اسکول کا ماحول اور تعلیم اسکے نوخیز دماغ کو متاثر کرتے ہیں - اسی دوران بچے پر اسکی ماں کی تعلیمات اور کردار کا گہرا اثر ہوتا ہے - جب یہ نوجوان میڈیکل کالجز میں آتے ہیں - انکے ذہن مختلف انداز میں ڈھل چکے ہوتے ہیں - انہیں سے کچھ کے ذہن میں صرف سیاست ہی سمائی ہوئی ہے - غالباً انکے گھروں میں بھی سیاست ہی کا دور دورہ ہوتا ہے - اسکے علاوہ بھی چند ایک عوامل کارفرما ہوتے ہیں - جو طلبہ کو سیاست کی طرف دھکیل دیتے ہیں - مثلاً انہیں سے کچھ کو اچھے خاصے تعلیمی وظائف ملتے رہتے ہیں - لہٰذا انھیں رقم اور وقت کے زیاں کا کچھ احساس نہیں ہوتا - کچھ طالب علم گھروں سے دور ہوتے ہیں - اُنپر انکے والدین اور گھر کا اثر کم ہو جاتا ہے - یہ تمام عوامل ملکر چند طلباء کو غیر ذمہ دار بنا دیتے ہیں - اور انھیں سیاسی رنگ میں رنگ دیتے ہیں - انکی وجہ سے طلبہ میں دن بدن تعلیم کی طرف سے دھیان ہٹتا چلا جاتا ہے - اور وہ وقت پر امتحان دینے کیلئے تیار نہیں ہو پاتے - نتیجتاً وہ امتحانات کے التواء کی بھرپور کوششیں کرتے ہیں - اور بدقسمتی سے امتحانات بھی ملتوی ہو جاتے ہیں - جس کی وجہ سے اگلے امتحانات کے وقت پڑھنے والے طلبہ بھی تیاری نہیں کرتے کیونکہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ امتحانات ملتوی ہو جائیں گے - لہٰذا ابھی پڑھائی سے کیا فائدہ !

اس کے علاوہ طلبہ کی عمر کے حجز کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے - اس ضمن میں، میں محسوس کرتی ہوں کہ اساتذہ کو بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے - خاص طور پر ان اساتذہ کو جو تعلیم و تدریس پر سخت محنت کرتے ہیں - حتیٰ کہ وہ اپنی تعطیلات اور صحت تک کو قربان کر دیتے ہیں - وہ اپنی اس جانفشانی کے باوجود طلبہ کو اس بات پر آمادہ نہیں کر پاتے کہ وہ اپنی جوانی کے اس انتہائی قیمتی وقت کو نہایت اچھے طریقے سے استعمال کریں - طلبۂ کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا اور خاص طور پر اُن طلبہ کو، جنکے والدین معاشی طور پر اتنے مستحکم نہیں ہوتے کہ انکے طویل تعلیمی سلسلے کو آسانی سے جاری رکھ سکیں - لہٰذا اساتذہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کیلئے ضروری ڈاکٹر متعین وقت میں فراہم کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

جس انقلابی طریقے سے اضافہ ہوا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ ان اداروں کی داخلی ضروریات کی جلد از جلد تکمیل بھی ہو۔ یہ بات تو ہر سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ ہمارے معاشی ذرائع بڑی حد تک اس بارے میں مانع ہیں۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس طرح کسی سوسائٹی میں افراد کی کمی۔ اسکی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح افراد کی زیادتی اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ بالکل اسی طرح غیر مطمئن طلباء کی کثیر تعداد بہتر اور کم طلباء کے مقابلے میں ہمارے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے۔

(۴)، (۵) ـــــ سوال نمبر ۴ اور نمبر ۵ کا جواب ہم یک وقت دے سکتے ہیں۔ اوّل تو یہ باتیں بہت عرصہ تک زیرِ بحث رہ چکی ہیں۔ اور اس مسئلے کا کوئی پہلو بھی اب موجود نہیں ہے۔ جس پر پوری طرح اظہار رائے نہ ہو چکا ہو۔ بہر حال اگر اسی سلسلے میں آپ میری ذاتی رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں تو اور بات ہے۔

میرے خیال میں طبِ مشرق ایک بے معنی بات ہے یہ تو صرف ایک (SLOGAN) نعرہ سے زیادہ کچھ نہیں جو آپ کی اور ہماری طبیعت سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ طب نہ مشرق کا نہ مغرب کا۔ طب صرف طب ہے جس کا مقصد ایک ہے۔ پھر جو حضرات طب مشرق کی تائید میں۔ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ وہ بھی اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ اس کا ماخذ قدیم یونان تھا۔ نیز جو حضرات ان میں سمجھدار ہیں وہ بھی اسی بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ نا تو ان کی اناٹومی ANATOMY درست ہے نہ فزیالوجی PHYSIOLOGY اور نہ امراض کی پیتھالوجی PATHOLOGY قابلِ تسلیم ہے۔ اور نہ ہی تشخیص کے طریقے۔ اس بات کی یوں بھی توثیق ہوتی ہے۔ کہ جتنے بھی اچھے یونانی طبیہ کالج ہیں۔ ان علوم کی تعلیم کے لئے ایلوپیتھی کے علوم ہی سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اب اگر کوئی فرق رہ جاتا ہے تو وہ ادویہ کی حد تک ہی محدود ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان ادویہ کی اکثریت مقامی جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہے اس لئے ایلوپیتھی کی ادویہ کے مقابلے میں کم قیمت طریقۂ علاج ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی کم اثر بھی ہے۔ نیز آجکل تو بہت سے طبِ مشرق کے حکیم، خواہ اس امر کا اعتراف کریں، یا نہ کریں مگر یہ امر واقعہ ہے کہ کافی ایلوپیتھی کی ادویہ استعمال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں تو طبِ مشرق QUACKERY کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کو بند کر دینا چاہیئے۔ یہ اور بات ہے کہ ملک کے جن حصوں میں ابھی تک ایلوپیتھی طریقہ نہیں پہنچ سکا ہو یا جو لوگ اس طریقہ علاج کو حاصل کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ ان کیلئے کوئی بھی چیز جو دوا کے طور پر دی جائے۔ مثلاً پڑھا ہوا پانی، یا گنڈے تعویز بھی اگر علاج کا ذریعہ نہ بھی ہوں تو شفا کی امید اور ذہنی سکون کا ذریعہ ضرور ہو سکتے ہیں۔ ہاں اس بات سے کوئی بھی سمجھدار انسان انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح فارماکولوجی (PHARMACOLOGY) یا علم الادویہ میں رات دن ریسرچ ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں مقامی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور طب میں ان کی افادیت پر زیادہ سے زیادہ کام ہونا چاہیئے۔ اور اس میں جو بھی چیزیں مفید پائی جاتی ہیں۔ ان کو ایلوپیتھک فارماکولوجی میں شامل کر لیا جائے اس طرح نہ صرف ادویہ کی قیمت کم ہو سکے گی بلکہ یہ ہمارے لئے ایک قومی اعزاز اور فخر کا باعث بھی ہوگا۔ میری رائے میں میڈیکل کالج کے فارماکولوجی شعبہ میں ایک حصہ اس ریسرچ کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

(۶) (۷) ـــــ سوال ۶ اور ۷ پڑھ کر میرے جیسے [illegible] ہے کیونکہ پاکستان جیسے صنعتی اور معاشی طور پر پست ملک میں ان مسائل کو طبی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جو قومی صحت کے لئے اشد ضروری ہوں۔ ہمارے لئے یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ہمارے قلیل اخراجات زیادہ سے زیادہ ہموطنوں کو فائدہ پہنچائیں۔ کینسر، امراضِ قلب جیسی بیماریوں پر زیادہ رقم خرچ کرنے کے بجائے عام امراض کے انسداد اور علاج پر زیادہ رقم خرچ کی جائے۔

صحت کے بارے میں عام معلومات کی فراہمی، غذا میں ملاوٹ کی روک تھام پر زیادہ سے زیادہ توجہ، ہر آبادی کے لئے صاف پانی کی فراہمی، ملیریا، تپ دق اور ان جیسی عام بیماریوں

بجائے امریکی تعلیم طریقہ اور امتحانات یا سمسٹر سسٹم کی ترویج پر زور دیا جا رہا ہے لیکن جو بنیادی باتیں یہی ہیں۔ اِن پر کم غور کیا جاتا ہے جب تک طلباء و اساتذہ دونوں یکسوئی اور ایمانداری سے محنت کیلئے تیار نہ ہوں اس وقت تک کوئی طریقۂ تعلیم بھی بہتر نتائج کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

(۲) ——— تعلیمی معیار کی پستی صرف طبی تعلیم سے ہی مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ اور تعلیمی معیار کی پستی میں اگر طلباء اور اساتذہ دونوں کی ذمہ داری تسلیم کرلی جائے تو پھر بھی میرے خیال میں پورا معاشرہ ہی موردِ الزام ٹھہرے گا۔ دراصل کسی قوم کا ماحول اور اسکے معاشرے کی اقدار، قوم کے افراد کی تعلیم و تربیت، التمیز و عزیب میں سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اور اِن کا تعلق قوم کے رہنماؤں اور اِن کی پالیسیوں سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اب اگر ایک طالب علم دیکھے کہ وہ تحصیلِ علم کیلئے جدوجہد کرنے سے زیادہ دوسرے طریقوں سے اپنا مقصد حاصل کرسکتا ہے۔ اور اگر ایک استاد یہ محسوس کرے کہ معاشرے میں اسکی وقعت اور ترقی کا راز، محنت، علمی مشاغل میں دلچسپی اور ایسے فرائض منصبی کی بجا آوری سے زیادہ دوسری باتوں پر منحصر ہے تو تعلیمی معیار کس طرح ٹھیک ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں صحیح اقدار کی ترویج ہی ہماری قوم کے بہتر مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ بات ضرور خوش آئند ہے کہ گزشتہ چند دنوں سے پالیسی میں ایسی تبدیلیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ جن سے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے قومی رہنماؤں نے ایک حد تک اِن نقائص کا احساس کرلیا ہے اور اِن کو دور کرنے کی کوشش شروع ہوگئی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب تک تعلیمی اداروں میں پھر نظم و ضبط قائم نہ کیا جائے، جس وقت تک طالب علم کو اس بات کا مکمل یقین نہ ہو جائے کہ اسکے ضروری اور واجبی بلکہ جائز مطالبات پر ہمدردی سے غور ہوگا۔ اور ناجائز اور غیر واجبی مطالبات سختی سے رد کردیئے جائیں گے۔ جب تک اساتذہ کو معاشرہ میں باعزت مقام کی ضمانت نہ ہوگی۔ جب تک وہ اس بات کو یقینی طور پر محسوس نہ کرلیں کہ ان کی ترقی کی ضمانت صرف اس علمی اور تعلیمی فرائض کی بجا آوری میں ہی مضمر ہے اور اس سلسلہ میں وہ جو کوشش کریں گے اس میں انتظامیہ بلکہ پوری قوم ان کی واجبی تائید کرے گی۔ اور جب تک ہماری سیاسی جماعتیں، تعلیمی اداروں اور طلباء کو ان کی تعلیم کیلئے مخصوص نہ رکھیں گے بلکہ اپنی سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اِن کا استعمال کرنے کے لئے کوشاں رہیں گے۔ نہ عام تعلیم کا معیار بہتر ہو سکتا ہے اور نہ طبی تعلیم کا معیار۔

اگر اِن حقیقت پسندانہ نکات کو سامنے رکھا جائے تو طلباء و اساتذہ کو ہم مطلق قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

(۳) ——— تعلیمی معیار کی بہتری کی بات کچھ تو اِس سے پہلے ابھی ہو چکی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ طب کی تعلیم کا معیار عام تعلیم کے معیار سے کس طرح بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ ——— نیز یہ موضوع بھی کافی طویل ہے اس لئے فی الحال میں اِن باتوں کا ذکر تو نہیں کرونگا۔ تو عام تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے ضروری نہیں ہیں۔

اس میں سب سے ضروری بات جو ہر شخص کو ذہن نشین کرنی چاہیئے۔ یہ ہے کہ طب کی کتابی اور عملی دونوں طرح کی تعلیم ضروری ہے۔ کتابی تعلیم تو کتابیں پڑھنے سے بڑی حد تک ہر طالب علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے فی زمانہ لیکچروں کی کثرت کو طبی تعلیم کے لئے ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن عملی تعلیم کے بغیر کوئی بھی طب کا طالب علم کسی کام کا نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارے موجودہ طرزِ تعلیم میں یہ کمی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ طلباء کی کثیر تعداد اساتذہ کی شدید قلت، محنت سے ہر دو کی عدم دلچسپی، عملی کام کی سہولتوں کا فقدان، بنیادی تعلیم کا پست معیار۔ غیر تعلیمی دلچسپیوں کی کثرت اور سب سے زیادہ ڈسپلن کا مکمل فقدان۔ وہ چند اسباب ہیں جن کو دور کیئے بغیر بہتر تعلیمی معیار کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ گذشتہ چند سالوں میں ہم ایک زبردست قومی سانحہ کا شکار ہوئے اور اس کے بعد ایک انقلابی دور کی ابتداء ہوئی اور آجکل کی دشواریاں بڑی حد تک ان ہی وجوہات کے سبب ہیں۔ امید ہے کہ جوں جوں یہ ہیجانی دور ختم ہوگا۔ حالات بہتر ہوتے چلے جائینگے۔ طبی تعلیم کے اداروں میں گذشتہ چند برسوں میں

کہ ان ضروریات کو، ان کی اہمیت کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ تیسرا قدم یہ کہ تعلیمی معیار کے ڈھانچے کو بدل کر ان ضروریات سے مطابقت پیدا کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اداروں میں بہتر نظم وضبط اور بہتر کارکردگی کی طرف توجہ دی جائے۔ طلبا سے یہ امید خاص طور پر کی جاتی ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف خاص توجہ دیں۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنا دراصل ان کے مفاد میں ہے۔ لہٰذا خود ان کو تعلیمی معیار بلند کرنے میں مثبت کردار ادا کرنا چاہیئے۔

۴۔ ہرگز نہیں۔ صرف سائنٹیفک طریقۂ علاج سے ہی ان طبی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ میرے خیال سے یہ الزام قطعی غلط ہے۔ صحت کی قیمت کا تعین سکوں میں نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت وبائی صحت کو حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اتنی ہی اہمیت بیماریوں کے سدباب کی ہے جس میں بچوں کی صحت کا خاص مقام ہے۔ تیسرا مقام انڈسٹریل ہیلتھ کو ہے کیونکہ پاکستان آہستہ آہستہ صنعت کی جانب قدم بڑھا رہا ہے اور مزدوروں کی صحت ملک کے مفاد کے لئے بیحد ضروری ہے۔

ایک اور اہم طبی مسئلہ نرسز اور پیرا میڈیکل اسٹاف اور تکنیکی ملازمین کی کمی ہے میرے خیال میں یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ اس پر نسبتاً زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹروں کی کمی کو پورا کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا اسٹاف کی تربیت بہت اہم ہے۔

ان مسائل کے علاوہ عطائی علاج کا خاتمہ، دواؤں کی صحیح درجہ بندی (STANDARDIZATION) اور کوالٹی کنٹرول، جھوٹے میڈیکل سرٹیفیکٹوں کے اجرا کا سدباب، صرف سند یافتہ ڈاکٹروں کے نسخوں سے ادویہ سازی اور ادویات کی فروخت، بغیر نسخوں کے دواؤں کی خرید و فروخت پر پابندی، مناسب قیمتوں پر صحیح ادویات کی دستیابی، بہتر اور خالص غذا اور بہتر حفظانِ صحت کے اصولوں پر کاربندی، ہمارے ملک کو درپیش اہم ترین طبی مسائل ہیں۔

۷۔ سوال نمبر ۶ میں بیان کردہ مسائل کے علی الترتیب حل میرے خیال میں قومی صحت کی بہتری کے اہم ترین اقدامات ہوں گے۔

پروفیسر ایس۔ اے۔ ایچ۔ رضوی

(۱) ——— سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک ایسے فن میں جس کے لئے علمی قابلیت اور عملی صلاحیت دونوں ضروری ہوں اور جو بیک وقت سائنس بھی ہو اور آرٹ بھی ——— مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر کا تصور کافی تشنہ ہے۔ اگر اس سے آپ کی مراد ایسے ڈاکٹر سے ہے جو کہ مریض کی عام معمولی شکایتوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی صلاحیت بھی رکھتا ہو کہ غیر معمولی بیماریوں کی ابتدا ہی میں تشخیص کر کے ان کے ماہرین سے مشورہ حاصل کر سکے۔۔۔۔ تو میری رائے میں موجودہ تعلیمی ڈھانچہ اس کام کی تکمیل کی صلاحیت ضرور رکھتا تھا۔ لیکن خود ہم نے اس کا حلیہ ایسا بگاڑا ہے کہ آجکل کا تربیت یافتہ ڈاکٹر اس کام کے لئے نااہل نظر آتا ہے۔

دراصل لوگ جب تربیت یافتہ ڈاکٹر کی بات کرتے ہیں۔ تو اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ صرف پانچ سال اس میڈیکل کالج میں گذارنا اس پیشے کی تربیت کی تکمیل نہیں ہے۔ بلکہ ان پانچ سالوں میں کماحقہ کام کرنے اور علمی اور عملی دونوں شعبوں میں پوری دلجمعی سے محنت اور مصروفیت ہی سے تربیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے بہت کم طالب علم اس کے لئے تیار ہیں۔ نیز ایک ایسے علم میں جس کی سرحدیں دن رات تیزی سے پھیل رہی ہوں۔ ذہین اور محنتی طالب علم کیلئے بھی تربیت کی تکمیل مشکل ہے۔ پھر اکثر لوگ جب آجکل کے نوجوان ڈاکٹر کی نامکمل تربیت کی بات کرتے ہیں تو اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ جن تجربہ کار ڈاکٹروں سے ان کا تقابل کیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ بلکہ برسوں تک کام کرنے کے بعد لاشعوری طور پر بھی، بہت کچھ سیکھ چکے ہیں۔

مزید یہ کہ ہیئت کی تبدیلی سے بنیادی تبدیلیاں نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً آجکل برطانوی طریقہ تعلیم اور امتحانات کے

۴ - سب سے پہلی بات یہ ہے کہ طلباء جب میڈیکل کالج میں آئیں تو یہ سمجھ کر آئیں کہ وہ کس مقصد کے لئے آئے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ڈاکٹر بننے کے لئے آئے ہیں - اس لئے وہ زیادہ تر وقت اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے میں صرف کریں اور جتنے مواقع حاصل ہو سکیں، اُن کو بروئے کار لائیں - مثلاً کلاس میں لیکچر سے فائدہ اٹھائیں - لائبریری میں کتابوں سے استفادہ حاصل کریں - میوزیم میں طبی نمونوں کا مطالعہ کریں - اور صرف اس مقصد سے یہاں بیٹھیں - اساتذہ سے کلاسوں سے باہر ملنے کی کوشش کریں - اور اپنی بحیثیت جماعت یا بحیثیت فرد کے جو مشکلات درپیش ہوں ان کا حل تلاش کریں - اس سلسلہ میں اساتذہ سے مدد لیں - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر وقت اس خیال کو روبرو رکھیں کہ ان کی تعلیم خود ان کی ذمہ داری ہے -

ایسی صورت میں جن چیزوں کی تعلیم کے فروغ میں ضرورت ہے مثلاً تجربے گاہ اور اس کے اثاثے، اساتذہ، کتابیں، میوزیم اور سمع بصری آلات کی فراہمی، ان تمام چیزوں پر زور دیں اور مزید تعلیمی رکاوٹیں ہٹانے میں مدد کریں -

اساتذہ اپنی جگہ انفرادی طور پر ہر طالب علم سے رابطہ قائم کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے میں برابر کا حصہ لیں اور اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھیں کہ طلباء کی خود کیا رائے ہے، اور اس رائے کو پوری اہمیت دیں تاکہ ہر طالب علم اپنی تعلیم کے نظم و ضبط اور حصول میں برابر کا حصہ دار ہو جائے یہی طریقہ اب ساری دنیا میں فروغ پا رہا ہے - اس کے مطابق اب بڑی بڑی کلاسز میں لیکچر لینا اور اسی پر اکتفا کرنا بالکل نامناسب سمجھا جاتا ہے مختصراً اساتذہ طلبا کے درمیان تبادلۂ خیالات پر زیادہ سے زیادہ زور دینے سے پہلے ہی معیار تعلیم کو اونچا کیا جا سکتا ہے -

۵ - میرے خیال میں ایلوپیتھی نہ مہنگا ہے نہ عارضی طریق علاج ہے - اگر صحیح طریقے اور انسانی خدمت کے جذبے سے ڈاکٹر ہر روز اپنا تھوڑا سا وقت فلاح عام میں دیدے تو دواؤں کی قیمت میں میرے نزدیک کوئی زیادہ فرق نہیں رہے گا -

۶ - میں نے ان مسائل پر زیادہ نہیں سوچا - اس لئے اپنی رائے نہیں دے سکتا - لیکن پھر بھی جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں - اس وقت قوم کا سب سے بڑا مسئلہ انسداد طب ہے - اس میں صاف پانی کی فراہمی، فضلہ کی نکاسی، رہائشی مکانات، غذا اور لباس کی فراہمی وغیرہ شامل ہے - اس کے علاوہ وبائی بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکوں وغیرہ کا مناسب انتظام اشد ضروری ہے -

۷ - سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہر شخص صبح سے شام تک اپنی ذمہ داریاں اور اپنے کام بخیر و خوبی سرانجام دے -

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ ایک آدمی کماتا ہے دس کھاتے ہیں اور یہیں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں - اسلئے رزق کے حصول اور اقتصادی مسئلوں کے حل کے بعد ہی صحت کا ضمنی مسئلہ حل ہو سکے گا -

پروفیسر فضل الٰہی

۱ - یہ بات صحیح ہے کہ ملک کی موجودہ اقتصادی اور سماجی ضروریات کے مطابق آج کل کا تعلیمی ڈھانچہ مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر تیار کرنے کا اہل نہیں ہے - کیونکہ ہماری زیادہ تر آبادی دیہات میں ہے اور ان کے علاج معالجہ اور دیکھ بھال کے لئے میڈیکل کالجوں کی تعلیم و تربیت اس پہلو کو اگر نظرانداز نہیں تو کافی حد تک پس پشت ڈال دیتی ہے -

فی الوقت زیادہ تر زور بیماریاں دور کرنے پر دیا جاتا ہے - بیماریاں روکنے پر نہیں - بیماریوں کا سدباب دراصل وقت کا تقاضا ہے اور دنیا بھر میں اس پر توجہ دی جا رہی ہے - لہٰذا ہمیں بھی ملکی ترقی و خوشحالی کی خاطر وقت کا ساتھ دینا ہوگا -

۲ - یہ درست ہے کہ ماحول کچھ اس قسم کا ہو گیا ہے کہ تعلیمی معیار کو بلند کرنے والے محرکات بروئے کار نہیں لائے جا رہے اور اس کے ذمہ دار یقیناً طلباء و اساتذہ دونوں ہیں -

۳ - طب کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے سے قبل ہمیں اولاً نئے سرے سے اس کا تعین کرنا ہوگا کہ ملکی ضروریات حقیقتاً کیا ہیں - دوسرا قدم یہ ہوگا

اساتذہ کیا کہتے ہیں؟

۱۔ کیا یہ بات درست ہے کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچہ مکمل تربیت یافتہ ڈاکٹر تیار کرنے کا اہل نہیں ہے؟

۲۔ طب کے تعلیمی معیار کو پست کرنے میں طلبا و اساتذہ دونوں ذمہ دار ہیں، یہ تاثر کہاں تک درست ہے؟

۳۔ تعلیمی معیار کو مزید بہتر بنانے کیلئے کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

۴۔ کیا طب مشرق اور طب مغرب کو ملا کر پاکستان کے طبی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

۵۔ طب مشرق کی جانب سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ایلوپیتھی ایک مہنگا اور عارضی طریقۂ علاج ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

۶۔ نسبتاً زیادہ اہمیت کے حامل پاکستان کے طبی مسائل کون کون سے ہیں؟

۷۔ قومی صحت کی بہتری کے لئے کون کون سے اقدامات اشد ضروری ہیں؟

کے طالب علم ہیں اور چونکہ امتحان سر پر آچکے ہیں لہذا آپ کے پاس
کچھ پوچھنے کے خیال سے آتے تھے تاکہ ہم بھی آپ سے فیضیاب ہوں۔
شاید میڈیکل کالج کے ذکر سے انہیں اپنا زمانہ یاد آگیا۔ اور
شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنے محبوب کی ANATOMY اور
PHYSIOLOGY بیان کرنا شروع کر دی ؎

UPPER LIMB. کے بارے میں فرمایا ؎

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں۔

انگلی کی ANATOMY. با فائدہ ناخن کے RELATION کے
ساتھ بتائی ؎

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال۔
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا۔

اور ناخن کی GROWTH کے بارے میں فرمایا فٹ نوٹ کے
طور پر ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا۔
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا۔

گردن کا ذکر دفعہ ۳۰۲ کے تحت کیا ؎

نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر۔
رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا۔

جبین تر (Physiology of Sweating) یوں سمجھائی

؎ تر جبین رکھتی ہے شرم قطرہ سامانی مجھے۔
موج گرداب حیا ہے حسن پیشانی مجھے۔

چشم تر LACRYMATION کے بارے میں ارشاد ہوا

؎ ہر اشک چشم سے اک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے۔
یہ بند گریہ ہے ہر نقش آب اندیشۂ خنن کا

چہرے کے متعلق بولے ؎

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا!

آخر میں انہوں نے C.V.S کو لیا۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے
ہیں کہ ڈاکٹر غالب ماہر امراض دل و جگر ہیں اسی لئے انہوں نے
اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سب سے پہلے انہوں نے
ثابت کیا کہ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی
بھی بنیادی اہمیت ہے ؎

شعر کی فکر کو اسد چاہیئے ہے دل و دماغ
عذر یہ ہے کہ فسردہ دل بے دل و دماغ ہے

پھر انہوں نے HEPATIC CIRCULATION کا ذکر کرتے
ہوئے کہا۔ دل اور جگر میں خون کی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے
جگر سے یہ خون بذریعہ INF. VENA CAVA دل تک
پہنچتا ہے۔ گویا ؎

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خون ہے اب۔
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا۔

افعال خون (FONCTIONS OF BLOOD) کے لئے
انہوں نے ایک اچھوتا نظریہ پیش کیا۔ جو آج تک کسی سے رد
نہیں ہو سکا یعنی ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے۔

ڈاکٹر غالب نہ صرف بلند پایہ فزیشن ہیں بلکہ ایک کامیاب سرجن
بھی ہیں۔ انہوں نے تبدیلی قلب کے کئی کامیاب آپریشن کئے ہیں
جس میں انہوں نے روح کی روح دوسرے جہاں تک پہنچا کر
اسے سکون ابدی عطا کیا۔ اس ضمن میں یہ امر دلچسپی سے خالی
نہ ہوگا کہ شہر میں ڈاکٹر غالب کا ایک ذاتی (HEAR BANK
ان کے محبوب کے نام سے قائم ہے جہاں سے وہ مستحق لوگوں کو
مفت دل فراہم کرتے ہیں ؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جان اور

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

اگر آپ مسیحائی کا اتنا بڑا دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے درد کی دوا کیوں نہیں کر لیتے"؟ ہمارے اس سوال پر وہ مسکرائے اور پھر راز دازی کے انداز میں گویا ہوئے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا۔

ہم ان کی بات کا مدعا یہ سمجھے کہ ڈاکٹر غالب کا مشورہ درد کے ہر مریض کو عشق فرمانے کا ہوگا اور لہٰذا ایک اور سوال داغ دیا "یعنی آپ کے مرض کی دوا مرض ہی میں پنہاں ہے"۔ وہ ہماری گتھی سلجھاتے ہوئے بولے "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں علاج بھی ممکن ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ .... ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی!
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی"

OH! I SEE ہم مسکرائے "کون ہے وہ ظالم جس نے آپ کا قرار لوٹ لیا؟ آپ جانے بھی دیجیے"۔ ڈاکٹر صاحب ذرا دبے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے ؎

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضے کا۔

ہم موقع غنیمت جان کر بولے "عشق پر آپ نے کافی ریسرچ کی ہے کچھ ہمیں بھی اس کے بارے بتائے" ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر ایک پُر الیکچر دے ڈالا۔

ایک خطرناک بیماری ہے جس کے جراثیم کو صنفِ نازک سے زیادہ لگاؤ ہے۔ اس کا خطرہ ۱۶ سال SWEET SIXTEN کے بعد بہت بڑھ جاتا ہے حال ہی میں اس کا ایک تعلق تعلیم سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ تجربات و مشاہدات سے ثابت ہوا ہے کہ بہتر اور مخصوص تعلیمی ماحول (مثلاً میڈیکل کالج یونیورسٹی وغیرہ) اس بیماری کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں!

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس مرض کا تعلق صرف دل و جگر سے ہے لیکن جدید تحقیقات اور انکشافات سے عیاں ہے کہ دماغ کے نچلے حصہ میں (MEDULLA) میں ایک مرکزِ عشق LOVE - STIMULATING CENTER پایا جاتا ہے بیماری کی اصل تخلیق گاہ یہی مرکز ہے۔ پکچرز، ٹی وی پروگرام کلچرل شو اس مرض کو ہوا دیتے ہیں۔ زخم کو ناسور بنا دیتے ہیں اور آخری ادوار میں نظامِ دماغی میں بھی خلل واقع ہوتا ہے اور یوں یہ مرض خطرناک ہو جاتا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل۔
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک محترمہ کلینک میں داخل ہوئیں! ہم حسبِ عادت اُن کا حدود اربعہ دیکھنے میں محو ہو گئے عمر یہی برس سولہ کا سن تھا ستر ہ کا۔ شکل و صورت کی بھی ایسی بری نہ تھیں، کم از کم ہمیں تو اچھی ہی لگیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے اپنا مرض یوں بتایا "ڈاکٹر صاحب! عجیب پریشانی میں ہوں سونے کی بہت کوشش کرتی ہوں لیکن خدا جانے کیا بات ہے نیند ہی نہیں آتی" ڈاکٹر غالب بولے ...... اری نیک بخت ...... ؎

موت کا ایک دن معین ہے۔
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

آخر کیا پریشانی لاحق ہے؟ تھوڑی دیر تک وہ سوچتے رہے اور پھر بولے ہوں!! اب میں سمجھا .... ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں۔
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں!!

پھر بھلا تجھے نیند کیسے آئے؟ اب تو تیرا علاج وصالِ یار میں ہی پنہاں ہے۔ ورنہ ؎

پھر ایک دل کو بے قراری ہے۔
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے۔

جب ڈاکٹر صاحب اپنی مریضہ کو رخصت کر چکے تو ہم مطلب کی بات پر آئے اور ان سے درخواست گزار ہوئے کہ صاحب ہم میڈیکل کالج

ڈاکٹر اے کے غالب کی کلینک میں

شکیل احمد سال سوم (ایم بی بی ایس)

صاحبو! ہماری درس گاہ مسیحاؤں کی بستی ہے۔ ہر شخص ابنِ مریم اور بوعلی سینا سے بڑھ کر ہے لگن بس ایک ہی ہے۔ **شفا**۔ مرض کو مٹا دینا۔ درد کی دوا دینا۔ لیکن ہماری ملاقات ایک ایسے ڈاکٹر صاحب سے بھی ہوئی جو درد کو بڑھانا ہی علاج سمجھتے ہیں یقیناً آپ حیران ہو رہے ہوں گے، یہ ڈاکٹر ہومیو پیتھی طریقہ علاج کا پیرو، یا طبِ مغرب کے نظریات کا حامل جو بجائے مرض کا علاج کرنے کے اُسے بڑھانے کے درپے ہے، آیئے ہم آپ کو بھی ملائیں ان ڈاکٹر صاحب سے جن کا علاج کے بارے میں نظریہ ہے کہ ؎

"دَرد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

ڈاکٹر صاحب موصوف معالج امراض ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے متعلق تین اور بلند بانگ دعوے بھی ہیں ؎

ہم چونن شاعر و صُوفی و نجومی و حکیم
نیست دردِ ہر قلم مُدعی و نکتہ گو است

پہچانا آپ نے؟ جی ہاں یہی ہیں مشہور فزیشن اور سرجن ڈاکٹر اسد اللہ خاں غالب F.R.C.P (فیلو آف رائل کالج آف پوئٹری) ماہر امراضِ قلب و جگر، معالج آشوبِ چشم و گوش۔ آیئے ہم آپ کو ان کے کلینک جانے اور گفتگو کرنے کا حال سُناتے ہیں۔

ڈاکٹر غالب کا کلینک "اُدبستان" کے مشہور شہر "اردو نگر" میں واقع ہے، اردو نگر داخل ہوں تو ایک طرف "شاہراہِ لکھنؤ" ملتی ہے اور دوسری جانب "شاہ راہِ دلی"۔ شاہراہِ دلی پر آپ کو کوچۂ نیرنگِ خیال ملے گا۔ اسی کوچے کی ایک شاندار حویلی میں ڈاکٹر صاحب کا کلینک ہے

ہم جب ان کے کلینک پہنچے، تو ڈاکٹر غالب نہایت پرتپاک انداز سے ملے۔ اور زیرِ لب گنگنائے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"

وہاں پہنچتے ہی ہمارے ذہن میں پہلا سوال یہ اٹھا کہ باوجود ایک ڈاکٹر ہونے کے وہ خود بیمار رہتے ہیں، آخر کیوں؟ ہمارا سوال سُن کر انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے ؎

"پوچھ مت بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا"

مزید استفسار پر عجیب انکشاف ہوا ؎

عیادت سے اسدؔ میں بیشتر بیمار رہتا ہوں۔
سبب ہے، ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ فتن کا

اب ہم دُوسرے موڈ میں آچکے تھے لہذا ہماری طبیعت کچھ یوں گدگدائی ڈاکٹر صاحب! آپ کے کلینک میں مریضانِ عشق کا ہجوم رہتا ہے آپ انہیں شفا بخشنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ذرا ہمیں بھی تو اس کا...... ابھی ہماری بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا ؎

تُو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں۔
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج ؟

بہت خوب! بہت خوب!! ہم ان کے اس منطقی استدلال سے کافی محظوظ ہوئے لیکن جناب ہم بھی ترکی بہ ترکی بولے"۔

مشہور عالم شوپنہار نے کہا ہے کہ جو کبھی ہوٹل میں نہیں گیا وہ یا تو پاگل ہے یا دیوتا۔ شہرہ آفاق مصنف برنارڈ شا کا کہنا تھا کہ وہ ہوٹل کی چائے بہت پسند کرتا ہے، کیونکہ اس میں سے مکھی نکلتی ہے۔

ہوٹلوں کے نام بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں مثلاً کیفے ڈھی فلاں، ہوٹل بہارِ گلستان، لکھ پتی ریستوراں، کروڑ پتی ریسٹورنٹ اور اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل وغیرہ۔ بعض جگہوں پر کالو ہوٹل بھی پائے جاتے ہیں۔

ہوٹلوں میں ٹپ بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ چار آنے بھی ہو سکتی ہے اور چار روپے بھی اور یہ چالیس روپے بھی ہو سکتی ہے۔ گر ایسی صورت میں گاہک کا پتے ہوئے ہونا شرط ہے۔ سُنا ہے بیروں کی تنخواہ تو بس یونہی سی ہوا کرتی ہے، اصل کمائی تو ٹپ کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ اور یہ آمدنی ہزار روپیہ ماہوار تک بھی ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بیروں کی جگہ کے لئے دس دس اور بیس بیس ہزار روپے پگڑی کے بھی چلتے ہیں۔

ایک صاحب نے بیرے کو بلا کر شکایت کی کہ کافی میں کوئی کیڑا تیر رہا ہے۔

"صاحب! یہ تو بہت چھوٹی چیز ہے۔" بیرے نے کہا۔

"تو کیا ہوا، بہر حال یہ گندگی تو ہے!"

"حیرت ہے صاحب!" بیرے نے کہا۔ "سڑے ہوئے گوشت جیسی بڑی چیز پر آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کیڑے جیسی چھوٹی چیز پر شکایت ہے آپ کو!" سنا ہے وہ صاحب پھر کبھی ہوٹل میں نہیں دیکھے گئے۔

میرے ایک دوست ہوٹل میں مغز کبھی نہیں کھاتے، وجہ پوچھی تو بتایا کہ یہ ہوٹل والے دیکھتے دیکھتے کچھ نہیں۔ پاگل بکرا بھی کاٹ دیتے ہیں۔ بعض ہوٹلوں کے دروازوں پر لکھا ہوتا ہے "حقوقِ داخلہ محفوظ" میں نے اپنے ایک دوست سے، جن کے ہوٹل پر بھی یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں، پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

کہنے لگے "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جسے چاہیں اندر آنے دیں اور جسے چاہیں اسے نہیں۔"

"پھر تو تم ہر کسی کو داخل ہونے سے روک سکتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں! اگر ہم صرف انہیں ہی روکتے ہیں جنھیں گوشت کی پہچان ہے۔" میرے دوست نے کہا۔

ہوٹلوں کے بارے میں بیشمار لطیفے مشہور ہیں دراصل یہ لطیفے نہیں حقیقتیں ہیں کسی بھی ہوٹل کے مالک کو دیکھ لیں وہ کبھی اپنے ہوٹل کا کھانا نہیں کھائے گا۔ چائے میں مچھر نکلنے کی شکایت پر بیرا تھوڑی پر سر کھجائے گا اور پھر کہے گا: "صاحب! یہ ہمارے ہوٹل کا نہیں ہے۔" یا یہ کہ "صاحب دو آنے والی چائے میں مچھر ہی نکل سکتا ہے، ہاتھی نہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔

صوفیوں کا قول ہے کہ مالکِ ارض و سماء سے ملاپ کی تین منزلیں ہیں۔

اول :- ہوٹل

دوم :- ہسپتال

سوم :- قبرستان

واللہ اعلم بالصواب

غزل

★ آنسہ یاسمین محبوب۔ سالِ اول ★

دیئے کو دل کے جلاتے رہو کہ گلشن میں
چراغِ صبح درخشاں جلے جلے نہ جلے
اگر ہے موج تو زیر و زبر ہوئے جاؤ
کہ کل بھی فرصتِ طوفاں ملے ملے نہ ملے
تمہاری یاد تو دل کو عزیز ہے لیکن
چمن میں بوئے پریشاں رہے نہ رہے

"شراب یا چرس پی کر اندر آنا منع ہے"۔ (اتنا ہوش ہی کسے ہوتا ہے) "اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں"۔ (تو پھر کیا کریں) "تھوکنا منع ہے" (یہاں کوئی تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا) "کتوں کا داخلہ ممنوع ہے"۔ (کتے پڑھیں تو واپس چلے جائیں) کرسی پر پاؤں نہ رکھیں (میز پر رکھیں) صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے (خاص طور پر گاہک کی جیب کی) ملازموں کو تنخواہ روزانہ دی جاتی ہے۔ (ہمیں اس سے کیا)۔ پچاس اور سو کے نوٹ والے حضرات پہلے کاؤنٹر پر معلوم کریں (جیب کتروں کے لئے آسانی) فرش پر پان کی پیک نہ تھوکیں (دیوار پر تھوکیں) مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور بیرا ہوتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

چائنیز ہوٹلوں کے پیچھے بلیوں، چوہوں کی ہڈیاں اور ایرانی ہوٹلوں کے آگے ٹوٹا ہوا فرنیچر عموماً پڑا ملے گا۔ کچھ ہوٹلوں میں صرف طعام کا اور کچھ میں طعام و قیام دونوں کا بندوبست ہوتا ہے۔ بعض ہوٹلوں میں آرکیسٹرا۔ بعض میں فلمی ریکارڈ اور چند ایک میں قوالیوں کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ باقی ہوٹلوں میں بغلیں بجائی جاتی ہیں۔ شہر کے نصف ہوٹل بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے شہر کے بقیہ نصف ہوتے ہیں۔ کچھ ہوٹلوں میں برہنہ رقص بھی ہوتے ہیں۔ ہم اسے ثقافت بھی کہتے ہیں۔ اس سے قوم کی ذہنی اور اخلاقی روش پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا، کیونکہ اس کا باقاعدہ لائسنس ملتا ہے۔

ہوٹلوں میں کھانا کھانے والوں کی صحت ہمیشہ معجونوں اور انگریزی دواؤں کی محتاج رہتی ہے، ہمیں اکثر حیرت ہوتی تھی کہ ہوٹل کے مالک اتنے صحت مند کیوں نظر آتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک ہوٹل کے مالک کی دعوت کر دی۔ ابھی اس نے دو تین لقمے ہی لئے تھے، کہ ہاتھ روک لئے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"یہ کھانا کہاں کا ہے؟"

"آپ کے ہوٹل کا۔" ہم نے عرض کیا۔

"لاحول ولا۔" کھانا چھوڑ کر وہ بھاگے اور باتھ روم میں جا کر کلیاں اور غرارے کرنے شروع کر دیئے۔

انہی کے ہوٹل میں ایک روز ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ کونے والی میز پر ایک صاحب سوپ پی رہے تھے۔ اچانک وہ ہاتھ روک کر سوپ کا بغور جائزہ لینے لگے۔

"بیرا..." وہ چلائے۔

"جی صاحب!..." بیرے نے جا کر مودبانہ کہا۔

"یہ کیا ہے؟"...

"جی صاحب، یہ سوپ ہے!"... بیرے نے انکشاف کیا۔

"کس کا ہے؟"... وہ چیخے۔

"مرغی کا، صاحب! دھیرے سے بیرے نے کہا۔

"کس کا ہے؟"... آواز بلند ہو گئی۔

"جی، مرغی کا!"... اور دھیرے سے بیرا بولا۔

"کون، میں یا تم؟"...

"جی؟!"...

"میں پوچھتا ہوں یہ سوپ کس کا ہے؟" وہ غصے میں بولے۔

"جی، کوے کا ہے"... بیرے نے مری ہوئی آواز میں کہا اس پر وہ صاحب دیر تک کائیں کائیں کرتے رہے۔

"صاحب! دو آنے والی چائے میں
"مچھر" ہی نکل سکتا ہے،
"ہاتھی" نہیں!"

دنیا کے اہم ترین فیصلے ہمیشہ ہوٹلوں میں ہوئے ہیں۔ مثلاً شادی، طلاق، مقدمہ، پروفیسر فلاں، ماہر جنات و بلیات قسم کی چیزیں بھی اکثر ہوٹل کے کمروں میں اپنا دفتر لگاتی ہیں۔ یہ پروفیسر وغیرہ بھی خوب ہوتے ہیں خواہ مخواہ انسانوں کو بھوتوں، چڑیلوں سے ڈراتے ہیں۔ حالانکہ اس خانوادے کے لوگ خود انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ دنیا کی ساری مخلوق انسان سے ڈرتی ہے۔ سوائے دو کے۔ ایک تو بلی اور دوسری بیوی۔

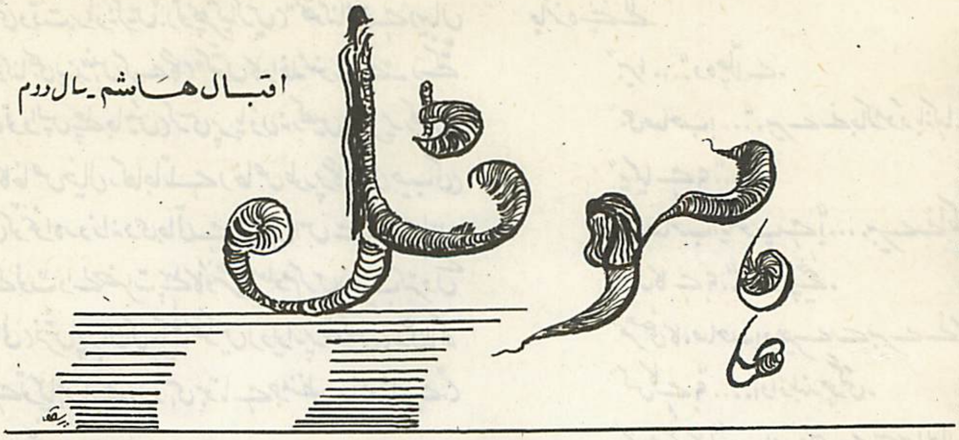

ہوٹل

اقبال ہاشم۔ سال دوم

ہوٹل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جہاں، خراب کھانا ملتا ہے۔ دوسرے وہ، جہاں اچھا کھانا نہیں ملتا۔ شروع شروع میں جب ہوٹل بننے لگے تو اکبر الہ آبادی نے کافی شور مچایا۔ یہ اکبر الہ آبادی بھی خوب تھے۔ سر سید کی ہر بات پر اعتراض کرتے تھے۔ حالانکہ سر سید صرف ہوٹلوں میں جایا کرتے تھے، ہوٹل چلایا نہیں کرتے تھے۔ وہ علیگڑھ کالج چلایا کرتے تھے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے بیشتر ستیگرہ اور تحریکیں چلانے کے علاوہ ہوٹل بھی چلاتے ہیں۔

بعض ہوٹلوں کا ماحول بڑا رومان پرور ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک ہوٹل میں جب ہم گئے تو ملکی موسیقی دھیمے سروں میں بج رہی تھی۔ دیواروں پر خواب آور رنگ کیا ہوا تھا۔ روشنی اتنی مدھم کہ بس نیند آجائے اس دلکش ماحول سے متاثر ہو کر میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"کس قدر رومانی ماحول ہے۔ روشنی کس قدر دلفریب ہے ایسا لگتا ہے کہ رات اب ختم ہوا چاہتی ہے اور سورج کا کونا مشرق سے اب نکلنے ہی والا ہے اور"۔

"بس، بس، اب شاعری بند کرو۔ تمہیں معلوم ہے یہ روشنی اس قدر مدھم کیوں ہے؟" میرے دوست نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اس لئے کہ ماحول دل آفریں اور پُر کیف ہو جائے۔"

"نہیں۔ یہ سب اس لئے کہ کھانا کھاتے ہوئے ہمیں اس میں کچھ نظر نہ آئے۔" میرے دوست نے منہ کا سارا ذائقہ ختم کر دیا۔

ایسے لوگ ہمیشہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو دوسرے لوگوں کی ویسی باتوں سے ذرا مختلف ہوں، ایسے لوگوں کو ہم انٹلکچول کہتے ہیں ویسے ہوٹلوں میں سب سے زیادہ پایا جانے والا بھی یہی طبقہ ہوتا ہے یہ لوگ ہوٹلوں میں بیٹھ کر دنیا بھر کے مسائل پر الل ٹپ باتیں کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس طبقے کی بات سُن لے تو اس کے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

بڑے ہوٹلوں کا بل ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے مالک اور گاہک دونوں کا کاروبار بھی بڑا ہوتا ہے۔ ایسے ہوٹلوں میں بڑی خاموشی ہوتی ہے، یہاں کا بیرا صرف بہرا ہی نہیں گونگا بھی ہوتا ہے گاہک صرف اندھا ہوتا ہے۔ عقل کا بھی اور آنکھوں کا بھی۔ ہوٹلوں میں ہر دم دھما چوکڑی مچی رہتی ہے۔ بیرا، گاہک، باورچی، سیٹھ اور پانی والا لڑکا، ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق، حسب توفیق شور مچاتا ہے یہاں بہت سارے نوٹس بھی لکھے ہوتے ہیں۔ کہ سیاسی اور مذہبی گفتگو کرنا منع ہے۔ شراب پی کر آنا منع ہے۔ تھوکنا منع ہے۔ فلاں کرنا منع ہے وغیرہ۔ مگر لوگ سیاسی اور مذہبی بحثیں کرتے ہیں اور بعض اوقات تو خود مالک بھی جوش میں آکر ان میں شریک ہو جاتا ہے۔

ایسے ہوٹلوں میں ہم سب سے پہلے شرائط و قواعد پڑھتے ہیں،

عزم و تمنا

• زین السالکین - سال چہارم

ترا ہر گلہ وہ بجا سہی
ترا ہر ستم وہ روا سہی
تو جو سن سکے جو میں کہہ سکوں
ترے آنسوؤں کو میں پونچھ دوں
مگر آہ تجھ سے میں کیا کہوں
وہ جو بہہ رہے ہیں برنگِ خوں
کسی دل شکستہ کی آنکھ سے
یہ وہ اشک ہیں جنھیں دیکھ کر
میں تڑپ نہ جاؤں تو کیا کروں؟
اے عزیز تر مرے ہمسفر
ذرا دیکھ اِدھر بھی رہگذر
کئی پا شکستہ ہیں منتظر
کہ اٹھے اِدھر بھی کوئی منتظر
میں تڑپ گیا انہیں دیکھ کر
اب انہیں اٹھا کے اٹھوں گا میں
اب انہیں چلا کے چلوں گا میں
مرا عزم دل ہے عظیم تر
تو شکایتِ غمِ دل نہ کر
یہ نمی جو ہے ترے گال پر
اسے خشک کر اسے پونچھ لے

زندگی کا سفر

• اشرف ظہیر احسن انصاری (سال چہارم)

زندگی کا سفر ہے انوکھا سفر
بندشوں، سازشوں، وحشتوں کا ہے گھر
ہے اداسی ہر اک سمت یاں جلوہ گر
چہرے اترے ہوئے ذہن بکھرے ہوئے
عرصہ گزرا ہے پھولوں کو نکھرے ہوئے
ہر طرف پستیاں ہم کو گھیرے ہوئے
مہوشوں کا تبسم بھی پھیکا ہے اب
خامشی، خامشی، خامشی زیرِ لب
زندگی، زندگی، زندگی میرے رب
زندگی نام ہے بے بسی کا یہاں
بھوک کا پیاس کا بے کسی کا جہاں
ڈھونڈو یارو کہ انسانیت ہے کہاں
لٹ ہے اُلجھی ہوئی آنکھ بھیگی ہوئی
آج انسانیت بھی ہے جھلسی ہوئی
زندگی کیا ہے زنجیر اُلجھی ہوئی
ظلم و دہشت گردی کا ہے بازار گرم
ہر طرف ہے الم ہر طرف ہے ستم
یا الٰہی غضب ہے کرم ہو کرم
کارواں زندگی کا ہے جاری مگر
ہے یہ معلوم ہر راہ ہے پُرخطر
زندگی ہی بنی ہے یہاں راہبر

اپنے کالج کے نام جس سے مجھے والہانہ لگاؤ ہے۔

ان شفیق اساتذہ کے نام جن کی راہنمائی میں میں نے پانچ سال ہنسی خوشی گزار دیئے۔

اپنے ان سادہ لوح دوستوں کے نام جن کی رفاقت میرے لئے باعث فخر ہے۔

ان شریر دوستوں کے نام جنھیں میں شاید ہی بھلا سکوں۔

دل افسردہ ہے، آنکھیں نمناک اور روح بیتاب۔
کہ کچھ دن کچھ عرصہ بعد
یہ حسین پیکر، یہ دلنشین چہرے
یہ مسکراہٹیں یہ صباحتیں
یہ شرارتیں، یہ حماقتیں
یہ صحبتیں یہ رفاقتیں
یہ لطیفے، چٹکلے یہ گپ بازیاں
یہ کینٹین کی بزم آرائیاں
یہ کیفے ٹیریا کی رعنائیاں
چھٹ جائیں گی، ٹوٹ جائیں گی، بکھر جائیں گی۔
مگر
دلاسہ دیتی ہے ضمیر کی آواز
کہ یہی دستور رہا ہے ازل سے
لوگ ملتے ہیں بچھڑنے کیلئے۔
راہ میں ساتھی مستقل کوئی نہیں

ہر موڑ پر ملتے ہیں نئے ہمسفر
پر
گیا وقت بچھڑے لمحات
بیتا زمانہ گذرے حادثات
یاد آئیں گے
دل کو تڑپائیں گے
روح چیخ اٹھے گی
خدایا
چھین لے یہ یادیں
حسین یادیں، دلسوز یادیں
یادیں جو انمٹ ہیں
یادیں جو انمول ہیں
یا
بیتا وقت لوٹا دے
کاش ایسا ہو سکتا

میں بستر پر لیٹی دیئے کی اس ٹمٹماتی لو کو دیکھ رہی تھی جو کبھی تیز ہو رہی تھی اور کبھی مدھم۔ میری زندگی کی طرح۔ یہ دیا جو خود جلتا ہے مگر دوسروں کو اپنی روشنی سے راہ دکھاتا ہے۔ عجیب طرح کے خیالات ذہن میں گھسے آ رہے تھے۔ امی جان دوسری چارپائی پر محو خواب تھیں۔ میری سوچوں کے تانے بانے الجھتے رہے۔ ایک دم کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ بڑی خوفناک آواز نکلی اور جھونپڑی کا شکستہ اگلا حصہ دھم سے گر پڑا۔ میں حیران پریشان تھی۔ غم و غصہ کی عجیب کیفیت تھی۔ امی جان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں

اف خدایا یہ کیا ہو گیا۔ ان امیروں کو کیا پرواہ۔ شراب کے نشے میں دھت ہزاروں بے کسوں کے گھر اجاڑ دیتے ہیں۔ میرے دل سے اسکے لئے بد دعائیں نکل رہی تھیں جس نے ٹوٹے پھوٹے گھر کو بالکل ہی توڑ دیا تھا۔ میں باہر نکلی۔ گلی میں کسی حد تک اندھیرا تھا۔ کار کے اسٹیرنگ پر کوئی شخص سر دیئے پڑا تھا۔ میں نے کھڑکی سے ہاتھ ڈال کر اس کے سر کو ٹٹولا اور خون سے میرے ہاتھ بھر گئے۔ میں گھبرا گئی۔ اجنبی کا سر سیدھا کیا۔

اماں! یہ شخص بے ہوش ہے اور اس کے سر سے خون بھی نکل رہا ہے ذرا سہارا دے کر اندر لے چلو۔

میں انسانی ہمدردی کے تحت مجبور ہو گئی۔

بڑی مشکل سے اسے اندر پہنچایا۔ چہرے سے خون صاف کیا، اور پانی میں بھگو کر پٹیاں سر پہ باندھ دیں۔

اجنبی نے آنکھیں کھول دیں۔

میں کہاں ہوں؟

آواز کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

جی! آپ ہمارے یہاں ہیں۔ کیا آپ نے شراب پی رکھی تھی؟ دیکھئے ذرا! آپ نے ہماری شکستہ حال جھونپڑی کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں بہن۔ میں نے شراب نہیں پی تھی البتہ بھٹک ضرور گیا تھا۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔ میں نے اپنوں کو بیگانہ جان کر چھوڑ دیا اور بیگانوں کو اپنا سمجھ کر زمانے بھر کا دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔"

وہ غنودگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ اور میں اندھیرے میں

آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

امی تو سو گئیں مگر میں ساری رات نیچے فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی ۔ اجنبی شخص کا جملہ بار بار ذہن سے ٹکرا رہا تھا" میں نے اپنوں کو بیگانہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور بیگانوں کو اپنا سمجھ کر زمانے بھر کا دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا ۔

میں عجیب سی کشمکش اس شخص کے لئے اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی ۔ بالآخر رات بیت گئی ۔ صبح کو پہلی کرن اندر آئی ۔ اجنبی آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا ۔ میں نیچے منہ کئے بیٹھی تھی ۔

بہن ! اس نے ہلکے سے آواز دی

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا

بھیا ! میں چیخ کر اٹھی

رجو ۔ وہ پلنگ سے اُٹھ کر نیچے اترنے کی کوشش میں گر پڑے ان کے ماتھے سے خون بہنے لگا ۔ میں نے اپنا آنچل پھاڑ کر بھیا کے سر پہ پٹی باندھ دی ۔

بھیا ! میرے بھیا ۔ تم اب تک کہاں تھے ۔ ہمیں بے آسرا چھوڑ کر کہاں گم ہو گئے تھے ۔ ویرانوں میں بھٹک رہے تھے یا گلزاروں میں پھول چن رہے تھے ۔ میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر چیخ اٹھی ۔

"میرے لال ! میری آنکھیں تیرے انتظار میں روشنی کھو رہی تھیں ۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں مگر میری لاٹھی مجھ سے دُور تھی ۔

اماں کے رعشہ بھرے ہاتھ بھیا کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے ۔

اور بھیا اماں کے سینے سے لگے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے بھیا نے مجھے سینے سے لگا لیا ۔

"میری بہن مجھے معاف کر دے ۔ میری رجو ! میں تیرا گنہگار ہوں"

ان کے آنسو میرے آنچل میں جذب ہوتے رہے ۔

میں ، امی ، بھیا تینوں لپٹ کر رو رہے تھے ۔ آنسو کسی طرح بھی قابو میں نہیں آ رہے تھے ۔

باہر مسلسل شور ہو رہا تھا ۔ محلے کے لوگ کبھی گاڑی کو اور کبھی جھونپڑی کے ٹوٹے ہوتے حصے کو دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے مگر ہمیں کسی کی پرواہ نہ تھی ۔ وہ سارا دن ہم تینوں نے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر گزارا ۔ میں دفتر بھی نہیں گئی ۔

میں نے بھیا کو بے انتہا مجبور کیا کہ بھیا خدارا مجھے بتا دو تم پر کیا گذری ؟

بھیا نے مجھے سینے سے لگا کر میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا ۔

رجو ! میں تیرا مجرم ہوں ، مادر وطن کا مجرم ہوں ۔ مگر میں تجھے ڈائری دوں گا ۔ خود مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ اپنے گناہوں کی داستان زبانی سناؤں وہ اٹھے اور بیگ میں سے کالی جلد کی ڈائری نکال کر مجھے پکڑا دی ۔

"لے اب سو جا ۔ صبح اُٹھ کر پڑھنا" انہوں نے پیار سے میرا شانہ تھپتھپایا ۔

مگر مجھے صبر کہاں تھا ۔ بھیا اور امی پرسکون نیند سو رہے تھے اور میں اسی دیئے کی روشنی میں بیٹھی ڈائری پڑھ رہی تھی ۔

"ابو کی وفات کے بعد گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آ پڑا ہے ۔ صد شکر ہے مجھے سیکرٹ سروس میں جگہ مل گئی ہے ۔ تنخواہ تین سو روپے ہے ۔ تین آدمیوں کے لئے کافی ہے ۔ اب ہم دوسرے کرائے کے مکان میں آ گئے ہیں ۔ ۱۰۰ روپیہ کرایہ چلا جاتا ہے ۔ باقی ہم پر صرف ہو جاتا ہے "

میں نے صفحہ پلٹا

"آج آفس میں میں نے ایک نیلی آنکھوں والی لڑکی دیکھی ۔ میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے ۔ ایک ہی نظر میں میں اس کی آنکھوں کے تیر کا شکار ہو گیا ہوں ۔ جب وہ مسکرا کر دیکھتی ہے تو نجانے کیوں دل میں ہلچل مچ جاتی ہے ۔ شاید میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں ۔ کتنی پیاری ہے این "

دوسرے صفحہ پر لکھا تھا ۔

میری اور این کی ملاقاتیں بڑھتی جا رہی ہیں ۔ وہ نیلی آنکھوں والی حسینہ بُری طرح میرے ذہن پر چھا چکی ہے ۔ مگر اس کی مہنگی مہنگی فرمائشیں سن کر بُری طرح نروس ہو جاتا ہوں ۔ مگر اس کے لئے میری زندگی بھی قربان ہے

میں نے دوسرا صفحہ پلٹا ۔

عید کے کچھ دن رہ گئے ہیں ۔ این نے مجھ سے ساڑھی کی فرمائش کی جس کی قیمت ڈھائی سو روپے ہے ۔ رجو اور امی پر بری طرح غصہ آتا ہے ۔ آجکل رجو مجھ سے سہمی سہمی رہتی ہے ۔ امی بھی خفا خفا ہیں ۔ لیکن ان ہی

کی وجہ سے تو میں اپنے آئیڈیل کو کچھ دے نہیں سکتا۔ عید قریب ہے رجو کے کپڑے بھی بنانے ہیں۔ خیر دیکھا جائیگا۔"

آنسوؤں سے پُر آنکھوں سے میں نے صفحہ پلٹا۔

آج این زبردستی شاپنگ کے لئے لے گئی۔ تین سو روپے جیب میں تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ دبا دیا اور اس کے لئے ڈھائی سو روپے کی ساڑھی خرید دی۔"

این کے ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی جس کو کھو کر میں سب کچھ بھول گیا۔ میں گھر کے دروازے میں داخل ہوا۔ امی نے تنخواہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اگرچہ پہلے میں خود ہی ان کے گلے میں باہیں ڈال کر دے دیا کرتا تھا مگر میں نے بے رخی سے ہاتھ جھٹک کر ۵۰ روپے پھینک دیئے۔ امی اور رجو بری طرح بیٹھی سسک رہی ہیں۔ اور میں ان پر کھول رہا ہوں۔ رجو پر بہت ہی غصہ آرہا تھا۔ اس کی سونی کلائیاں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ مگر این کی مسکراہٹ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دھندلائی ہوئی نظروں سے میں نے صفحہ پلٹ دیا۔

"آج این نے مجھ سے میرے پیار کی قسم لی اور بتایا کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے اور مجھے ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے۔ جب اس کا مشن مکمل ہو جائیگا تو وہ مجھ سے شادی کرے گی مگر مجھے اس کے ساتھ جرمنی چلنا ہوگا۔"

ایک لمحہ کے لئے میں سٹپٹا گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔"

"ڈارلنگ گھبرا گئے۔ محبت میں تو بڑے مشکل مقام آتے ہیں۔ وہ مجھ سے لگتے ہوئے بولی۔ اس کے وجود کی حدت نے مجھ کو پگھلا کر رکھ دیا۔ اس سے شادی کا تصور میری خوابوں کی تکمیل۔ ہاں ہاں مجھے اس کے لئے سب کچھ منظور ہے"

میں نے حیران و پریشان اور دھڑکتے دل سے دوسرا صفحہ پلٹا۔

"آج این کا مشن مکمل ہو گیا کتنا مشکل کام تھا۔ باس کے سیف سے اسلحہ کی جگہوں کے کاغذات اڑانا۔

مگر فرہاد نے جوئے شیریں کے لئے نہر کاٹی تھی وہ اس سے مشکل کام تھا۔ این کے آگے میرا یہ کام کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

پرسوں ہم جرمنی روانہ ہو جائیں گے۔ رجو کا اداس چہرہ اور امی کی خلاؤں میں بھٹکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں لڑکھڑا جاتا ہوں۔ مگر این، میرے خوابوں کی شہزادی اس کو حاصل کرنے کے لئے مجھے سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ میں نے امی اور رجو سے چوری چوری ساری تیاری مکمل کر لی ہے۔"

اور ہوا کے جھونکے سے ورق پلٹ گیا۔

"ہم جرمنی آگئے۔ مجھے نہیں معلوم امی، رجو کس حال میں ہیں۔ مگر میں بہت خوش ہوں۔ میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔"

پھر دوسرے صفحوں پر کچھ نہ تھا، آخر ڈھیر سارے صفحے پلٹنے کے بعد مجھے لکھا ہوا نظر آیا اور میری نظریں سطور پر جم گئیں۔

اُف خدایا! این کتنی بے وفا نکلی۔ وہ غیر مردوں کی باہنوں میں باہنیں ڈالے رقص کرتی رہتی ہے اور مجھے لفٹ بھی نہیں دیتی، آج کل میرے ضمیر کی آوازیں مجھے ملامت کرتی رہتی ہیں۔ ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ تو "غدار وطن ہے" میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ این میری بدلتی ہوئی حالت کو جان گئی ہے۔ امی و رجو بہت یاد آتی ہیں۔ میں کتنا بدنصیب شخص ہوں۔ یہ امی اور رجو کی بددعائیں تو ہیں جنہوں نے مجھے سکون سے نہ رہنے دیا۔ کتنا کم ظرف بیٹا اور ذلیل بھائی ہوں۔ بہن کی سونی کلائی گوارا کر لی، ایک محبوبہ ذلیل لڑکی کی محبت میں۔"

میں سر پکڑے چپ چاپ بیٹھا رجو کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ این میرے کمرے میں آئی۔ میں حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ۔ اس کے لہجے کی چاشنی سے مجبور ہو کر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"این تم بدلتی جا رہی ہو۔"

"ہونہہ! اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ جب تک میرا مشن تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ میں تم سے طلاق لینے آئی ہوں۔"

میں غم و غصے سے لرز گیا۔ "ذلیل لڑکی۔ بے وفا نیلی آنکھیں واقعی بے وفائی کی نشانی ہیں۔ سفید کتیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنی ذلیل نکلے گی۔

"میں پاگل سا ہو رہا تھا۔"

"میرے پاس بہت سے ثبوت ہیں۔ میں تجھے گرفتار کرواؤں گا۔"

وہ طنزیہ ہنسی! "مگر پہلے تم جیل جاؤ گے غدار وطن۔"

میں دل وجان سے لرز گیا۔ اور اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ غدار وطن

یہ تم کہہ رہی ہو این۔

میں بے چارگی سے رو دیا۔

جب تم اپنی ماں بہن کے نہیں ہو سکے اور وطن کے وفادار نہ رہ سکے تو میرے کیا ہو گے ہو سکتا ہے کل تم کسی اور کے لئے مجھے چھوڑ دو۔

اس کے لہجے میں کتنی تلخی تھی۔

پھر میں نے خاموشی سے اسے طلاق دے کر دیار غیر کو چھوڑ کر واپس اپنے ملک آگیا۔ اپنے پیارے وطن۔ یہاں کا ذرہ ذرہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے حقارت سے دیکھ رہا ہو۔ میں کتنا مجبور ہوں خدایا!

مجھے معاف کر دے۔

میرے آنسو بُری طرح بہہ رہے تھے۔ آنچل سے آنسو پونچھ کر میں نے دوسرا صفحہ پلٹا۔

میں آج گھر پر گیا۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ جا کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اجنبی شخص نکلا۔ میں نے جلدی اور حیرانی سے امی وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ "وہ دو سال ہوتے یہاں سے چلے گئے۔"

"مگر کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم" کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں حیران پریشان کھڑا تھا۔ عجیب بے چارگی کے عالم میں مبتلا تھا۔ دوسرے محلے والوں سے پوچھا۔ پتہ چلا وہ لوگ "جھگی کالونی" چلے گئے۔

آہ خدایا! کتنا گناہ گار ہوں میں۔ میری ماں بہن بے آسرا نجانے کس حال میں ہوں گی۔ میں جگہ جگہ گھومتا ہوں مگر ان کا پتہ نہیں چلتا مجھے معاف کر دے اللہ میاں۔ مجھے ایک بار اپنی ماں کے گلے لگ کر معافی مانگنے کا موقع دے دے خدایا۔

میری سسکیاں تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ بھیا سسکیوں کی آواز سنکر اٹھ بیٹھے۔

"رجو" وہ میرے ہاتھوں میں ڈائری دیکھ چکے تھے "پیاری بہن مجھے معاف کر دے۔" انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ چپ ہو جانا۔ امی اٹھ جائیں گی۔ اور میں یہ سب کچھ امی کو بتانا نہیں چاہتا۔ چپ ہو جا پیاری بہن

اچھا بھیا آگے کیا ہوا۔ میں آنسو پونچھتے ہوتے بولی۔ ان کے منہ سے آہ نکل گئی۔

"پھر رجو!

میں گلی گلی پھرتا رہا۔ سب سے تم لوگوں کا پتہ پوچھتا رہا مگر کسی کو کیا معلوم آخر اس گلی میں آکر میں اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ میں بری طرح رو رہا تھا۔ ایک دم میری گاڑی اپنی ہی جھونپڑی سے ٹکرائی۔ میں نے بڑی مشکل سے بریک قابو کئے اور اسی کوشش میں سر پھٹ گیا۔ پھر جب آنکھ کھلی تو تم لوگوں کے درمیان تھا۔

بھیا کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ دو تین دن بعد بھیا نے کرائے پر دوسرا مکان لے لیا اور ہم جھگی کالونی سے اُٹھ آئے۔ بھیا ایک ایک دن میں ڈھیروں چیزیں میرے لئے لا رہے تھے۔ امی اور میں بہت خوش تھے بھیا کی شرمندگی کسی طرح نہ جا رہی تھی۔

ایک دن بھیا پولیس انسپکٹر کو لئے گھر میں آئے۔ امی گھبرا گئیں۔ مگر بھیا نے انہیں "یہ میرا دوست ہے" کہہ کر مطمئن کر دیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خدشے سر ابھار رہے تھے۔ کیونکہ بھیا کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکے تھے۔

"رجو! میری ضمیر کی خلش مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ مگر کچھ دن بعد مجھے سکون مل جائے گا۔ وہ سکون جو ابدی ہو گا۔"

اس وقت بھیا کے چہرے پہ نور سا آجاتا اور آنکھیں چمک اٹھتیں۔

اپنے تجسس سے مجبور ہو کر میں کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ بھیا نے سب کچھ انسپکٹر کو بتا دیا تھا۔ بھیا نے انہیں کاغذات کا پلندہ دیا۔

"یہ این کے خلاف ثبوت ہیں انسپکٹر صاحب۔ اگرچہ میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ میرے دل کو سکون مل جائیگا۔"

بھیا کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ انسپکٹر نے اپنا پر شفقت ہاتھ بھیا کے کاندھے پر رکھ دیا۔

"عامر صاحب! جوانی میں لغزش بے اختیاری چیز ہے۔ یہ آپ کا قصور نہ تھا۔ جوانی کے جذبات میں بہہ کر غلط قدم آپ نے اٹھایا تھا۔ اس کا مداوا آپ کر چکے ہیں۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔ جب تک آپ جیسے نوجوان جن کے ضمیر زندہ ہوں ملک میں رہیں گے کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی"

انسپکٹر صاحب کی آواز میں ہلکا ارتعاش تھا۔ میں کھڑکی کی سلاخوں سے

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

ظہیر نادر بھٹی۔ سال آخر

جب سگریٹ کی گرمی کی حدت اس کی انگلیوں کو محسوس ہوئی تو اس نے ایک بھرپور کش لیا اور سگریٹ کو پاؤں تلے مسل دیا.... پھر وہ سوچنے لگا.... زندگی بھی تو اسی طرح سلگتی رہتی ہے.... اور سلگ سلگ کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے

اسی دوران بادل زور سے گرجے اور اسے خیالات کی دنیا سے باہر پھینک دیا لیکن یہ سوچیں کب پیچھا چھوڑتی ہیں اور.... وہ پھر ان ہی بھول بھلیوں میں کھو گیا.... بھلا وضعداریاں نبھانا اتنا ضروری کیوں ہے؟ اسے اپنے باپ پر بہت غصہ آ رہا تھا. کیا یہ ضروری ہے کہ فریدہ کے لئے عیدی اور لباس کا انتظام ضرور کیا جائے، اب تو اس کی شادی کو بھی ماشاءاللہ دس برس ہو چکے ہیں اور خدا کے فضل سے شوہر محنت مزدوری بھی کر لیتا ہے.... پھر اگر وہ غریب ہے تو ہم کون سے امیر ہیں.... اسی سلسلے میں اسے صبح گاؤں کے نمبردار کے گھر جانا تھا کہ شاید پچھلی فصلوں کی کچھ رقم مل جائے تو فریدہ کے لئے کپڑوں اور عیدی کا انتظام ہو جائے اور آخر کار اسی طرح کے خیالات کے دوران اسے نیند نے آ لیا.

صبح جب اٹھا تو مطلع کچھ صاف تھا. مشرق سے تاریکی کی چادر رفتہ رفتہ سمٹتی جا رہی تھی. تاریکی سرمئی رنگ اور پھر سفیدی میں تبدیل ہو گئی. نسیم سحر کی سبک اور لطیف معصوم بند کلیوں کو جگمگاتی، شبنم کو گلے لگاتی اور جھومتے پھولوں سے خوشبو چراتی آگے بڑھ گئی. کھیتوں میں گیہوں اور باجرے کی ڈالیاں خوشی سے جھومنے لگیں اور سبزہ لہلہا اٹھا. کوئل نے بھی اپنی مخصوص آواز میں چہکنا شروع کر دیا. چڑیوں کی چہچہاہٹ نے اعلان کر دیا کہ زندگی اضطراب کا نام ہے.

ادھر انور بھی ناشتے سے فارغ ہوا اور ہل لے کر کھیتوں کی طرف چل دیا. کھیتوں میں کھڑی فصلوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی امید اور اطمینان کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ فکر اور پریشانی نے لے لی.... یہ کھڑی فصلیں تو ہر سال یونہی بہار دکھاتی ہیں لیکن یہ بہار انور جیسے مزارعوں کے لئے نہیں جو سارا سال محنت کرتے ہیں. اور پھر اس محنت کا صلہ نمبردار کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور خود بہن کے ساتھ وضعداری بھی نہیں نبھا سکتے. ان بہاروں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا. ان کے رشتے تو صرف برائے نام ہی ہوتے ہیں. ان رشتوں سے وابستہ جذبات کا انہیں گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے.

جب وہ نمبردار فضل دین کے گھر سے نکلا تو اس کے چہرے پر مایوسی اور تردد کے سائے اور بھی گہرے ہو گئے تھے.... زمیندار نے پچھلی فصل کے پیسے دینے کی بجائے اسے اپنا باقی قرض چکانے کو کہا تھا.... جب انور دوپہر کو گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنے والدین کو باتیں کرتے ہوئے سنا

اس کی والدہ کہہ رہی تھی "فریدہ کو عیدی لازمی بھیجنی ہے چاہے ادھار یا گروی ہی کیوں نہ رکھنا پڑے۔ . . . اور پھر اس کی والدہ نے فریدہ کے لئے عیدی کا سامان تیار کر ہی لیا اور انور کو صبح بہن کے گھر بھیجنے کے لئے تیار کر دیا۔

انور اپنے ہی خیالات میں گم پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا کپڑوں کی گٹھڑی اس کی پشت پر ہچکولے کھا رہی تھی اسے شام تک فریدہ کے گاؤں پہنچنا تھا کیونکہ کل عید تھی۔ ایک موڑ پر پہنچ کر اس نے دم لیا تہمد کو کس کر باندھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا فریدہ کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

شام کا دھندلکا طاری تھا۔ دن کی سفیدی رات کی سیاہی میں ڈھل رہی تھی۔ گاؤں کے گھروں کی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن فریدہ کے گھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویرانیوں، بھوک اور افلاس نے یہ دھواں جذب کر لیا ہے۔ فریدہ دروازے پر کھڑی ان خوشیوں کا انتظار کر رہی تھی جو اسے آج تک میسر نہ آسکی تھیں۔ صادق دو دن سے مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے گھر پر ہی تھا اور آج مزدوری کی تلاش میں شہر گیا ہوا تھا۔

عید کا خوشی کا موقع ہے لیکن ہر ایک کے لئے نہیں۔ فریدہ کے لئے تو یہ عید عجیب کشمکش کا باعث تھی۔ بچوں کو بہلا کر وہ انجانے احساس سے دروازے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کہیں خلا میں گھور رہی تھیں جیسے خوشیوں کا راستہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہوں لیکن یہ خوشیاں اسے آج تک میسر نہ آسکی تھیں۔

انور نے دروازے کے قریب آکر جب فریدہ کو آواز دی تو وہ ایک دم ٹھٹھک گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ایسے نمودار ہوئی جیسے کسی ویرانے میں ایکدم چاندنی پھیل جائے تو ماحول کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

"بھیا! تم . . . . وہ ایک دم اپنے بھیا کے ساتھ لپٹ گئی . . . .

کیسے آئے؟ آ جاؤ . . . . اندر۔ اور پھر وہ ایک ہی سانس میں اپنے بابا اور ماں کے متعلق کتنے ہی سوال پوچھ گئی . . . . کچھ دیر کے لئے ان مہیب خیالات نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا جو وہ کچھ دیر پہلے سوچ رہی تھی . . . لیکن پھر وہ انجانے احساس کے ساتھ پریشان سی ہو گئی . . . . انور کافی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ بھوک تو بہت شدت کی تھی لیکن بہن کا گھر ہونے کی وجہ سے خود کچھ نہ کہہ سکا . . . .

ادھر فریدہ کو بھی وضعداری نبھانی تھی اور اب اس نے اپنی پریشانی پر کچھ کچھ قابو پا لیا تھا۔ اور پھر آخر اپنے والدین کی ہر اک شے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا "بھیا! کھانا نہیں کھاؤ گے؟ . . . . بول کیا پکاؤں تیرے لئے . ؟"

انور نے تکلفاً معذرت کی تو وہ فوراً مطمئن سی ہو گئی اور دل میں چبھے ہوئے کانٹے نے کچھ دیر کے لئے ٹیسیں دینی بند کر دیں . . . . . انور کو بھوک تو کافی لگی تھی لیکن چار و ناچار سونے کے لئے لیٹ ہی گیا . . نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن وہ پھر بھی خاموش پڑا تھا کہ ننھا رو دیا . . . "امی بھوک لگی ہے"۔

فریدہ نے اسے چپکے چپکے سمجھایا کہ صبح ہونے دو . . . لیکن بچے میں فریدہ جیسا حوصلہ کہاں تھا . . . . پھر ردر "امی کل صبح سے کھانا نہیں دیا" کبھی کہتی کہ ابو کو آنے دو . . . . اور ننھا پھر رونے لگے . . .

اب انور کو اپنی بھوک بالکل بھول گئی تھی . . . . اور نیند تو پہلے ہی غائب تھی۔ اس نے وقت کا اندازہ لگایا۔ رات کے تقریباً چار بجے تھے۔ وہ اٹھا فریدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا . . . بچوں کو پیار کیا اور یہ کہہ کر گھر سے چل دیا کہ ماں نے صبح عید کی نماز سے پہلے واپس لوٹ آنے کو کہا تھا . . . ورنہ ناشتہ کر کے جاتا۔ پھر وہ گھر سے نکل آیا . . . فریدہ پھر دروازے سے لگی کھڑی تھی . . . اور اپنے بھائی کو واپس جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر خلاؤں میں گھور رہی تھی . . . .

عبید الحمید - سال اوّل

جب ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے تو ہم پر ریسرچ کرنے کا بھوت سوار تھا۔ ہم سے جب کوئی پوچھتا کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے تو ہم بے ساختہ کہہ دیتے کہ ہم ریسرچ کریں گے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں ہمیں ریسرچ کے معنی نہ اس وقت معلوم تھے نہ آج سے ۶ ماہ پہلے۔ خدا بخشے ہمارے ماسٹر صاحب کو جنہوں نے ہمیں ریسرچ کے معنی و مطلب سمجھاتے اور اس طرح وہ دس سالہ بھوت کسی سنیاسی یا پروفیسر الاں فلاں کے تعویذ کے بغیر فرار ہو گیا۔

ان تمام باتوں سے آپ نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ پھر ہمیں بچپن میں ریسرچ کرنے کا بھوت کیوں سوار ہوا تھا۔ تو اطلاعاً عرض ہے۔ ہم ہر چیز کی تہہ تک پہنچنے کے عادی تھے۔ گھر بھر کے برتن، کھلونے اور دوسری چھوٹی موٹی مشینیں ہمارے ہی ہاتھوں سے اپنے کیفر کردار کو پہنچتی تھیں۔ چونکہ ہم چہیتے بہت تھے ماں باپ کے .... آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور تھے۔ اس لئے ہمارے بزرگ یہ کہہ کر ہماری غلطی کو معاف کر دیتے کہ اسے ریسرچ کرنے کا شوق ہے اس طرح ہماری حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد تو ہم باقاعدہ ہر چیز کو غور سے دیکھتے اور ہر پہلو سے اس کو جانچتے۔ اپنی تمام توجہ اس پر مرکوز کر دیتے اور اسے گھنٹوں تک گھورتے بلکہ یوں کہیے کہ ریسرچ کرتے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہمارے اس فن نے اور ترقی کی اور اب ہم امی، ابو اور مہمانوں کے بٹووں اور جیبوں پر بھی ریسرچ کرنے لگے۔

ان حالات کے پیش نظر ہمارے بزرگوں کو فکر لاحق ہوئی اور ایسا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ہمارا جوش کچھ اس طرح رنگ لایا کہ شاعر پکار اٹھا ؎

بات پہنچی تری جوانی تک

یعنی اب ہم عشق پر ریسرچ کرنے لگے تھے اور مندرجہ بالا تمام اصول وضوابط کی پابندی خوش اسلوبی سے کرنے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ریسرچ کی وجہ سے ہمارے سر کے دائیں حصہ سے کچھ بال غائب ہو گئے۔ جب لوگ ہم سے اس کے متعلق کچھ پوچھتے تو ہم صاف کہہ دیتے کہ صاحب ریسرچ کرنے کے لئے انسان کو اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنی پڑتی ہے۔ یعنی بات کرتے ہوئے سوتے وقت، لکھتے وقت، ہر وقت ریسرچ کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر حساب کے پروفیسر ہمیشہ دماغی طور پر غیر حاضر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ہر وقت حساب کے نئے نئے فارمولے اور مختلف پیچیدہ سوالات کے حل ڈھونڈھنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے حساب کے پروفیسر کے متعلق ایک لطیفہ سنایا، آپ بھی سنیئے۔

حساب کے ایک پروفیسر اپنی بیوی کو خط لکھتے ہیں تو ان کا ہر جملہ تحقیق سے بھرپور ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے بناسپتی گھی۔ وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی یہ تحریر۔

میں اس وقت ایک مستطیل سوئمنگ پول کے ایک ضلع پر ۶۰ کے زاویے سے بیٹھا تمہارے متعلق سوچ رہا ہوں۔ تم نے اپنے ۱۰" × ۸" کے خط میں، جس کے چاروں زاویے مسئلہ نمبر ۷ (PROBLEM NO. 7) کی پابندی نہیں کرتے، یہ شکایت کی ہے کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ میرے دل میں تمہارے لئے اتنی ہی قدر و قیمت ہے جتنی کسی الجبرا کے سوال میں "x"،

کی ہوا کرتی ہے۔ جب میں تمہارے متعلق سوچتا ہوں تو خیالوں میں گم ہو جاتا ہوں اور میری ہر نگاہ سوئمنگ پول کے پانی سے ٹکرا کر ستاروں کی طرف منعکس (REFLECT) ہو جاتی ہے۔ جس طرح منشور (PRISM) میں شعاع واقع (INCIDENCE RAY) اپنے راستے سے انحراف کرتی ہے اور باہر نکلنے کے بعد شعاع خروج (EMEVGENT RAY) کہلاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ہاں تو صاحب بات ہو رہی تھی ریسرچ کی۔ ریسرچ کی دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے۔ ویسے آجکل مغربی جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں پیاروں پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ جی ہاں اللہ کے پیاروں پر۔ کہیں آپ لینن کے پجاریوں پہ نہ سمجھیں کیونکہ لینن کے پجاریوں پر تو ریسرچ ماسکو میں پہلے ہی بالکل مکمل ہو چکی ہے اور جب سے ہم میڈیکل کالج میں آئے ہیں ہمیں پنجابی فلموں پر ریسرچ کرنے کا شوق چرایا ہے۔ آج کل ہم اس بات پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ پنجابی اسقدر کامیاب کیوں ہو رہی ہیں اور ہر فلم گولڈن جوبلی کیوں بنالیتی ہے۔ آجکل ہم فلمی پوسٹر بڑے انہماک سے دیکھتے ہیں لیکن سوائے لفظ خون ہی خون کے کچھ نظر نہیں آتا۔ شاید ہماری قوت بینائی جواب دے جاتی ہے۔ بقول ابن انشا ہم نے خون سے متعلق ۵۶ اویں فلم دیکھی لیکن ابن انشا میڈیکل کالج کے طالب علم نہیں ہیں اسلئے ان کو پنجابی فلم کے خون کا (BLEEDING TIME) اور (CLOTTING TIME) معلوم نہ ہوگا۔ ہم تو اس بات کے درپے ہیں کہ پنجابی فلموں کے خون کا تجزیہ کیا جاتے کیونکہ کچھ نام نہاد محب وطن سرمایہ داروں کی کامیابی کا راز بقول ان کے اسی ریسرچ میں پنہاں ہے۔

بقیہ: وطن کا پاسبان

ٹیک لگا کر بے اختیار سسک پڑی۔ بھیا چونک کر میرے قریب آئے۔

"پگلی! کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے بھیا کو سکون سے زندگی گزارنے کا موقع ملے۔"

"اور انسپکٹر صاحب میں نہیں چاہتا کہ اپنی والدہ کو ایک نئے صدمے سے دوچار کروں لہذا میں خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ جہاں خود کو بخوشی گرفتاری کے لئے پیش کر دوں گا۔"

"اور رجو تم امی کو سمجھا دینا کہ ملازمت کے ضروری کام سے تین چار سال میں باہر گزاروں گا۔"

بیٹی! ہم نے تمہارے بھیا کے جذبات کو پہچان لیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تین چار سال میں تمہارے پاس پہنچ جائیں۔..............

.........تم کو تو فخر ہونا چاہیئے کہ تمہیں اتنا عظیم بھائی ملا ہے۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔

دوسرے دن میں نے اور امی نے بھیا کو رخصت کر دیا۔ بھیا امی کے قدموں میں سر رکھ کر اتنا روئے کہ بس.............

اور پھر میں بھی ضبط نہ کر سکی۔ امی اب بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کا بیٹا باہر گیا ہوا ہے۔ وہ بھیا کے لئے پیاری سی دلہن ڈھونڈ رہی ہیں۔ میں آفس ٹائم کے وقت ہر ہفتہ کو بھیا سے ملنے جیل جاتی ہوں۔

بھیا کتنے پرسکون رہتے ہیں۔ ان کے چہرے پر بالکل ندامت نہیں۔ ان کا سینہ فخر سے تنا رہتا ہے۔ آجکل ان کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔

"شکر خدا کا! یہ سیکریٹ سروس کا معاملہ ہے ورنہ اخبار میں اشاعت کے بعد تو امی زندہ درگور ہو جائیں۔"

میں سوچتی ہوں میرا بھیا کتنا عظیم ہے۔ اس نے خود کو اپنے وطن کی خاطر جیل میں مقید کر لیا ہے۔ اور پھر میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور میں بارگاہ ایزدی میں جھک جاتی ہوں۔ شکر ادا کرنے کے لئے اور سر بار بار اپنے پیارے وطن کی سلامتی اور بقا کی، اور بھیا کی عمر درازی اور جلد رہائی کی دعا مانگتی ہوں۔

بھیا کے ہر خط میں لکھا ہوتا ہے۔

میری پیاری رجو! بس تو تھوڑے دن اور سروس کر لے پھر میں تیرے لئے پیارا سا دولہا ڈھونڈ کر تیرا گھر بساؤں گا۔

اپنے بھیا سے ناراض تو نہیں ہے نا۔

پھر میں ہلکے سے اداسی مسکرا دیتی ہوں۔

"نہیں بھیا بھلا تم سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں۔ تم تو میرے وطن کے سپاہی ہو، محافظ ہو۔ کوئی اپنے نگہبان سے بھلا کیسے روٹھ سکتا ہے۔"

نعتِ رسولؐ

• علامہ اقبالؒ •

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
میرا نشیمن در گہہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ہو
تجھ سے مری زندگی، سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تو ہی تو آباد ہے، اجڑے ہوئے کاخ و کو
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشم کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

بہار لٹ گئی ...... میرے ملک کا قرار چھن گیا ....

لیکن .... یہاں ...... آج بھی عیش و طرب کی محفلیں گرم ہیں ...... رقص و سرور کا ہنگامہ بپا ہے ...... اخوت و محبت، عصبیت کی چتا پر قربان کر دی گئی ...... منافرت کا طوفان سر پر کھڑا ہے .... آج بھی حقوق پائمال ہو رہے ہیں .... آج بھی ظلم و ستم روا ہیں ...... محبت و خلوص خوف سے نہ جانے کہاں چھپ گئے ہیں ..... احساس تنہائی کی ویرانیاں سمٹی ہوئی ہیں ...... شیشۂ دل ریزے ریزے ہو رہے ہیں ...... کائنات وفا لرز رہی ہے ...... قرار و سکون نہ جانے کہاں چھپے ہیں .... میرے وطن کا گلستاں بے چینی اور غیر یقینی کے طوفانوں کی ضد پر ہے ...... خطرات کی بجلیاں کوند رہی ہیں .... ہر طرف ہنگامے ہی ہنگامے ...... دھماکے ہی دھماکے ...... گلشن کی بنیادیں لرز رہی ہیں ...... تہذیب کے نقوش مٹتے جا رہے ہیں .... جیسے ...... جیسے ...... شیطان خوشی میں رقص کر رہا ہو ...... آئینۂ احساس میں مستقبل کا عکس بڑا تشویشناک دکھائی دے رہا ہے۔

ہمارے ہاں قیادت کا فقدان ہے ...... وہ قیادت جو ایماندار ہو ..... باکردار ہو ..... حالات سے زیادہ برق رفتار اور پُرعزم ہو ..... ہمارے نوجوان ہوائے نفس کا شکار ہیں ..... میرے ارمانوں کا چمنستان غول ہائے بیابانی کا مسکن بن چکا ہے ..... ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کے اکھوؤں سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں ..... جہاں آرزو پر تاریک رات مسلط ہو گئی ہے ...... پھول کی پتی سے زیادہ سے زیادہ نرم و نازک قلب کی نسوں سے لہو ابل پڑا ہے ..... مگر صد امو ختہ نگاہیں اب بھی خشک ہیں .. .. جیسے ..... جیسے اشک کا دریا سوکھ گیا ہو ......

لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں ..... جب ہمارے قافلوں نے گنگا کے کنارے وضو کیا تھا ..... جب چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا ..... دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا ......

لیکن آج چہروں پر اضطراب اور دلوں پر ویرانی کیوں ہے ...... اس سرزمین پاک پر رشوت و خیانت کے ہنگامے کیوں برپا ہیں .. .. رقص و سرور، بے حجابی، بے حیائی، بے غیرتی اس معاشرے کا کیوں جزو بنتے جا رہے ہیں ..... خون انسانیت کا احترام کیوں اٹھ گیا ہے۔

.... الزام و دشنام اور تشدد و انتقام اس سرزمین میں کہاں سے آ گئے ہیں .... یہ مسجد کے مینار بزبان خاموشی سوال کرتے ہیں کہ .... تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کہاں گم کر دیئے ..... ابھی کل ہی کی بات تو ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب ہمارے قافلے گنگا کی وادی میں خیمہ زن ہوئے تھے ہم ایک جمود ..... دور افتادہ صدا ہیں ...... ہمارے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے .... ہمارا احساس زخمی ہے ...... ہمارا دل مجبور ہے ..... راہ نمائی کے وہ سہارے جو ہم نے بنا رکھے تھے دغا دے گئے ... حالانکہ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے ...... ان ہی بتوں کی پوجا میں ہماری زندگی ہے .....

میرا دیس پکار رہا ہے ...... کہ ..... کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ۔ تو بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں ..... تذبذب کا راستہ چھوڑ دو .... شک سے ہاتھ اٹھا لو ...... بے عملی اور نفاق سے اجتناب کرو ...... اگر دل میں ابھی تک مایوسی کا بت ہے تو اسے خدائے واحد کی رعنائیوں سے سجاؤ ..... جس نے تیرہ سو برس پہلے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا۔ "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم ......" ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں ...... یہ صرصر سہی ... لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ...... ستارے ڈوب گئے ہیں لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو .... جہاں اجالوں کی سخت ضرورت ہے۔

پیارا وطن کا مشرقی بازو ..... تمہارے جسم سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ..... خدائے واحد کے پرستاروں کو سانپوں، بندروں اور گائیوں کو پوجنے والی ایک مشرک اور بد اطوار قوم کے آگے سرنگوں کر دیا گیا ..... ہماری زریں تاریخ شجاعت کا وہ تازہ ترین ورق جس پر عزم و ہمت کے پیکروں نے اپنے مقدس لہو سے زندگی کے نقش و نگار تازہ بکھیرے تھے .... اس پر کسی نادیدہ مکروہ ہاتھ سے تارکول کا برش پھیر دیا ...... ایمان و عزیمت کے وہ تازہ کارنامے اس سانحۂ عظیم کی نذر ہو گئے۔

شہیدوں کی روحیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں ...... کہاں ہے ہمارے عزم کا وہ علم جس کی خاطر ہم نے اپنی جانیں قربان کیں ..... ہم نے اس لئے تو اپنی جانیں نہیں لٹائیں کہ اس چمنستان تہذیب کو برہمنی سامراج کے ناپاک قدم

باقی صفحہ ۱۵۷ پر

سعید اختر - سالِ چہارم

میرا دیس

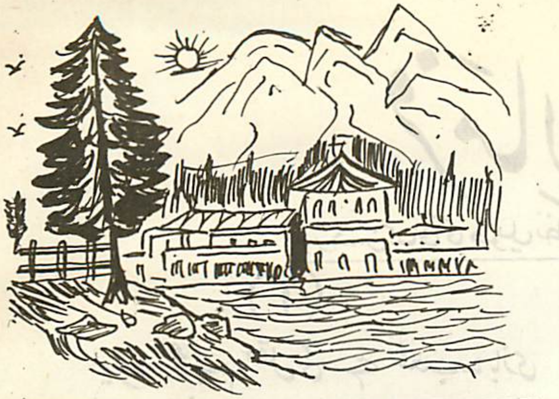

میرا دیس ...... میرا وطن ...... مسلمانانِ ہند کی آرزوؤں کا مسکن ...... شمعِ حق کے پروانوں کا مقامِ ایثار ...... وہی دیس جس کی خاطر فرزندانِ حق نے مال و جائیداد کو چھوڑا ...... جس کی خاطر زمین کی محبت کو قربان کیا ...... وہی دھرتی جس کے لئے دلہنوں نے سہاگ لٹائے ...... ماؤں نے اپنے بیٹوں کو قربان کیا ...... میرا پیارا پاکستان ...... پاکستان ...... وہی پاکستان جو محمد بن قاسم کے حسنِ سلوک کا نتیجہ ...... اورنگ زیب کی فراستِ ایمانی کا عکس، ...... ٹیپو کے قول کا امین ...... سراج الدولہ کی شجاعت کا حاصل ...... پاکستان! ...... میرا دیس ...... جس کی خاطر مسلمانانِ بنگال نے جدوجہد کی ...... سرحد نے حمایت کی ...... پنجاب نے رضامندی کا اظہار کیا ...... بلوچستان نے اپنی خوشنودی ظاہر کی ...... سندھ نے خلوص کا جام پیش کیا ...... مسلمانانِ ہند نے لہو کا نذرانہ پیش کیا ...... پاکستان بن گیا ...... تمناؤں اور آرزوؤں کا پاکستان ...... امیدوں اور ارمانوں کا پاکستان ...... عزمِ صمیم و بلند ہمتی کا نشان ...... پاکستان ...... عہد کیا گیا ......

یہاں صرف اس ذات کی حکمرانی ہوگی جس کا واقعی حق ہے ...... یہاں وہی قوانین نافذ ہوں گے ...... اسی آئین کو یہاں رائج ہونے کا حق ہے جو فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔

پاکستان ...... جس کی بے آب و گیاہ سرزمین کی معصوموں کے لہو سے آبیاری کی گئی ...... پاکیزہ و باعفت بہنوں کے شیشہ ہائے عصمت چور چور ہوئے ...... دلہنوں نے بیوگی کی ردائیں اوڑھ لیں ...... بچوں نے یتیمی کے داغ سہے ...... ماؤں نے اپنے بڑھاپے کے سہاروں کو وطن کی عظمتوں پر قربان کر دیا ...... گھبرو نوجوانوں نے بصد ارمان و بصد شوقِ شہادت کے جام کو بڑھ کر اٹھا لیا ......

وہی پاکستان ...... جس کا خواب دیکھا گیا ...... جہاں محبتوں کی حکمرانی ہوگی ...... جہاں کی فضاؤں سے خلوص و وفا کے نغمے پھوٹیں گے ...... جہاں فرامینِ خداوندی رائج ہوگا ...... جہاں رنگ و نسل کے بت توڑ ڈالے جائیں گے ...... جہاں ...... گلہائے اخوت کی روح پرور خوشبو سے مشامِ جاں معطر و مشکبو ہو جائیں گے ...... جس دیس کی فضائیں ...... گنگنائیں گی ...... جہاں کی صبحیں شبنم سے وضو کریں گی ...... جہاں زندگی جام بکف و ساغر بدست رقصاں و غزل خواں ہوگی ...... جہاں تہجد کی خنکی فرحتِ بے شمار پیدا کرے گی ......

لیکن ...... لیکن یہ کیا ہو گیا ...... کیا یہ وہی پاکستان ہے؟ ...... جہاں ہمارے آباؤ اجداد نے صدیوں پہلے اسلام کا علم لہرایا تھا ...... کیا یہ وہی مقدس سرزمین ہے؟ ...... جس پر شہیدوں کا معصوم خون بہا ...... نجانے اس سرزمین میں کس کس کا خون نہیں شامل ...... ادھر کا بھی خون اور ادھر کا بھی خون ...... بچوں کا ...... جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کا خون ...... یہی وہ دھرتی ہے ...... جہاں ماؤں کے جسموں کو زخمی زخمی کر دیا گیا ...... جہاں پر دشمنوں نے بہنوں کے مقدس جسموں کو روند ڈالا ...... گنگا اور برہم پترا کا نیلام ہو گیا ...... جہاں ملت کا پیراہن شرافت و حمیت تار تار ہوئے ...... ذہن ماؤف اور انگلیاں فگار ہیں ...... فضائیں سہمی سہمی ہیں ...... افسوس صد ہزار افسوس ...... میرے دیس کی عزت لٹ گئی ...... میرے وطن کی

فرمانِ امروز

(رحمٰن کیانی کی طویل نظم 'فرمانِ امروز' سے چند بند)

(۱)

میراثِ عجم عقل کی ہے شعبدہ بازی
سرمایۂ فطرت ہیں روایاتِ حجازی
اس کارگہہ وقت میں اے خارا شگافو!
ہے شیشہ گری ہیچ عبث آئینہ سازی
سمجھاؤ مشائخ کو یہ نکتۂ توحید
جائز نہیں تفریق حقیقی و مجازی
رائج کرو مکتب میں احادیثِ محمدؐ
منسوخ کرو فلسفۂ رومی و رازی
مقصودِ عبادات ہے العظمت للّٰہ
فائز ہو امامت پہ کوئی بندۂ غازی
رخصت کرو مسجد سے گدایانِ حرم کو
تجارِ مقابر کو مقابر سے اٹھا دو

(۲)

قمری کے لئے خوب سہی کُنجِ صنوبر
ناخوب ہے شاہیں کے لئے شاخِ گلِ تر
مردانِ جفاکش کے لئے خوب و مناسب
ریشم کے مصلّے ہیں نہ کمخواب کے بستر
اسلام ہے معیار تو ناقص ہی کہیں گے
قارونِ زمانہ ہو کہ قلاش قلندر
فطرت کے مقاصد کبھی پورے نہیں ہوتے
بے سطوتِ خالدؓ ہو اگر فقرِ ابو ذرؓ
سُکّانِ جہاں میں اسے کہتے ہیں مسلماں
اک مردِ مجاہد کہ گدا ہو نہ تونگر
پھر تیغ بکف رزم گہہ وقت میں آ کر
تم کون ہو تم کیا ہو زمانے کو بتا دو

(۳)

ہم تم ہوں کہ دہقان کہ ہو بندۂ مزدور
قائم رہے کس طرح سے لوگوں پر تسلط
توریت و اناجیل کی صحت میں گماں ہے
قرآں کہ محفوظ ہے حفّاظ کے دل میں
بوبکرؓ و عمرؓ کی طرح ثابت کرو تم بھی
اور حاکم و محکوم کی تفریق مٹا کر!
ہیں کل کی طرح آج بھی بیچارہ و مجبور
انسان کے آئین کا ہے مقصدِ مسطور
ہوتی ہیں اساطیرِ حقیقت سے بہت دور
نافذ کرو دنیا میں یہ اللّٰہ کا دستور
کہتے ہیں کسے اصل میں سلطانیٔ جمہور
انسان کو بندوں کی غلامی سے چھڑا لو

دق اور علاقائیت کے میعادی بخار میں اس بری طرح مبتلا ہو گئے ہیں
کہ آدھا ملک پھر غیروں کے قبضے میں ہے اور باقی کا صرف خدا حافظ و ناصر
نظر آتا ہے۔" ماتھے پر پہلی بار تشویش کی لکیریں ابھریں اور پھر انہوں
نے ٹھنڈا سانس لیا، سگریٹ سلگایا اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے
کہا "ہمارے کرتا دھرتا تعلیم کے میدان میں اتنے شدید احساس کمتری
کا شکار ہیں کہ وہ دنیا کا کوئی نظام تعلیم اپنانے کے لئے تیار ہیں لیکن
اپنے صدیوں پرانے نظام تعلیم کو ترمیم و تنسیخ کے بعد رائج کرنے کے
لئے تیار نہیں۔ ان کی ناقص العقلی کی مثال ایسی ہی ہے کہ یہ آم کا پودا
ٹنڈرا میں لگانے اور رینڈیئر کو تھر کے ریگستان میں پالنے کے قائل ہیں"
لہجہ خاصا ترش ہو چکا تھا "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے نظام
تعلیم پر وہ لوگ قابض ہیں کہ جن کی ابتدائی درجے سے لے کر انتہا
تک تعلیم CONVENTS اور بیرونی ممالک میں غیر ملکی زبانوں میں
ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس ملک، یہاں کے باشندوں، ان کے رسوم و
رواج، نظریات، اخلاقیات اور تصورات سے اتنے ہی ناواقف ہیں
جتنا کہ ایک چلی کا رہنے والا پاکستان کے متعلق ہو سکتا ہے۔"
چائے ختم کی اور پھر میں دوبارہ تیار
ہو گیا۔ سنبھلتے ہوئے کہا "ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ طلبا اساتذہ کا
احترام نہیں کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟" ایش ٹرے میں رکھا
سگریٹ اٹھا کر بولے "اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں مادیت
کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی بنا پر دولت کو دنیا کی ہر چیز سے برتر مان
لیا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جانے پہچانے سمگلروں اور منافع خوروں کو
ہمارے سماج میں جو مقام دیا جاتا ہے وہ کسی بڑے سے بڑے عالم
کو بھی حاصل نہیں ہے۔ نوجوان ذہن جب اس صورت حال کو دیکھتے ہیں
تو ان کے ذہن میں بھی یہ بات مستحکم ہو جاتی ہے کہ زندگی کا مقصد علم نہیں
دولت ہے۔ اس لئے ان کے حصولِ علم کا مقصد حصولِ زر کا ایک ذریعہ
ہوتا ہے اور اس طرح ایک عالم ایک کسان یا مزدور کی طرح لوگوں کو
عیش و عشرت مہیا کرنے کا ایک کارکن بن جاتا ہے رفتہ رفتہ اپنی اقتصادی
بدحالی اور بے چارگی کی بنا پر عالموں کو بھی اپنی یہ POSITION
قبول کرتے ہوئے اس پیشے کو حصولِ زر کا ایک ذریعہ سمجھنا پڑ گیا۔" سگریٹ

اب آدھے سے کم ہو چکا تھا ایک ہاتھ سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے
"اس تجارتی افہام و تفہیم کے بعد ان اعلیٰ اقدار کا باقی رہنا ناممکن تھا اور
اس لئے آج طالب علم اور استاد کے درمیان باپ اور بیٹے کے بجائے گاہک
اور دکاندار کا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔" ذرا رک کر تو میں نے پوچھا
"کیا مستقبل میں آپ کسی انقلاب کی توقع رکھتے ہیں؟"
کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "بنیادی طور پر میں توڑ پھوڑ والے
انقلاب کا قائل نہیں ہوں۔ ہر وہ انقلاب جو جبر و تشدد کے سہارے
کسی معاشرے میں لایا جاتا ہے غلط ہے۔ ہاں فہم و فراست، تنظیم اور
ایک قوم کی امنگوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب کوئی معاشرہ ارتقائی منزلوں
کو طے کرتا اور عظمت و رفعت حاصل کرتا ہے تو اسی کو سچا انقلاب
کہا جا سکتا ہے۔"
"سلسلہ واقعی طویل ہو گیا تھا گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔
میں نے آخری سوال کیا "طب کے طالب علموں کے لئے کوئی پیغام؟"
"ہمارے شریف پیشوں میں طب وہ پیشہ ہے کہ جس کو عبادت کہا جا سکتا ہے
بشرطیکہ طبیب پر اپنی جائز ضروریات سے زیادہ ہوسِ زر کا بھوت نہ سوار
ہو۔ جنگ کے صفحات پلٹتے ہوئے بولے۔
اس پیشے میں داخلے کے لئے ضروری ہے کہ اور تمام باتوں
کو الگ رکھتے ہوئے نفسیاتی طور پر طب کے پیشے کے لئے موزوں ہونے
کو اولیت دی جائے ورنہ غیر طبیبانہ مزاج کے افراد سے یہ توقع کرنا
کہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کریں گے

؎ ایں خیال است و محال است جنوں

اس طویل سلسلے کو بقول ان کے MARATHON
انٹرویو کو ان کی تصاویر اور تازہ کلام لے کر ذہن میں ان کے الفاظ
کے گنج ہائے گرانبار کو لئے گھر سے نکلا تو احساس ہوا کہ یہ انٹرویو
خاصا بھرپور رہا۔ کہیے اس ملاقات میں آپ بھی برابر شریک رہے
کہ نہیں؟

کی طرح سے شراب، جنسی آوارگی سود وغیرہ کی لعنتوں کو اپنی تہذیب و ثقافت کا حصہ سمجھنے لگیں یا سوشلسٹ ممالک کے غلام بن کر ازبک و تاجک کی طرح اپنا سب کچھ کھو کر تاریخ کے اوراق میں گم ہو جائیں"۔ انہوں نے اپنی بات مکمل کر لی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس قوم کی حالت اور اس موضوع پر اور کیا سوال کر سکتا ہوں۔ لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ ان کے جوابات تو ہر صاحب نظر کے ذہن میں گونج رہے ہیں تو میں پھر ادب پر آ گیا۔

شاعری میں کسی کے طرز کو آپ نے اپنانے کی کوشش کی؟

سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے "میں اپنی شاعری میں متاثر ہوا ہوں۔ انیس، غالب اور اقبال سے"۔ میں نے ایک لمحے کو پھر پیچھے گھوم کر ان کی تصاویر کے فریموں کو دیکھا اور پوچھا صرف ان ہی کی شاعری کو کیوں ترجیح دی آپ نے؟ اور کن کن شاعروں سے آپ متاثر ہیں؟ سوچتے ہوئے کہا "فارسی شاعری میں قاآنی کے الفاظ کا آہنگ اور در و بست مجھے بہت پسند ہے۔ انگریزی میں ملٹن اور عربی میں امراؤ القیس جیسے شعراء میرے پسندیدہ شاعر ہیں میرے یہاں آپ کو شاعری میں خطابت جو عرب شعراء کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالب کی شدت فکر اقبال سے نظریہ حیات اور انیس سے فصاحت و بلاغت یہ تمام چیزیں لے کر اپنی شاعری میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے اپنے لئے ایک منفرد لب و لہجہ اور اسلوب حاصل کر لیا ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ مسکرائے

"آپ نظموں کے شاعر ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ غزل کے مقابلے میں نظم زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے؟ اور آپ اپنی بات زیادہ آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

عینک دوبارہ پہنتے ہوتے بولے۔ "غزل ہمیں بات کو سمیٹ کر کہنے کا سلیقہ دیتی ہے۔ بات میں گہرا تاثر غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظم میں جزئیات اور تفصیلات میں جانا پڑتا ہے۔ اور اگر ان دونوں کی خصوصیات کو یکجا کر دیا جائے تو میرے خطیبانہ انداز شاعری میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں نظم و غزل کی اس تفریق کا قائل نہیں۔ میرے خیال میں قدرت کلام اور اسلوب بیان پر قادر شاعر بیک وقت اچھی نظمیں اور اچھی غزلیں کہہ سکتا ہے"۔ اب تک صرف ادب کی بات ہو رہی تھی۔ موضوع کا رخ میں نے تعلیم کی طرف کر دیا

اس دور میں طلباء کا رجحان یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم ان کے ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ موجودہ نظام تعلیم کو اس قوم کے شایان شان کیسے بنایا جا سکتا ہے؟۔

ایک لمبی سی ہوں! کہہ کر فرمایا۔ "دور غلامی میں برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیم کا بنیادی مقصد صرف کسب معاش و زر نہ تھا بلکہ سب سے پہلے جس بات کے متعلق سوچا جاتا تھا وہ اعلیٰ و ارفع قدریں تھیں جن کو مسلمانوں کی زندگی کا ڈھانچہ کہنا چاہئے۔ اس لئے ہمارے دور تک یہ عام رواج تھا کہ لوگ اپنی تعلیم مکتبوں سے شروع کیا کرتے تھے۔ اور معاشی علوم کو حاصل کرنے سے پہلے مذہبی اور اخلاقی علم کا وہ ڈھانچہ مستحکم طور پر ذہن میں قائم ہو جاتا تھا۔ جس کا میں نے پہلے ذکر کیا"۔ اتنا کہہ کر پھر عینک اٹھائی، عدسوں کو صاف کیا اور اپنی انگلیوں کو پھیلاتے ہوتے بولے "یہ اعلیٰ اقدار امیر معاویہؓ سے لے کر آج تک ارباب اقتدار اور استحصالی طبقوں کے لئے دردِ سر بنی رہی ہیں"۔

دوبارہ کافی اور چائے وغیرہ آئی تو کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ "بنو عباس کے آخری دور میں ہمارے نظام تعلیم کو اوّلاً جامد اور غیر ترقی پسند بنانے کی کوشش کی گئی۔ علماء سوء، صوفیاء، فقہا اور شہنشاہانِ وقت کے پروردہ دانش وروں نے ہمارے فطری اور سیدھے سادے نظریات پر ایسے شدید اور جان لیوا حملے کئے کہ اگر یہ نظریہ من جانب اللہ نہ ہوتا تو دنیا کے دوسرے نظریات کی طرح کب کا مٹ چکا ہوتا"۔

چائے کی چسکیوں کے درمیان میں چپ چاپ سنتا جا رہا تھا۔

بہرکیف چند اہل نظر اور اہل دل حضرات ہر دور میں پیدا ہوتے رہے اور اپنے خون سے اس پودے کی آبیاری کرتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے تک اس نظریہ حیات سے کھلم کھلا بیزاری ناممکن تھی لیکن پاکستان بننے کے بعد جب مخصوص مفادات رکھنے والے جاگیردار طبقے کے لوگ یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تو انہوں نے اس ملک میں نہ اسلامی آئین بننے دیا، نہ اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا اور نہ اسلامی نظریات کو قوانین کی صورت میں اس ملک میں جاری ہونے دیا۔ نتیجتاً آج ہم صوبائیت کے

یوں گویا ہوتے۔

"غرض ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک میں ان ہی باتوں پر غور کرتا اور پڑھتا رہا۔ نتیجتاً حالات اور واقعات کی کڑیاں جوڑنے پر میرے ذہن نے فیصلہ دے دیا کہ یہ تمام حضرات سرخ سامراج کے نمائندوں اور کارکنوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سوشلزم یہودیت کا ایک نیا رخ ہے جس کا مقصد ایک مخصوص نسل کے علاوہ تمام انسانیت کا استحصال ہے (یاد رہے کہ روسی صدارتی کونسل میں اکثریت یہودیوں کی ہے) چین میں روسی یہودیوں کی نہ چلی تو جوتوں میں دال بٹنا شروع ہوگئی، اور اب یہودی کسنجر کے ذریعے یہاں رسائی کی کوشش کر رہے ہیں اور دنیا سے اخلاقی اور مذہبی قدروں کو مٹا کر انسان کی انفرادی آزادیاں چھین کر ریاست کی غلامی میں مبتلا کرنا ہے۔" گرجدار آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ اتنا کہہ کر آنکھیں پھر بند کرلیں اور کچھ سوچ کر پھر کہا "میں اپنے ان خیالات کا کھل کر اظہار نہیں کر پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ سے واسطہ پڑ گیا۔ اس جنگ کے دوران جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر پاکستان کے فوجیوں نے اسلامی نظریے اور اقدار کی سچائی کو جب اپنے خون سے لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا تو میرے ذہن کے وہ تمام شکوک شبہات جو اس نظریے کے متعلق ہوسکتے تھے مٹ گئے۔ اب گرمی کافی ہوچکی تھی۔ وہ اٹھے اور پنکھے کا سوئچ آن کرتے ہوئے کہا "بات ایقان و ایمان کی حدوں سے گزر کر بالآخر اعلان تک آپہنچی اور یہیں سے میری شاعری اور زندگی کا وہ رخ مقرر ہوا جس پر میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے باوجود بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ چل رہا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر بیرونی طاقتیں اور اندرونی شرپسندوں کی متحدہ کوششوں سے خدانخواستہ اس پاکستان کو کوئی گزند پہنچا تو انشاءاللہ چند سال بعد (جس کے دوران یہ برصغیر ایک بھیانک خانہ جنگی کا شکار ہوگا) اس سے بڑا اس سے بہتر اور اس سے کہیں طاقتور پاکستان اس برصغیر کے نقشے پر ابھرے گا" جب مسہری پر دوبارہ آکر لیٹ گئے تو میں نے اگلا وار کیا۔

کیا آپ کے خیال میں موجودہ ادب کسی صورت اسلامی نظام کے نفاذ میں کوئی مثبت کردار ادا کرسکے گا؟

پاکستان کا وجود ایک نظریے کی بنیاد ہے اگر اس نظریے کو ختم کردیا جائے تو پاکستان کے قیام کا جواز ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اس لئے پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا اس نظریے کے خلاف کچھ لکھنا ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جس شاخ پر بیٹھا ہو اسی کو کاٹنا شروع کردے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج پاکستان میں شعر و ادب، صحافت اور نشر و اشاعت کے شعبہ جات پر وہ لوگ مکمل طور پر قابض ہوچکے ہیں جن کی تحریریں اور اکثر و بیشتر عمل پاکستان کے بنیادی نظریے عقائد اور تصورات کے مخالف ہی نہیں کٹر دشمن ہیں۔ یہی حال ہماری علمی درسگاہوں کا ہے جہاں لوگوں نے مارکس، لینن اور ماؤ کے نظریات کی تشہیر و اشاعت کو ترقی پسندی اور ذہنوں کو مخصوص انداز میں تربیت دینے کے کھلے لائسنس لے رکھے ہیں۔ مگر محمد عربی اور اقبال کے تصورات اور نظریات کی ترویج و اشاعت پر رجعت پرستی کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں اور قدم قدم پر پابندیاں لگانے کی کوششیں ہوتی ہیں۔" آپ کہیں گے کہ ایسا کیوں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ صاحب اقتدار لوگ جن کا تعلق مغل شہنشاہیت اور برطانوی سامراج کے پروردوں اور ان کی اولاد سے ہے۔ اسلام کو ایک مذہب یعنی چند رسومات سمجھ رکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ یہ تمام باتیں مسجدوں اور امام باڑوں تک محدود ہوکر رہ جائیں۔ لیکن اسلام ایک نظریۂ حیات ہے ایک دینِ مکمل ہے جو انسانی زندگی کے شب و روز میں ہمہ اقسام افعال کو احاطہ کرتے ہوئے ایک سادہ اور غیر طبقاتی اور عدل و مساوات پر مبنی نظامِ حیات ہے۔ ...... زندگی کی اعلیٰ قدروں اور بالآخر انسان کو بندوں کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ اس لئے استحصالی طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد حکام، جاگیردار اور سرمایہ دار کسی کو قبول نہیں۔ یہ لوگ عوام کو دھوکہ دینے کے لئے دل سے نہیں صرف اور صرف زبان سے اسلام کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اور غیر اسلامی نظریات رکھنے والے حضرات کے مقاصد بالآخر ایک ہیں۔ یعنی ذاتی ہوس اقتدار اور لہو و لعب کی آزادی۔ اسی بنا پر عوام اور درد مند دل رکھنے والے صاحب نظر حضرات کے مسلسل احتجاج کے باوجود ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پچھلے ستائیس سالوں میں اس قوم کے سفر حیات کا رخ کعبہ کی معینہ سمت سے کئی ڈگری ہٹ چکا ہے اور کوششیں جاری ہیں کہ یا تو ہم ترکوں اور ایرانیوں کی طرح دین کو مسجدوں میں بند کرکے یورپی اقوام

"۱۹۶۵ء کی جنگ بلکہ جہاد کے بعد آپ کے نظریات میں بنیادی تبدیلی آئی۔ اس کے بعد سپاہ گری کے ساتھ ساتھ آپ نے شاعری سے کیسے نباہ کیا؟"

سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بولے" ہوں شاعری اور سپاہ گری کا نبھاؤ۔ ! سپاہ گری بھی ایک پیشہ ہے جس طرح تجارت بینکنگ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ہر پیشہ کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے لیکن دوسرے پیشوں میں جہاں منفعت کا اثر ہوتا ہے وہاں سپہ گری من حیث الکل انسان کی اجتماعی زندگی کی ایک ضرورت ہے جس کی بنیاد مادی سے زیادہ غیر مادی اقدار پر ہے۔ اس لئے سپہ گری انسان کے دوسرے پیشوں کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہے۔ ہم اپنی تاریخ کے اوراق اگر الٹ کر دیکھیں تو وہاں بھی یہ دونوں چیزیں اکثر و بیشتر متعدد افراد میں یکجا نظر آتی ہیں۔ دراصل ایک منظم زندگی کے بغیر اور ایک صحت مند جسم کی غیر موجودگی میں ایک تندرست فکر کی توقعات غلط ہیں۔ سپاہ گری نظم و ضبط اور صحت کی ضامن ہے۔ اس لئے ایک سپاہی سے اچھے ادب کی تخلیق کوئی انہونی نہیں بلکہ لازمی ہے"

خاموش ہوتے ہی میں نے انہیں چھیڑا" آپ ادب کے جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ پورا انصاف کر رہے ہیں" بولے" آپ کی بات میں سمجھا نہیں۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی" میرا مطلب ہے خود اپنے طور پر" جواب ملا" اپنے طور پر مجھے جو کرنا چاہئے اس کے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں اور مجبوریاں ہیں۔ میں ادب کی جس منزل پر پہنچ گیا ہوں وہاں ادب کے ساتھ ہمہ وقتی مصروفیت ضروری ہے لیکن معاش کے لئے جدوجہد کرنا اتنا وقت طلب ہے کہ میں ادب کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ پھر میں جو کچھ تخلیق کرتا ہوں اس کی تشہیر و اشاعت کے بغیر اپنی بات کو عوام تک پہنچانا میرے جیسے لوگوں کے لئے پاکستان میں ناممکن ہوتا جا رہا ہے" میں نے غور کیا کہ سگریٹ کا ٹکڑا جب انگلیاں جلانے کے قریب ہو جاتا ہے بے خیالی میں تو تب پھینکتے ہیں۔ ان ہی خیالات میں گم تھا کہ بولے" جی"؟ میں چونکا اپنے خیالات کے اظہار کے لئے آپ نے شاعری ہی کو کیوں ترجیح دی۔ دوسرے ذرائع سخن کو کیوں نہ اختیار کیا"

سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔ اس کا زیادہ تر انحصار انسان کی افتادِ طبع اور ابتدائی ماحول پر ہوتا ہے۔ میں نے لکھنؤ میں ہوش سنبھالا جہاں تقریباً ہر پانچواں آدمی شاعر تھا۔ پھر طبیعت بھی اس طرح کی پائی تھی اس لئے مشق کرتے کرتے شاعری میں ایک ملکہ حاصل ہو گیا۔ فوجی ملازمت کی بناء پر میرے لئے ناممکن تھا کہ میں تقاریر کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتا۔ حالانکہ زمانۂ طالب علمی سے میں ایک اچھا مقرر رہا ہوں اور آج بھی بہتوں سے اچھی تقریر کر لیتا ہوں۔ مگر تقریر کی زندگی صرف جلسہ گاہ تک ہوتی ہے اور ان کی اہمیت چند سالوں سے آگے ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شعر ایک دفعہ تخلیق ہونے کے بعد اگر موثر ہے تو صدیوں زندہ رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے شاعری کو تقریر پر ترجیح دی" یہ کہہ کر اٹھے اور الماری سے ڈوری ڈالا کپڑے کا جزدان نکالا اور سپاری اٹھا کر رکھ کر مجھے دی" شکریہ" کہہ کر میں نے سلسلہ ملایا"

یہ فرمایئے کہ ادب اسلامی کا خیال کب اور کیسے پیدا ہوا؟

سوال سنکر اطمینان سے سگریٹ سلگاتی اور مسہری کے سرہانے ٹیک لگا کر لیٹتے ہوئے کہا۔

"میں ۱۹۳۸ء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوا اور فوج کی ملازمت کے باوجود میری ذہنی وابستگی ۱۹۵۸ء تک انہی ادیبوں اور شاعروں سے رہی۔ اسی دوران پولینڈ میں روسی افواج نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے وہاں کے عوام کو جس بے دردی سے قتل کیا اور پھر رومانیہ ہنگری وغیرہ میں اپنے جبر و استبداد کا جو مظاہرہ کیا ان کی بناء پر مجھے ایک بار پھر سوچنا اور سمجھنا پڑا۔ مزید یہ کہ اس وقت تک ایوب خاں پاکستان میں برسر اقتدار آ چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایوب خاں نے اقتدار ناجائز طریقے سے حاصل کیا تھا لیکن ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے جس طرح ان کی مدح سرائی کر کے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ان حضرات کی روشن علی بھیم جی، ہارون فیملی حبیب بینک والوں اور اسی قماش کے دوسرے سرمایہ داروں سے گہرے روابط اور پرورش کی بنا پر اس تحریک اور اس کے کارکنوں کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آ گیا" اتنا کہہ کر سگریٹ ایش ٹرے میں رکھی اور اٹھ بیٹھے۔ آستینیں چڑھالیں، چہرے پر ہاتھ پھیرا اور سگریٹ دوبارہ اٹھا کر

۱۴ راگست کی صبح نو بجے طیاروں کی گھن گرج کے درمیان پی اے ایف اسٹیشن ڈرگ روڈ کی لاتعداد گیراج نما اور SHOE-BOX SHAPED بیرکوں اور ان کے اطراف سے گذرتی دبلی پتلی سڑکوں سے ھوتا ھوا جب مطلوبہ بیرک کے کوارٹر تک پہنچا تو نام کی خوبصورت سی تختی پر آسمانی رنگ میں نفاست سے لکھے ھوئے ”رحمان کیانی“ کو دیکھ کر عجیب طرح کی فرحت کا احساس ھوا۔ بے جھجک دروازہ کھٹکھٹایا۔ صاحبِ خانہ کے فرزند ارجمند نے نام پوچھا، اندر گئے، واپس آئے اور آنے کا اشارہ کیا۔ نگاھیں ڈرائینگ روم اور اس کی ترتیب و تزئین سے ذوق کا اندازہ لگانے کے لئے بے چین تھیں لیکن اس گھر اور پھر اس کمرے میں داخل ھوتے ھی خوشبو کے جھونکے کے ساتھ احساس ھوا کہ سادگی میں بھی کتنا حُسن کتنی نفاست اور کتنی اپیل ھے اور پھر جب سیف و قلم کے دھنی پر نگاہ پڑی تو ذھن کے لاتعداد دخول یکے بعد دیگرے اترتے چلے گئے۔ جسم و جان کا بوجھ ھلکا ھو گیا اور روح بہت بلند کہیں پرواز کرتی محسوس ھوئی۔ آنکھوں نے دیکھا کہ دیواروں پر اکابرین ادب کی تصاویر کے درمیان مجسم سادگی ایک کونے میں نئی مسھری پر تہبند اور قمیض زیب تن کئے مصروف تخیق تھے۔ ابھی ذھن برابر ماحول کی تصاویر نگاھوں میں اتار ھی رھا تھا کہ اچانک ”السلام علیکم“ سے چونک پڑا۔ وعلیکم السلام کہتے ھوئے شرمندگی سی محسوس ھوئی۔ فوراً مدعا بیان کیا۔ مقصد انٹرویو کے لئے وقت لینا تھا۔ انھوں نے کہا ”جو کچھ سوالات پوچھنے ھیں ابھی پوچھ لیجئے“ میں بولا ”تین چار گھنٹے لوں گا آپکے۔ وہ بولے ”آج میرا لکھنے پڑھنے کا ھی پروگرام ھے“۔ یہ کہتے ھوئے دھانے میں موتی چمکے اور یوں اجنبیت کا وہ معمولی سا احساس بھی ختم ھو گیا۔ فرزند نے میز کرسی لگا دی تھی۔ رسمی باتوں کے دوران میں نے قلم کاغذات وغیرہ درست کئے اور نفیس چشمے کے فریم میں سجی ھوئی بڑی بڑی گہری آنکھوں، چاند سے زیادہ کشادہ اور ھموار پیشانی والے خوبصورت چہرے کے نقوش، سلیقے سے نکلی ھوئی بالوں کی مانگ اور کثرتِ سگریٹ نوشی سے ادھ جلی پتلی پتلی فنکارانہ انگلیوں کا جائزہ لیا اور گلا کھنکھارا۔

”توپوں کی گھن گرج کے آشنا ذہن کو نظم و رزم کے ملاپ کا خیال کیسے آیا“؟

مسہری پر آلتی پالتی مارے، جنگ کے یوم آزادی ایڈیشن کے سرورق کی تصاویر دیکھتے اور کچھ سوچتے ہوتے یوں گویا ہوتے۔ ”میں نے ابتدائی تعلیم والد صاحب اور تایا حکیم محمد ولی صاحب سے پائی پھر چند سال قصبہ صفی پور ضلع اناؤں میں جہاں والد صاحب ایک دینی مدرسے کے معلم تھے دینی علوم کی تعلیم پائی۔

ننھیالی طور پر میں مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے خاندان سے منسلک ہوں جو نسلاً انصاری ہیں۔ نانا جان میرے ددھیال کے لوگوں کے برخلاف ایک سپاہی پیشہ آدمی تھے اور چونکہ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی (سوائے میری والدہ کے) اس لئے وہ مجھ سے اپنے بیٹے کی طرح سلوک کرتے تھے۔ زندگی کے ابتدائی حصے میں ان دو متضاد ماحولوں میں پرورش پانے کی بنا پر مجھ میں علم سے شوق اور سپاہیانہ زندگی سے محبت نے بیک وقت پرورش پائی۔

انٹرویو

زین السالکین

صاحب سیف و قلم

سے ایک ملاقات

قوم کا وہ حکم یاد نہیں کہ

"اگر کبھی پاکستان* کی حفاظت کے لئے تمہیں
جنگ کرنا پڑے تو پہاڑوں میں لڑنا، جنگلوں
میں لڑنا، دریاؤں میں لڑنا۔ میدانوں میں
لڑنا۔ آخر دم تک لڑنا اور کسی صورت میں
دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا۔"

کیپٹن احسن خاموش تھا اور خالد کی جذبات سے بھرائی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔

"دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے والو! تم صرف پاکستان سے نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام سے غداری کر رہے ہو۔ تم اسلام کی ۱۴ سو سالہ تاریخ سے غداری کر رہے ہو۔ اسلام کے اس قلعے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کی بجائے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے والو تم محمد عربیؐ کو کیا منہ دکھاؤ گے۔؟"

خالد واپس جانے کے لئے مڑا تو کیپٹن نے اُسے روکتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ "اب جب کہ فوج ہتھیار ڈال رہی ہے۔ البدر کا لڑتے رہنا عقل مندی نہیں ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ....."

ابھی کیپٹن نے اتنا ہی کہا تھا کہ خالد کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

"خاموش! خالد گرجا۔" دیکھو! سلطان ٹیپو کیا کہہ رہا ہے۔ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور کیپٹن احسن پُرنم آنکھوں سے اُسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کیپٹن احسن جنگی قیدی ہو گیا۔

اور کشور گنج میں بھی پورب پاکستان کے کئی دوسرے علاقوں کی طرح بھارتی فوج کو داخل ہوتے وقت شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

اور جب بھارتی فوج کشور گنج میں داخل ہوئی تو اس شہر کی سڑکوں پر تازہ تازہ خون بہہ رہا تھا۔ کئی نوجوان جسم اس خون میں لت پت پڑے تھے۔ انہیں میں سے ایک خالد بھی تھا جس کے ہاتھ میں اب بھی رائفل تھی اور اس کے جسم پر لگے ہوئے کتنے ہی زخموں میں سے ابھی تک تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

کیپٹن احسن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک لمبی مدت تک بھارتی قید میں رہنے کے بعد جب حد عبور کر رہا تھا تو لاؤڈ اسپیکر سے آواز آ رہی تھی۔

"مرے وطن کے پاسباں آ رہے ہیں"

کیپٹن احسن اپنے باپ کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس سے لپٹ گیا۔

"ابا جان! میں آگیا ہوں۔" بوڑھے باپ کی آواز ابھری
"بیٹا۔ تم تو آگئے ہو مگر وہ وطن کہاں ہے جس کی پاسبانی کے لئے تم گئے تھے؟"

اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ (التوبہ ۹)

اُس نے خالد سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو اُس نے اپنے ونگ کمانڈر سے دو ہفتے کے لئے کیپٹن کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی۔

۲۲ نومبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف مکتی باہنی کی تخریب کاریاں بھی شدت اختیار کر گئیں۔ کیپٹن احسن کو نارائن گنج بھیج دیا گیا۔ خالد نے یہاں پہنچ کر بھی اپنے نارائن گنج کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ملک دشمنوں کے خلاف کارروائیاں جاری رکھیں

نارائن گنج سے تقریباً ۱ میل دور "گھپ جور" میں جو کہ دریائے میگنا میں کئی میل تک پھیلا ہوا ایک جزیرہ ہے، مکتی باہنی کا بہت بڑا مورچہ قائم تھا بلکہ یہ اس پورے علاقے میں مکتی باہنی کا مرکز بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور چاندپور کے درمیان آبی شاہراہیں غیر محفوظ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۲۸ نومبر کو کیپٹن احسن کو پاک فوج کے ایک دستے کے علاوہ " البدر" کے ۴۰ رضاکاروں کے ساتھ مل کر آپریشن کا حکم ملا ان رضاکاروں میں ایک پلاٹون نارائن گنج کی تھی جن میں خالد بھی شامل تھا اور ایک کمپنی اسی مہم کے لئے ڈھاکہ سے آئی تھی جس کا کمانڈر احمد تھا۔

حملے کے دوران کیپٹن نے محسوس کیا کہ اتنی طاقت کے ساتھ یہاں قبضہ کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اس نے تجویز پیش کی کہ اس کے خیال میں چونکہ مزید فوجی کمک کے بغیر یہاں قبضہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا اس لئے فی الحال حملے کو روک دیا جائے۔ مگر احمد اور خالد نے لڑتے رہنے پر اصرار کیا۔ اور حملہ جاری رکھا ... پھر کیپٹن نے وہ منظر بھی دیکھا جب خالد تقریباً رینگتے ہوتے مکتی باہنی کے مرکزی مورچے کے قریب پہنچ چکا تھا ... اور ... ایک دم آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔

خالد وہاں آگ لگا کر واپس آچکا تھا۔

احمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے اتنا قریب جا کر گولیاں برسا رہا تھا کہ دشمن بھی سکتے میں آگیا۔ مگر اب بھی جب کہ احمد پوری طرح دشمن کی زد میں تھا وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ پاک سرزمین کی ایک ایک انچ کو ملک دشمنوں سے پاک کر دینا چاہتا تھا ... اور پھر ... ایک سنسناتی ہوئی گولی اُس کے سر میں آکر لگی۔ اور وہ اپنی حقیقی منزل کو پا گیا۔ اس کے دو ساتھی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر شہید کو واپس لے آئے۔

اب ایک بار پھر کیپٹن احسن نے حملہ روکنے کی تجویز پیش کی مگر اب جب کہ ان کے کمانڈر کے جسم سے رستا ہوا گرم گرم خون البدر کے مجاہدوں کی آنکھوں کے سامنے تھا انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے ....
اور پھر تھوڑے ہی وقت میں پورا گھپ جور ملک دشمنوں سے پاک ہو چکا تھا۔

دوسرے روز خالد میمن سنگھ کے لئے روانہ ہو گیا۔

۳ دسمبر کو مغربی محاذ پر بھی جنگ چھڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی کیپٹن احسن کو واپس میمن سنگھ پہنچنے کا حکم ملا۔

مشرقی محاذ پر ائر فورس نہ ہونے کے باوجود پاک فوج انتہائی دلیری کے ساتھ لڑ رہی تھی اور دشمن انتہائی کوششوں اور زبردست نقصان اٹھانے کے باوجود سرحدوں سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا تھا اور پھر دشمن نے یہ دیکھتے ہوئے کہ پاک فوج کی پہلی دفاعی لائن کو بھی توڑنا ان کے بس کی بات نہیں۔ پاک فوج کے عقب میں چھاتہ بردار فوج اتارنی شروع کر دی۔ صورتِ حال اگرچہ بڑی نازک تھی مگر فوجیوں کے حوصلے اب بھی بلند تھے

اور پھر .... !

.... ۱۶ دسمبر کی صبح جب کیپٹن احسن نے خالد کو بتایا کہ پاکستانی فوج ہتھیار ڈال رہی ہے تو اُس نے ماننے سے انکار کر دیا وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا مگر جب کیپٹن نے اُسے بتایا کہ واقعی یہ حقیقت ہے، تو اُس پر گویا قیامت گزر گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں اور وہ لڑکھڑا گیا کیپٹن نے اُسے سہارا دیا۔ اُسے پانی پلایا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے آنکھیں کیپٹن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ کیپٹن نے اُسے بتایا کہ فوج تو یہ نہیں چاہتی تھی مگر اُسے ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خالد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔

"کس نے حکم دیا ہے۔؟"

کیپٹن نے کہا۔ "غالباً یحییٰ خاں کا حکم ہے۔"

خالد گرجا۔ "یحییٰ خاں کا حکم ماننے والو! تمہیں بتائے

جنگل میں تخریب پسندوں سے پاک کرنے کے لئے آپریشن کے لئے جا رہا ہے تو یہ سوچتے ہوئے کہ پاک فوج تو اس جنگل سے بالکل ناواقف ہے اور یہاں مکتی باہنی کی طاقت بھی کافی زیادہ ہے۔ اُس نے اپنے کمپنی کے ہمراہ جنگل میں داخل ہو کر مکتی باہنی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ پاک فوج کا دستہ گھیرے میں آ چکا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب نے دیکھ لیا۔

کیپٹن احسن اور خالد اب گہرے دوست بن چکے تھے۔ اُدھر شرپسندوں کے خلاف پاک فوج اور البدر کے مشترکہ آپریشن جاری تھے۔

ایک روز جب کیپٹن نے خالد سے کہا کہ اس علاقے میں مکتی باہنی کا لیڈر کوئی بڑا خطرناک آدمی ہے وہ کتنی ہی تخریبی کارروائیوں کی قیادت کر چکا ہے اُسے پکڑنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے تو خالد نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے پکڑنے کے لئے کئی بار مختلف جگہوں پر چھاپے مار چکا ہے اور آج بھی اس سلسلے میں وہ کشور گنج جا رہا ہے اور امید ہے کہ یہ چھاپہ کامیاب رہے گا۔ کیپٹن کے پوچھنے پر کہ وہ چھاپہ کن اطلاعات کی بنیاد پر مار رہا ہے خالد خاموش ہو گیا اور پھر کیپٹن کے اصرار پر اُس نے صرف یہ کہا کہ شاید آج رات کو بتا سکوں! کیپٹن نے پوچھا کہ وہ چھاپے میں کتنے آدمی ساتھ لے کر جا رہا ہے تو اُس نے کہا کہ میں اور میرے دوست ماجد اور سلیم ہی کافی ہیں کیپٹن کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ اِن تینوں کی دلیری اور ذہانت کا پہلے ہی قائل ہو چکا تھا اس لئے خاموش رہا۔

رات کے تقریباً ۱۱ بجے ہوں گے کہ خالد، ماجد اور سلیم کیپٹن کے پاس پہنچ گئے۔ کیپٹن نے دیکھا کہ ایک چوتھا آدمی بھی ان کے ساتھ ہے اور ان کی گرفت میں ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ چھاپہ کامیاب رہا ہے اور مکتی باہنی کا مقامی لیڈر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیپٹن کے پوچھنے سے پہلے ہی ماجد نے اس کی تصدیق کر دی اور پھر کیپٹن اُس لیڈر سے مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا مگر وہ کسی قسم کی معلومات مہیا کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کیپٹن نے اپنی رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھ دی تو اُس نے کہا۔

"کیپٹن صاحب! میں آپ کا دشمن ہی سہی مگر خالد کا بھائی تو ہوں، کیا مجھے بھی گولی مار دو گے؟"

اور کیپٹن سناٹے میں آ گیا۔

اُس نے تقریباً چیختے ہوئے اُس سے پوچھا۔ کہ "تم کیا کہہ رہے ہو۔؟"

اُس نے دوبارہ بھی کہا کہ "میں خالد کا بھائی ہوں۔"

کیپٹن نے خالد کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اور اُس نے کہا۔

"ہاں! واقعی یہ میرا بھائی ہے۔ ہمارا باپ عوامی لیگ کا مقامی رہنما ہے، ہم دو بھائی ہیں اور میرا یہ بھائی مکتی باہنی کا لیڈر ہے۔"

کیپٹن نے یہ سُن کر اپنی رائفل زمین پر پھینک دی اور کہا کہ "اگر یہ ایک مجاہد کا بھائی ہے تو اسے گولی مارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اور پھر... رائفل خالد کے ہاتھ میں تھی۔

اُس نے اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم اگرچہ میرے بھائی ہو مگر اس وقت معاملہ پاکستان* کی سالمیت کا ہے پاکستان جو کہ اسلام کا ایک قلعہ ہے اور جس کی حیثیت ایک مسجد کی سی ہے اگر تم اس مسجد کو نقصان پہنچانے سے باز آنے کا وعدہ کرو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ یہاں بدر کی تاریخ دُہرائی جائے گی اور اس مسجد کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی خونی رشتہ میری راہ میں حائل نہیں ہو سکے گا۔"

اس کا بھائی اب بھی خاموش تھا۔ غالباً وہ ہندوؤں اور علیحدگی پسندوں کے دیئے ہوئے نام نہاد "آزادی" کے نعرے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا اور پھر اپنے بھائی کے جملوں کی صداقت پر بھی شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اس کا بھائی تھا — !

مگر۔ پھر گولی اُس کے سینے سے پار ہو چکی تھی۔

ایک تخریب پسند زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا اور اس کا مجاہد بھائی عزم و استقامت کی تصویر بنا اُس کے پاس کھڑا تھا.... اور.. پھر... وہ آنکھوں میں آنسو لئے کیپٹن احسن سے لپٹ گیا جو کہ خود اس سارے منظر کو دیکھ کر رو پڑا تھا۔

نومبر کے وسط میں کیپٹن احسن کو ڈھاکہ جانا پڑا اور جب

بھیجتا رہا۔

پاک فوج اگرچہ علیحدگی پسندی کی تحریک کو کچل چکی تھی اور مشرقی پاکستان میں امن و امان بحال کر چکی تھی مگر جب مکتی باہنی کے تربیت یافتہ غنڈوں نے واپس آکر تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں تو فوج کے لئے بڑی مشکل صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ کیونکہ دشوار گزار راہوں کی اجنبیت اور زبان کی اجنبیت ہی کٹھن صورتِ حال سے دوچار کرنے کے لئے کافی تھی اور پھر جب عوام بھی مکتی باہنی کے غنڈوں کے ڈر کی وجہ سے فوج سے تعاون کرنے سے ہچکچانے لگے تو اس عوامی اجنبیت نے صورتحال کو مزید نازک بنا دیا۔

کیپٹن احسن اُن دنوں میمن سنگھ میں تھا جب میجر رؤف نے اُسے یہ خوش خبری سنائی کہ اب یہ کٹھن صورتِ حال ختم ہونے کو ہے کیونکہ مشرقی پاکستانی نوجوانوں کا ایک گروہ "البدر" کی صورت میں منظم ہو کر سالمیتِ پاکستان کے لئے اپنے سروں سے کفن باندھ چکا ہے اور ملک دشمنوں کے خلاف پاک فوج کے شانہ بشانہ جنگ کرنے کے لئے میدان میں آچکا ہے۔ کیپٹن احسن کے لئے یہ خبر نئی نہیں تھی مگر اُسے ابھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے واقعات سے اُسے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اور پھر خاص طور پر سنہرے دیس کی صورتِ حال کی مناسبت سے اسے یہ باتیں محض سنہرے خواب ہی معلوم ہوتی تھیں۔

اور پھر وہ وقت اس کے لئے انتہائی نازک تھا جب وہ شہر کے پاس ہی جنگل میں مکتی باہنی کے خلاف آپریشن میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ ۷۰ افراد تھے اور وہ ایک سرے سے داخل ہو کر اپنی دانست میں مکتی باہنی کو دھکیلتے ہوئے تقریباً جنگل کے وسط تک آچکے تھے جب یکایک چاروں طرف سے گولیوں کی زبردست بارش شروع ہو گئی تب انہیں پتہ چلا کہ وہ پوری طرح مکتی باہنی کے گھیرے میں آچکے ہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو لیٹ جانے کا حکم دیا اور خدا سے مدد کی دعا مانگنے لگا اُسے معلوم تھا کہ اب کوئی معجزہ ہی اُسے یہاں سے بچا سکتا ہے...... اور پھر واقعی خدائی مدد آ پہنچی۔

کیپٹن احسن اور اس کے ساتھی دیکھ رہے تھے کہ اُن پر گولیاں چلانے والے خود کسی اور کی گولیوں کی زد میں ہیں اور اب خود کو بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مکتی باہنی کے گھیرے کو پوری طرح گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور انہیں بھاگنے کے لئے کوئی سمت نظر نہیں آتی۔ پہلے تو کیپٹن سمجھ رہا تھا کہ پاک فوج کا کوئی دستہ مدد کو آیا ہے مگر جب مکتی باہنی کو گھیرے میں لے لیا گیا تو وہ سخت حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔؟ وہ جانتا تھا کہ یہاں مکتی باہنی کو گھیرے میں لینا فوج کے لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ فوج اس علاقے سے بالکل ناواقف تھی اور اس کام کے لئے اس علاقے کے دشوار گزار راستوں اور اس خوفناک جنگل کے چپے چپے سے واقف ہونا لازمی تھا۔ وہ ابھی اس معمے کو حل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور پھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پورا جنگل گونج اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مکتی باہنی پر زوردار حملہ ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی اور اس طرح اس سے نزدیک آ رہی تھی۔ اب کیپٹن نے اپنے ساتھیوں کو زبردست فائرنگ کرنے کا حکم دیا جس سے رہی سہی کسر بھی نکل گئی اور تخریب پسند گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے اور چند ہی منٹوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ تقریباً ۲۰۰ افراد تھے جن میں سے ۴۰ ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے۔ کیپٹن اور اس کے ساتھی جب انہیں حراست میں لینے کے لئے آگے بڑھے تو دوسری طرف سے کچھ اور لوگ بھی انہیں گرفتار کرنے کے لئے پہنچ چکے تھے اور ابھی تک پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ کیپٹن احسن تخریب پسندوں کی بجائے انہی کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف سے ایک بیس بائیس برس کا نوجوان تقریباً بھاگتا ہوا آیا۔ اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کیپٹن کو بتایا کہ اس کا نام خالد ہے اور وہ "البدر" کی اس کمپنی کا کمانڈر ہے اور کشور گنج کا رہنے والا ہے۔ اس نے اس مہم کے بارے میں کیپٹن کے استفسار پر بتایا کہ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا ایک دستہ اس

لیفٹیننٹ

احسن سے کیپٹن احسن ہوئے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ اُسے مشرقی پاکستان جانے کا حکم مل گیا اور پھر تیسرے روز جب وہ اپنے گھر والوں سے دور جا رہا تھا۔ اس کی ماں اور اس کے باپ نے، جو کہ خود ایک ریٹائرڈ فوجی تھا اور ۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ اُسے ہزاروں دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ یہ دُعائیں صرف اس کی ذات تک محدود نہ تھیں بلکہ یہ اس کے ملک اور قوم کے لئے بھی تھیں اور اُسے اپنے عظیم فرض کا احساس بھی دلا رہی تھیں۔

اور پھر فروری ۷۱ء کے وسط تک وہ ڈھاکہ چھاؤنی میں تھا ایک روز اُسے کسی کام سے شہر جانا پڑا تو اسے اپنے گرد و پیش میں لاشعوری طور پر کسی پُراسراریت کا احساس ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر فضا میں گھورنے لگا مگر اُسے فضا میں بھی پُراسراریت کے وجود کا احساس ہو رہا تھا اور پھر وہ کچھ گھبراتے ہوئے "خدا خیر کرے" کہہ کر واپس چھاؤنی میں آگیا۔

مارچ کے آغاز میں قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کا اعلان ہوتے ہی پُراسرار خاموشی ٹوٹ چکی تھی اور پھر اس کا شہر میں جانا بھی مشکل ہو گیا کیونکہ انتہا پسند عناصر نے جو کہ عرصے سے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اس مقصد کے لئے انھیں بھارتی اسلحہ بھی بڑی مقدار میں پہنچ چکا تھا، ڈھاکہ میں نظم و نسق کو تباہ کر کے نہ صرف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی بلکہ عملی طور پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ یہ صورت صرف ڈھاکہ تک ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ مشرقی پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پھیل چکی تھی اور اب یہ لوگ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا قیامِ پاکستان کے وقت بھارت کے مختلف علاقوں سے آکر وہاں آباد ہو گئے تھے، قتلِ عام شروع کر چکے تھے . . . . اور جب صورتِ حال انتہائی سنگین ہو گئی اور کھلی بغاوت کی سی صورت پیدا ہو گئی تو فوج کو کارروائی کا حکم ملا۔ پاک فوج نے بہت ہی کم مدت میں اس بغاوت پر قابو پا لیا اور ملک دشمن اور تخریب پسند عناصر بھاگ کر بھارت چلے گئے اور پھر بھارت گوریلا جنگ کی تربیت دے دے کر انھیں مکتی باہنی کی صورت میں واپس

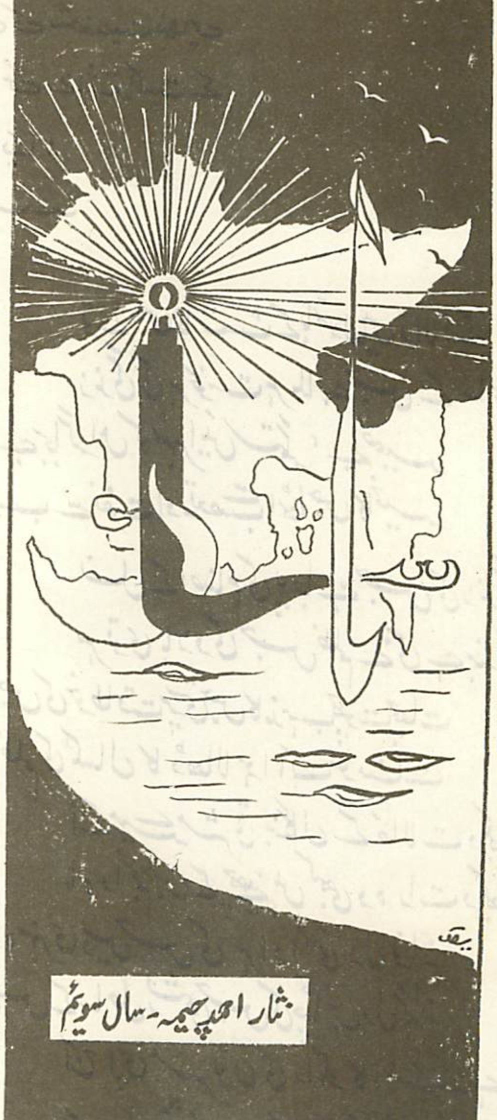

نثار احمد چیمہ ۔ سال سوئم

لینن کے نام

لینن سے مراد اس کی شخصیت نہیں
بلکہ وہ پیغام ہے جو اس نے اشتراکیت کے
نام سے دنیا کو دیا۔

سن رہے تھے تو نے ویرانوں کو بخشی ہے بہار
غل تھا تو نے بے نواؤں کو کیا ہے باوقار
لوگ کہتے تھے کہ تو حامی ہے ہر کمزور کا
زور توڑا تو نے ہر مغرور اور پشہ زور کا
ایسے لوگوں کی بڑی تعداد بستی ہے یہاں
جو سمجھتے تھے تجھے پیغمبر امن و اماں
لیکن اے لینن ملا ہے آج ہم کو یہ ثبوت
تھا ترا پیغام اور وعدہ تو تارِ عنکبوت
تیرا سارا فلسفہ تھا دامِ ہم رنگِ زمین
یعنی مصنوعی تھے تیرے تاج کے سارے نگیں
کوئی مقصد تھا تو بس اتنا کہ ہو طاقت کا راج
سچ بتا اس سے بڑا بھی ہو گا کوئی سامراج
حیف اس بھارت کی چوکھٹ پر جھکی تیری جبیں
بے گناہوں کے لہو سے تر ہے جس کی آستیں

تو نے اس فاشسٹ کے ہاتھوں میں ڈالا آ کے ہاتھ
زندگی کی ہر نحوست ہر بلا ہے جس کے ساتھ
ہے بجا گر اس کو ٹھہرائیں ستمگر، بے ضمیر
سب سے نفرت اور تعصب سے اٹھا جس کا خمیر
نسل کے اصنام کی پوجا ہے جس کی زندگی
ہر قوی بازو کی جس ظلم نے کی ہے بندگی
جس کی خو طاقت پرستی جس کا مذہب چھوت چھات
ظلم کی ٹکسال کا ڈھالا ہوا اک سومنات
آ کے میرے مشرقی بنگال کے حالات دیکھ!
ماہ و انجم جس کے چھنے ہیں کبھی وہ رات دیکھ!
وہ سنہری دیس جس کی ہر ادا تھی دل نواز
جس کے ساحل ریشمی جس کی جٹائیں دل گداز
آج اپنی مسرتوں کی راکھ کا انبار ہے
ایک دلِ آشفتہ ہے اک دیدۂ خونبار ہے

کیا یہی وہ امن ہے اے شعلۂ رو آتش پرست
جس کا داعی بن کے تو اٹھا تھا اے طاقت پرست

رفتار ہے یا کاریں۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اور اس حد تک کہ یہ اس کا مشاہداتی دور ہوتا ہے اور یہی اس کی شخصیت کی تکمیل میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جب ایک مرتبہ کسی چیز کو پرکھ لیتا ہے تو اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیتا ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ پھر اگر وہ ایک بار کسی گرم چیز کو ہاتھ لگالے تو اسے اس کے نقصان دہ ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور آئندہ اس سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اگر اتفاق سے وہ دوبارہ وہی غلطی کرے تو سختی سے اپنے دل میں تہیہ کر لیتا ہے کہ آئندہ ہرگز یہ غلطی نہ کرے گا۔ اس فیصلہ تک وہ اپنا جائزہ لیکر پہنچتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب مجھے معلوم تھا کہ یہ چیز نقصان دہ ہے تو دوبارہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ جو اس نے اپنی گرفت کی۔ یہی اس کی اصلاح کا باعث بنتی ہے اور زندگی میں ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔

اب اگر عوام کا احتساب اور ان کے ماضی کا جائزہ لیا جائے تو احتساب کے اور بہت سے پہلو واضح ہو جائیں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ احتساب نے زندگی کے اس شعبہ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

جن اقوام نے صفحۂ ہستی پر اپنا وجود قائم رکھنے کی جدوجہد اور کوشش کی انہوں نے احتساب کو اپنا رہبر بنایا لیکن جن اقوام نے اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا آخر کار ان کا وجود اس دہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ دور کیوں جائیں، تاریخ اسلام ہمارے سامنے ہے۔ قوم نوح، قوم عاد و ثمود اور بنی اسرائیل کیوں تباہ ہوئیں۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ دیکھو میری نافرمانی نہ کرو اور سیدھے راستے پر چلو، پھر اس نے حوالے بھی دیئے کہ ماضی میں جن قوموں نے ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی ان کا انجام کیا ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ان اقوام نے اپنا احتساب نہیں کیا اور آخر کار وہ پستی و تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئیں۔

اس کے برعکس بعض اقوام ایسی تھیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنا احتساب کیا اور وقفہ وقفہ سے اپنے حال کا اپنے ماضی سے موازنہ کیا اور اس کے ذریعے اپنا راستہ تلاش کیا۔ انہوں نے مستقبل کے حادثات، واقعات اور تجربات کی روشنی میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا اور پھر انہیں ترقی کی منازل طے کرنے سے کوئی نہیں روک سکا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب قیصر و کسریٰ، فارس و ہسپانیہ مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہوتے۔ انہوں نے سمندروں پر حکومتیں کیں۔ ہسپانیہ کی سرزمین آج بھی اس کی گواہی دیتی ہے اور یہ سب احتساب کے زینے پر چڑھ کر ہی حاصل کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی بلند عمارت کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے زینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کی معاشرتی و تہذیبی قدروں میں حقیقت کی نگاہ سے جھانک کر دیکھئے تو آپ کو ان کی درجہ بدرجہ ترقی کا عکس نظر آئے گا۔ موہنجوڈارو کی کھدائی سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ اپنے آپ کو موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے مکانات بناتے تھے جن کی دیواریں کئی فٹ چوڑی ہوتی تھیں۔ شہروں کی آبادی گھنی ہوتی تھی کیونکہ ذرائع آمد و رفت محدود ہوتے تھے لیکن آج دیواریں کنکریٹ کی اور چند انچ چوڑی ہیں۔ شہر میلوں کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غرض کچھ مواد ایئر کنڈیشنر دے رہے ہیں اور کچھ طرز عمارت اور کچھ وہ حقائق جو ایک تجربہ کے بعد سامنے آتے ہیں۔ اور انسان اگر نہ بھی چاہے تو ان سے کچھ نہ کچھ اپنی اصلاح کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اب آیئے اس عالمگیر حقیقت کی طرف۔ جس سے ہر شخص واقف ہے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خالق اپنی مخلوق اور موجد اپنی ایجاد کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے وہ اور کوئی چاہے، کتنی ہی کوشش کرے، نہیں جان سکتا ہے کیونکہ صرف خالق اور موجد ہی جانتا ہے کہ اس کی مخلوق اور ایجاد کی بقا اور بہتری کس میں ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسکا خمیر کہاں سے اٹھا ہے۔

لہٰذا جب ہم خدا کی مخلوق ہیں اور وہ ہمارا خالق ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ مشورہ دیتا ہے اور تنبیہہ کرتا ہے کہ ہر قدم پر اپنا محاسبہ کرو تو ایسا نہ کرنے کا ہمارے پاس کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

لہٰذا ترقی چاہے کسی قسم کی ہو، کسی شخص کی انفرادی ترقی کسی گھرانے کی کلی ترقی، کسی قبیلے کی اجتماعی ترقی، یا کسی قوم کی عالمگیر ترقی یا ترقی کا کوئی بھی رنگ ہو۔ "احتساب" اس کی بنیاد ہے۔

اس جدوجہد کے لئے شاعر نے بھی اپنے خیالات کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا

رائٹرز فورم کے زیر اہتمام ہونیوالے مقابلۂ
مضمون نویسی میں آنیوالا دوسرا انعامی مضمون

احتساب ارتقا کیلئے ضروری ہے

غزالہ ابدالی
سالِ اوّل

یہ ایک کائناتی سچ ہے اور عالمگیر حقیقت کہ احتساب ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ ارتقاء چاہے کسی فرد کا ہو یا گھرانے کا، کسی قبیلہ کا ہو یا قوم کا۔ معاشرتی و تہذیبی ہو یا سائنسی و فنی، اخلاقی و روحانی ہو یا مادی و دنیاوی اس کے لئے فرد، گھرانہ، قبیلہ یا قوم کو اپنا احتساب کرنا لازمی ہے۔ بغیر احتساب کئے اور جائزہ لئے بغیر کہ ہم نے ماضی میں کیا کیا اور اس کا کیا پھل چاہا۔ ارتقا کی منازل طے کرنا ناممکن ہے۔

احتساب کے معنی جانچ، پرکھ، گرفت اور محاسبہ کے لئے جاتے ہیں اور اس کے لئے آج کل کے سائنسی دور میں یہ واضح مثال موجود ہے۔ جب انسان چاند پر جانا چاہتا تھا تو اس نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے راکٹ سے تجربات کرنے شروع کر دیئے۔ پھر ہر سفر کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ دوران سفر کیا خامی پائی گئی اور کیا کمی محسوس کی گئی۔ پھر اگلا تجربہ کیا جو پہلے سے بہتر تھا۔ اس طرح انسان رفتہ رفتہ اپنے سائنسی نظام میں اصلاحات کرتا گیا۔ اور آج ہم اور آپ نے یہ دیکھ لیا کہ انسان نے آخر کار پچھلے تجربات کی روشنی میں اپنی اصلاح کر کے اپنی منزل مقصود "چاند" کو پا لیا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ غار میں رہنے والے انسان نے کس طرح ترقی کر کے آج کے دور میں قدم رکھا۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب انسان غار میں رہتا تھا۔ پتوں سے تن ڈھانپتا تھا اور نوکیلے پتھروں اور لکڑی کے اوزاروں سے شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتا تھا پھر رفتہ رفتہ انسان نے اپنے حواس خمسہ کی مدد سے اپنا معیار زندگی بلند کیا۔ وہ پتھروں کے اوزاروں سے دھات تک آیا اور پتوں کی ستر پوشی سے سوفیشی کے لباس تک آیا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ جاننے میں مشکل نہیں ہوگی کہ ان دونوں کے درمیان یعنی ایک طرف جاہلیت اور پستی اور دوسری طرف عروج و بلندی، وہ کون سا ذریعہ یا پگڈنڈی ہے جو ان سروں کو ملاتا ہے۔ پہلے لکڑی کے تختے کے نیچے گول پتھر گھومتے تھے اور آج بسوں کے نیچے شاندار ٹائر۔ بظاہر تو زمین و آسمان کا فاصلہ ہے مگر حقیقت میں اس پستی اور بلندی کو ملانے والا ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ احتساب یہ طویل فاصلے انسان کی خود احتسابی نے ہی طے کرائے ہیں۔

ایک نہایت آسان مثال لے لیجئے۔ جب بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسے دنیا کی کسی چیز کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ آگ اور برف زمین اور آسمان، جانور اور ٹریفک میں فرق نہیں جانتا۔ وہ نہیں جانتا کہ آگ نقصان دہ ہے یا پانی، زمین لامحدود ہے یا آسمان اور یہ کہ جانور زیادہ تیز

اس کے بعد وہ اخلاقی ارتقا..... جو گناہوں اور غلطیوں کی معافی کی صورت میں پیش آیا۔

..... ارتقار کی وہ پہلی منزل.....

ابتدائے آفرینش سے موجودہ دور تک آتے آتے تاریخ جانے کتنی تبدیلیاں پیش کرتی ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان ارتقار کی رو بر منزلیں کبھی۔

ارتقا لفظی طور پر ترقی کے ہم معنی ہے یعنی اگلا بہتر قدم۔

ترقی کی جانب اگلا قدم اسی وقت ہی اٹھ سکتا ہے جب ہمیں پتہ ہو کہ اگلا قدم واقعی ہمیں ایک نئی منزل اور ایک اونچے مقام تک لے جائے گا. ترقی کی جانب اگلا قدم اسی وقت اٹھ سکتا ہے جب پچھلے قدموں کا شمار بھی ہو۔

انسان یا اقوام...! جب بھی شادمانی یا کامرانی کا تاج سر بلند اپنے قدموں میں دیکھتی ہے جب بھی انہیں خوشحالی کا کوئی دور نصیب ہوتا ہے تو وہ اس مسرت کے نشے میں اس قدر بدمست ہو جاتی ہیں کہ یہ نہیں سوچتی کہ ان کی اس بدمستی نے میخانہ میں کیا انقلاب بر پا کر دیا۔ وہ یہ نہیں دیکھتیں کہ اس شادمانی کے بعد بدحالی کا دور بھی آ سکتا ہے. اور یہی سوچ انہیں اس راستے پر لے جاتی ہے جہاں قدم قدم پہ ذلت اور نامرادی کی کھائیاں منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو صرف پچھلے کئے ہوئے کاموں اور اٹھے ہوئے قدموں کو پلٹ کر کچھ اس طرح دیکھنا کہ یہ قدم کہاں پر راستے سے ہٹ گئے اور پچھلے کئے ہوئے کام کہاں پر غلط ہو گئے ہمارے اگلے اقدامات کو درست کر سکتا ہے.

اپنے پچھلے قدموں کو دیکھنا..... اور کچھ اس طرح دیکھنا کہ یہ قدم کہاں کہاں پہ لڑکھڑائے. کہاں کہاں پہ انہوں نے راستے کے پتھروں کو چراغ راہ جانا، کہاں کہاں انہوں نے اپنے راستوں کو چھوڑ کر غلط پگڈنڈیوں پر چلے کہاں کہاں انہوں نے لغزش کی اور کہاں غلطیاں۔

یہی حقیقت اگلے راستے کے پتھروں کو ہٹاتی ہے امید کے چراغ روشن کرتی ہے اور دور..... ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہے پاکستان ہمارا اپنا دیس ہے. اگر ہم اس عنوان سے اپنے وطن کی دیواروں کو دیکھیں تو نوشتہ دیوار صاف صاف یہی کہہ رہا ہے کہ وہ پچھلے ۲۷ سال وہ سازشیں وہ غیروں کے ستم، اپنوں کی بے رخی، لٹیروں اور قزاقوں کا حملہ، وہ باد سموم کے جھونکے۔

یہ قوم بے حس ہی رہی. ہم سوئے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں پر جب گنگا کا پانی بہتے لہو سے سرخ ہوا جب بیت المکرم کے مینار لرز لرز اٹھے جب سلہٹ کی پہاڑیاں بربریت کی تصویر بن گئیں. تو ہم نے جانا کہ ہم لٹ گئے. ہمارا پوربو دیش چھن گیا. ہمارا بازو کٹ گیا۔ یہ بہتے ہوئے لہو کے قطرے جو آج بھی شام غم میں شفق کی لالی بن کر بکھر رہے ہیں یہی کہہ رہے ہیں کہ اب تو اٹھ جاؤ. اب تو سوچ کیا کیا لٹ گیا. وہ کارواں جو رہبر کے روپ میں رہزنوں کے سے ظلم کا شکار ہو گیا. اب تو رہبروں اور رہزنوں کو جان لو اب تو وہ چہرے پہچان لو جو نقاب بدل بدل کر تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں اب تو وہ خلوص پرکھ لو جو دھوکہ بن کر تمہیں لٹوا چکا ہے۔

احتساب اپنے کئے کی جانچ اپنے اعمال کی پکڑ۔ اپنے قدموں کو سنبھال کر اٹھانا....

ارتقار.... منزل کی جانب بڑھنے والا اگلا قدم.....

ترقی کی بہترین منزل... عروج کی راہ.... سر بلندی کا راستہ۔

جانے کتنی صدیاں بیت گئیں. کتنے فاصلے آئے.... کتنے کارواں منزل سے ہمکنار ہوئے. کتنی تاریخیں بنیں. کتنی داستانیں وقوع ہوئیں کتنے ہی سکندر فاتح اعظم کا روپ دھارے ہوئے آئے کتنے ہی تخت جم کر اکھڑے پر یہ سب کیوں ہوا. صرف یونہی تو کہ جنھوں نے اپنے ہر قدم کی پیمائش کی. ہر عمل کی آزمائش کی. ہر آواز کو بانگ درا جانا ہر لمحے کو عرصہ آخر جانا وہ کامیاب ہوئے اور رہے. انہوں نے عزت و شادمانی کا تاج سر پر رکھا. انہوں نے منزل کو پایا. اور وہی ارتقار کی بلند ترین چوٹی تک پہنچے۔

احتساب کرتے رہو....!

اپنے ہر قدم کا.... اپنے ہر عمل کا.... اپنے ہر لمحے کا۔

یقیناً.... ارتقار... کے لئے.....

رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام ہونیوالے مقابلۂ
مضمون نویسی میں آنیوالا پہلا انعامی مضمون

احتساب
ارتقاء کیلئے ضروری ہے

★ عزیزہ انجم - سال اوّل ★

قوموں کی زندگی میں بارہا مختلف ادوار پیش آتے ہیں. قومیں کبھی سربلندی سے سرفراز ہوتی ہیں، کبھی حادثۂ زوال سے پامال. قوموں کو کبھی عروج و سرفرازی کی بلندی نصیب ہوتی ہے جہاں کامرانی اور شادمانی کا تاج زمانہ ان کے قدموں میں پیش کر دیتا ہے اور کبھی ذلّت و نامرادی کی گہری کھائیاں قوموں کے آگے منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔

مگر...... ؟ یہ سب کیوں ہوتا ہے. یہ عروج یہ زوال یہ بلندی یہ پستی یہ نشیب یہ فراز قوموں کی تاریخ میں کیوں آتے ہیں.... ؟ کبھی شادمانی و مسرت کا حسین دور اور کبھی ذلت و نامرادی کی تاریکی.... ؟ اس سوال کا جواب خود پاکستان کی تاریخ کا یہ عہد پیش کر رہا ہے جس میں ہم زندہ ہیں.

آج ہم اپنے اردگرد، اپنے وطن، اپنے ملک میں کیا کچھ دیکھ رہے ہیں اگر اس کو ایک مثال کی مانند سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر قومیں ہر ہر قدم پر اپنے اعمال کی جانچ کرتی رہیں، اگر انہوں نے اپنے ہر آنیوالے دن کو زندگانی کا اہم ترین باب سمجھا تو یقیناً اگلا سورج خوش بختیوں کی کرنیں بکھیرتا نمودار ہوتا ہے.

لفظ "احتساب" اپنے دامن میں اسی اہم ترین حقیقت کو چھپائے ہوئے ہے. احتساب اگر دیکھا جائے تو صرف ایک چھوٹی سی بات یعنی "پڑتال" کا معنی پیش کرتا ہے. مگر یہی چھوٹا سا مطلب پوری کی پوری زندگی کو نئی راہ پر گامزن کر دیتا ہے.

"احتساب" کو خواہ سطحیت کی نظر سے دیکھا جائے یا جامعیت کی روشنی میں، خواہ احتساب کو انفرادی زندگی میں شامل کیا جائے یا اجتماعی معاشرہ میں، خواہ احتساب ایک فرد کا ہو یا پوری قوم کا، ہر ہر معنی میں، ہر ہر موڑ پہ احتساب لغزشوں اور کوتاہیوں کی "پکڑ" اور آئندہ اٹھنے والے ہر ہر قدم کو سوچ کر اٹھانے کا نام ہے.

"ارتقا"...! اگر دیکھا جائے تو ارتقا اتنے بڑے اور وسیع معنی کو لئے ہوئے ہے.

انسانیت کی پوری تاریخ پر ذرا نظر تو ڈالیئے.......

وہ ابتدائے آفرینش کا اول ترین دور...... وہ آدم و حوا کی جنت...... وہ ایک غلطی اور اس پر خدا کی آواز....

وہ پہلا احتساب...... جو انسان کو پیش آیا.... اور

فکرو نظر میں آفاقی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ان کی شاعری میں اک انقلاب سا آ گیا۔ سفرِ یورپ کے دوران اقبال نے یورپ کی کئی علمی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، وہاں انہوں نے یورپ کی ترقی بھی دیکھی جس کا موازنہ انہوں نے مسلمانوں کی خستہ حالی سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس علمی اور تہذیبی ترقی کا بیج تو مسلمانوں ہی نے بویا تھا، لیکن اب اس دور کے مسلمان اپنے آباو اجداد کے لگائے ہوئے پودے کی حفاظت نہ کرسکے اور اب اس درخت کے ثمر کا غیر مسلم اقوام فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

اپنے واپسی کے سفر کے دوران اقبال اسپین بھی گئے، وہی اسپین جہاں مسلمان سو سال سے زائد عرصے تک حکومت کر چکے تھے اب وہاں کا یہ حال تھا کہ قرطبہ کی پرشکوہ جامع مسجد کو گرجا گھر میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ اقبال کی معرکتہ الآرا نظم "قرطبہ کی جامع مسجد" اسی سفر کی یادگار ہے۔

سفرِ یورپ کے دوران ان کی شاعری کا آہنگ و انداز بدلا اور یہیں سے اس اقبال کی بنیاد پڑی جو ایک عظیم اسلامی فلسفی و مفکر ہے اور ان کی شاعری کا یہی دور ہے جو انہیں تمام دوسرے اردو شعراء سے ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ اقبال وطن پرستی کے محدود دائرے سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور وہی اقبال جو پہلے یہ کہتا تھا کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" وہی اقبال اب یہ ترانا گاتا ہوا نظر آتا ہے کہ

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اور اقبال وطن کے تصور کی اس طرح نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کا یہ نظریہ عین اسلامی نظریہ ہے، کیونکہ اسلامی نظریئے کے مطابق جس ملک میں یا جس جگہ مسلمانوں کو اسلامی احکام بجالانے کی مکمل آزادی نہ ہو، وہاں سے ترکِ وطن کرنے کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اقبال کی شاعرانہ زندگی کے اس پس منظر میں ان کے فلسفۂ خودی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ خودی دراصل اقبال کے شاعرانہ پس منظر کی فلسفیانہ کیفیت کا نام ہے۔

لفظِ خودی، "خود" سے مشتق ہے اور اس کے معنی کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ اقبال سے پہلے خودی کا لفظ غرور و تکبر کے مضمون میں استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کے ساتھ اگر تھوڑی بہت رعایت رکھی جاتی تھی تو وہ صوفیائے کرام کی مجالس تھیں، جہاں یہ لفظ نفی ذات کے مضمون میں استعمال ہوتا تھا لیکن یہ بہت محدود پیمانے پر تھا اور عام لوگ اس اصطلاح سے ناواقف تھے۔ اقبال نے لفظِ خودی کو علامتی معنی دیئے ان کے یہاں خودی کے معنی خود کو جاننا اور پہچاننا ہے۔

ے اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے گویا خدا کو پہچانا۔ گویا اقبال کے یہاں فلسفۂ خودی دراصل میراثِ مومن، اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا نام ہے۔ گویا منشاء ایزدی پر بارضا و رغبت عمل پیرا ہونا اور اپنی ذات کو اس حد تک پہچاننا، جہاں پہنچکر یہ منزل آجاتی ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے؟

اقبال مسلمانوں میں وہی خود داری دیکھنا چاہتے تھے، جو کہ مردِ مومن کا خاصہ ہے۔

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں میں عمل کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے، ناامید ہو کر بیٹھ جانے والوں کو وہ برادرانہ شفقت کے ساتھ امید دلا کر پھر میدانِ عمل میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال کے فلسفۂ خودی کے عناصر ترکیبی: - اطاعت۔ ضبطِ نفس۔ نیابتِ الٰہی۔ خودی۔

(باقی صفحہ ۱۱۷ پر)

اقبال کا فلسفۂ خودی

آنسہ تاج تبسم
سال دوم

ے میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

جب کبھی فلسفے اور شاعری کا تذکرہ ہو تو ذہنی افق پر صرف دو ہی نام ابھرتے ہیں۔ غالب اور اقبال۔ غالب اردو شاعری کے پہلے مفکر ہیں جنھوں نے روایتی حسن و عشق کے قصّوں کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ مضامین بھی بڑی خوبی سے اپنے اشعار میں پیش کئے ہیں۔ اور جب غالب کی فکر فلسفے کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو ہمیں اقبال کے ہاں نظر آتی ہے اور اقبال دراصل غالب ہی کی فکر کا دوسرا نام ہے۔

اقبال نے جہاں اردو ادب میں نت نئے میدان پیدا کئے وہیں انہوں نے اردو کے بیشمار الفاظ کو نئے معنی اور نئے اسلوب عطا کئے، جن میں سے خاص طور پر اقبال کا شاہین اور خودی بیحد مقبول ہوئے۔ اقبال کے اِس فلسفۂ خودی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

اقبال، غالب کی وفات کے چار سال بعد یعنی ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کر لینے کے بعد انہوں نے تدریس کے پیشے کو اپنایا اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جس زمانے میں اقبال نے آنکھ کھولی، وہ غزل کا دور تھا اور اس زمانے میں حضرت داغ کا طوطی ہر طرف بولتا تھا۔ اس زمانے کے شعراء داغ کے رنگ میں کہنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے بھی اس دور کی روایات کو اپناتے ہوئے داغ کے رنگ میں شعر کہے انہوں نے داغ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کی۔ اس زمانے میں اقبال کا کلام داغ کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے اور داغ اور اقبال کے اشعار میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ اقبال نے کچھ عرصہ کے لئے غالب کے رنگ کو بھی اپنایا لیکن قدرت نے اقبال سے ایک خاص کام لینا تھا، اس لئے اقبال اپنا یہ انداز زیادہ عرصے برقرار نہ رکھ سکے۔

اقبال جلد ہی غزل کے طلسم سے باہر نکل آئے اور انہوں نے نظمیں کہنی شروع کیں انہوں نے پنجاب میں انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں کئی نظمیں پڑھیں جو بیحد مقبول ہوئیں۔ "نالۂ یتیم" اور "فریادِ امت" وغیرہ اسی انجمن کی یادگار ہیں۔ اقبال بہت جلد اس لئے مقبول و معروف ہوئے کہ ان کی نظموں کا مرکزی خیال وطن کی محبت اور اس کی عظمت ہے۔ اس زمانے میں اقبال وطن کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں اور خاکِ وطن کا ہر ذرہ انہیں دیوتا نظر آتا ہے چنانچہ اقبال اس زمانے میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ

ے "سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا"

لیکن حبِ وطن کے یہ گیت زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے اقبال کی ملاقات اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی جنھوں نے اقبال کے اقبال کو پہچانتے ہوئے انہیں مزید علم حاصل کرنے اور یورپ کا سفر کرنے کی دعوت دی۔ اقبال نے اس رمز کو پہچانتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں یورپ کا سفر اختیار کیا۔

اس سفر میں جو تین سال کے عرصے تک محدود رہے، اقبال کے

مسترد کر دیتے ہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک دینِ حق سے ٹکراتا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مزید فرماتے ہیں

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اقبال کے نزدیک قومیت کی تشکیل رنگ و نسل یا جغرافیائی حدود سے نہیں صرف اور صرف ایک نظریۂ حیات کی بنیاد پر ہو سکتی ہے اسی نظریۂ حیات کی بنیاد پر جمعیت بنتی ہے اور پھر ملت وجود میں آتی ہے اور اسی لئے اقبال اس نظریۂ حیات کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھنے پر زور دیتے ہیں

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال مسلمانوں کو سطحی بنیادوں پر قائم شدہ تمام قومیتوں اور انفرادیتوں کے بتوں کو پاش پاش کر کے ملت اسلامیہ میں جذب ہونے کی تلقین کرتے ہیں

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی رہے باقی

آج ہم جب یہ کہتے ہیں کہ ہم سندھی ہیں۔ ہم پنجابی ہیں ہم بلوچ ہیں۔ ہم پختون ہیں تو گویا ہم علاقہ اور زبان کی نسبت کو محمد عربی کی نسبت پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ سن کر اقبال کی روح تڑپ اٹھتی ہے

غبار آلودہ ہیں رنگ و نسب سے بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی۔ یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اقبال کو یہ غم ہے کہ مسلمانوں کا خدا ایک ہے۔ دین ایک ہے قرآن ایک ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک نہیں ہیں۔ مسلمان اپنا اور اپنے دین کا دفاع صرف ایک ہو کر ہی کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

اقبال ملت کے نوجوانوں سے خاص طور پر مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ ان کی سستی اور عیش و عشرت پر خون کے آنسو روتے ہیں

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو رلاتی مجھ کو ہے جوانوں کی تن آسانی

وہ انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس عظیم قوم کے بیٹے ہیں وہ انکے آباؤ اجداد کی عظمت کا ذکر کر کے انہیں ان کی پستیوں کا احساس دلانا چاہتے ہیں جن تک وہ اپنی نالائقیوں کی وجہ سے پہنچے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
لٹا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اس کے باوجود اقبال قوم کے نوجوانوں سے کتنے پر امید ہیں

نہیں ہے نا امید اقبال اپنے کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

قوم کے نونہالوں کے لئے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضٰے سوزِ تصدیق دے

اقبال انہیں شاہین کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں سستی، کاہلی، جمود اور ٹھہراؤ سے نفرت ہے

(باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

پیغامِ اقبال

• رانا عبید الرؤف۔ سال سوم •

حکیم الامت علامہ اقبال تاریخ اسلامی کے ان عظیم فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے اسلام کی انقلابی روح کو پھر سے زندہ کیا وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایک سچے مسلمان کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ نہ غزل گو شاعر ہیں اور نہ ہی نظم نگار۔ وہ عالم اسلام کے شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کی سطح سے بلند ہو کر اسلامی روح کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا۔ فکر کی حرارت سے اسے پختہ کیا اور نوک پلک سے آراستہ کر کے ایک ایسا شاہکار تیار کیا جس میں مقصدیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شعریت سے بھی مملو ہے۔ اقبال نے شاعری کو ذریعۂ اظہار سے زیادہ کبھی اہمیت نہیں دی بلکہ وہ ملت اسلامیہ میں پیدا شدہ تمام خامیوں تمام کوتاہیوں اور اس کے تمام زخموں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں اور پھر ان کا مداوا کرنے کے لئے تڑپ اٹھتے ہیں اور یہی تڑپ ان کی شاعری ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال کی شاعری ایک مسلسل سفر ہے۔ ایک مسلسل تجربہ ہے اور ان تجربات کی بھٹی میں پک کر جو کندن تیار ہوا ہے اس کی دمک نے دنیائے ظلمت کو منور کر دیا ہے۔ انہوں نے صرف ادب کو ہی نیا لب و لہجہ عطا نہیں کیا بلکہ پوری انسانیت کو ایک نئی فکر اور زندگی کے نئے تصور سے آشنا کیا جو خود شناسی، خود آگاہی اور انسانیت کی حقیقی قدروں سے عبارت ہے۔ اقبال خودی کا درس دیتے ہیں۔ وہ خودی جو انسان کو اس کی اصلیت اور حقیقت سے آگاہ کرتی ہے اور جب انسان اپنی حقیقت کو پالیتا ہے تو وہ صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سر جھکاتا ہے اور کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کے اشاروں پہ رقص کرتا ہے۔

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

انہوں نے عشق کو نیا مفہوم دیکر اسے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بنا دیا۔ اقبال کا عشق ایک مردِ مومن کا عشق وہ عام شاعروں کے عشق کی طرح انسان کو مردہ ضمیری اور ہوس پرستی کا درس نہیں دیتا بلکہ وہ عشق حقیقی ہے جو جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر مردہ اور افسردہ قوموں کو نئی زندگی۔ نئے ولولے اور نئی امنگیں عطا کرتا ہے اور اقبال ان ہی ولولوں اور امنگوں کی مدد سے مسلمان کو ایک نئی دنیا تخلیق کرنے پہ آمادہ کرتا ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

اقبال کے پیشِ نظر ایک خاص تعلیم تھی۔ ایک خاص پیغام تھا۔ انہوں نے دین اسلام کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور محمد عربی کے اس عالمگیر پیغام کے لئے انہوں نے اپنی شاعری کو وقف کر دیا۔

اقبال علاقائیت اور وطنیت کے تصور کو باطل قرار دیکر

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ سوشلسٹ حضرات کس منہ علامہ کو اپنی صفوں میں کھڑا کرتے ہیں۔

اس زمانے کے سوشلسٹ اپنے مقصد کی راہ میں موجودہ زمانے کے سوشلسٹوں سے کہیں زیادہ مخلص تھے۔ وہ علی الاعلان خدا کے وجود کا انکار کرتے تھے۔ اسی لئے علامہ نے محض تفہیم کے لئے یہ بات کہی تھی، کہ سوشلزم انسانی فلاح کے جس پروگرام کا مدعی ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر صورت میں وہ پروگرام تو خود اسلام میں موجود ہے۔ یعنی ہمارا اسلامی سوشلزم تمہارے سوشلزم سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے لیکن اب پچاس سال کے تلخ تجربے کے بعد سوشلسٹ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سوشلزم کھلم کھلا مذہب کا مقابلہ نہیں کرسکتا، نہ عوام کے دلوں سے مذہبی قدروں کو زائل کرسکتا ہے۔ اس لئے انہیں لامحالہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر عوام الناس میں کام کرنا پڑے گا۔ اب سوشلسٹوں کی اپروچ APROACH بالکل بدل گئی ہے اور وہ اسلامی سوشلزم کو بطور حربہ استعمال کرنا چاہتے ہیں اس لئے یہ اصطلاح بھی اب مسلمانوں کے لئے قابل اعتبار نہیں رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علامہ اگر آج زندہ ہوتے تو اسلامی سوشلزم کی بھی اسی طرح مخالفت کرتے جس طرح سوشلزم کی آپ نے کی تھی۔"

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے، جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطہ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے"۔ (خیابان اقبال)

"اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور ان نقابوں کے پیچھے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔"

(سال نو کا پیغام۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء آل انڈیا ریڈیو)

"روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں ہی افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے، مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے"۔

(علامہ کا خط بنام مدیر زمیندار ۲۴ جون ۱۹۲۳ء سنہ
ماخوذ گفتار اقبال)

جواہر لال کی منکر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکے گی"۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس افلاس سے کیونکر نجات دلائی جائے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔

(اقبال کا خط جناح کے نام ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء سنہ
مطبوعہ اقبال کے خطوط جناح کے نام)

ڈاکٹر جاوید اقبال

کیا اقبالؒ اشتراکی تھے؟

علامہ اقبال

اپنی زندگی میں متعدد بار اس الزام کی تردید فرما چکے ہیں۔ ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء کو زمیندار میں شائع ہونے والا مکتوب ابھی حال ہی میں پھر منظر عام پر آیا ہے جس میں علامہ نے اس الزام کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ بالشویک عقائد رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے اخراج کے مترادف ہے۔ میں الحمد اللہ مسلمان ہوں اور اسلام کی حقانیت پر کامل یقین رکھتا ہوں۔ اس زمانے میں بالشوزم کی اصطلاح سوشلزم کے مقابلے میں زیادہ مستعمل تھی اس لئے علامہ نے اپنی تردید میں بھی یہی اصطلاح فرمائی ہے۔ ورنہ درحقیقت سوشلزم سے ہی برار مقصود تھی۔ علامہ جس نشۂ توحید میں سرشار تھے اس میں کسی غیر اسلامی نظریئے دی ملکی سی آمیزش بھی انہیں گوارہ نہ تھی۔

علامہ اقبال نے دنیا بھر میں اٹھنے والی تحریکوں اور انقلابی نظریوں کا بڑے ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا اور ہمیشہ اس بات کی جستجو میں رہے کہ انسان آخر نت نئے تجربات کرنے پر کیوں مجبور ہو رہا ہے۔ جب روس اشتراکی انقلاب کے ابتدائی مرحلے سے گزر رہا تھا تو علامہ نے فرمایا تھا

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

انہیں روسی انقلاب سے ایسی ہی ہمدردی تھی جیسے کسی ڈوبتے ہوئے انسان سے ساحل پر کھڑے ہوئے انسانوں کو ہوتی ہے۔ علامہ محسوس کر رہے تھے کہ یورپ کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے انسان پر اس قدر ظلم ڈھایا ہے کہ وہ جھنجھلا کر انسانیت کی تمام اعلیٰ قدروں کو مٹانے پر تل گیا ہے اور خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ رہا ہے وہ چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ اس سے سبق حاصل کرے اور اس دنیا سے پھر اپنا رشتہ استوار کرے۔ جس کے بغیر اس کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرف قُل العفو میں پوشیدہ اب تک
اسی دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ان اشعار کو انقلاب روس کے پس منظر میں پڑھیئے تو محسوس کریں گے کہ علامہ اس ملت کو اشتراکیت سے بچانے کا کیسا انقلاب آفریں نسخہ تجویز کر دیتے ہیں علامہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر باعث ذلت بات اور کوئی نہ تھی کہ دنیا کی فرمانروائی کا تاج پہننے والی قوم دوسرے نظریات کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں علامہ نے باطل قوتوں کے سردار ابلیس کی زبان سے یہ اشعار کہلوائے ہیں۔

ہر جزو کل، اگر میرا حساب ضروری ہی ہے تو سزا تو مجھے جو تو چاہے دیدینا۔ مگر خواجہ عالم کے حضور مجھے شرمسار و رسوا نہ کرنا۔ ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

عشق و تقدیس رسول میں اقبال کی یہ واردات کیف و مستی اور بہ وضع احتیاط شوق محض دلوں میں سمجھنے اور ذہنوں میں رکھنے کی چیز ہے۔ زبانوں سے بتانے یا کانوں سے سننے کی نہیں کاش ہمیں اقبال کے جذبۂ عشق رسولؐ کا عشر عشیر میسر آجائے۔ (آمین)

اقبال مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیام لاتا تھا۔ وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار اور تجدید ملت کا طلبگار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق پیوست تھا۔ اس کی آنکھیں، جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا۔ اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔

ع آنکھ جو دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے ۲۸ برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھردی اور نئے سفر کے قطع منزل کے لئے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کردی۔ اقبال کا یہ دعویٰ حرف بحرف سچا تھا

؎ اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ یادگار رہیں گی۔ وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بنکر زندہ رہیں گی۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گے، نظریے ان سے بنیں گے ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔ ان کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی۔ قرآن پاک کی آیتوں احادیث شریف کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیغام اب دنیا میں انشاءاللہ زندہ رہیگا اور اقبال زندہ جاوید!

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال پیدا نہیں کئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ حالی اور آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی۔ افسوس ہے کہ آج ۳۸ برس کے بعد وہ کرسی خالی ہوگئی اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

(سید سلیمان ندوی)

تھی ۔ اقبال نے سر اس سے کہہ کر ایک خوش الحان قاری صاحب کا بندوبست کرا دیا تھا جو بلا ناغہ آکر لیڈی مسعود کو قرات سے قرآن پاک سنایا کرتے تھے اقبال کا خیال تھا کہ ایام حمل میں خوش لہجہ قاری سے اگر ماں قرآن پاک سنے تو اس کے بچے کی نشوونما پر روح پرور اثر ہوتا ہے ۔ قرآن کے صوتی اثرات نے ابن خطاب کو جلیل القدر مومن بنا ہی دیا ۔ اسی لیے اقبال جیسے بیدار چشم کا قرآن پاک سے یہ استفادہ کر لینا بھی ان کے کردار کے عین مطابق ہے اسی خاطر تو ارمغان حجاز میں دختران ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ۔

ز شام ما برون آور سحر را
بہ قرآن باز خواہی اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرات تو
دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اقبال کو یہ بھی یقین تھا کہ واعظان قوم سے پختہ ضالی کا ختم ہونا اور فطرت مسلم سے ایمان کی تمنا کی کا مٹنا ہو یا بتان وہم و گمان کی آذری اور فریب ہائے سود و زیاں کی سحر کاری ہو یہ سب آئین رسول مختار سے دوری اور قرآن سے مہجوری کا شاخسانہ ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمین افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ

•

جز بہ قرآن ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

قرآن حکیم کے پیغام اور فی زمانہ مسلمانوں کے کردار میں بعد المشرقین ہے اس کو اقبال نے بڑے کرب و اندوہ کے ساتھ محسوس کیا اور بالآخر یہ کہے بغیر نہ رہ سکے ۔

منزل مقصود قرآن دیگر است   رسم و آئین مسلمان دیگر است

اسی طرح اقبال ان بے توفیق فقیہان سے بھی نالاں و ناامید ہیں جس کی آذانیں بے جلال اور جن کی نمازیں بے جمال ہو کر رہ گئی ہیں ۔ ایک جگہ نہیں بار بار مگر ایک ہی تیور میں یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

عجب نہیں خدا تک تیری رسائی ہو
تری نگاہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں میری سحر کا پیغام

ختمی مرتبتؐ سے اقبال کو جیسا والہانہ عشق تھا اس جذبہ کا فطری تقاضہ ہے کہ محب جب محبوب کا نام لے تو نفس کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر اور واردات عشق کی تمام کیفیتوں سے سرشار ہو کر لے اقبال کو چونکہ کم مائیگی بشریت کا احساس اور اپنے نفس کی کثافتوں کا اعتراف ہے اس لئے حنجر کی مردنی کا نوحہ اس طرح لکھتے ہیں ۔

چوں نام محمد مصطفٰے اخوانم درود
از حجاب آب می گردد وجود
عشق می گوید اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانند دلبر
آنچہ تو با خویش کردی کس نہ کرد
روح پاک مصطفٰے آمد بہ درد

عمر کے آخری حصہ میں اقبال کا عشق رسول والہانہ پن کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا نام نامی زباں پر آتے ہی بے اختیار آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے تھے اور اس خوف سے کہ اب سامنا ہوا چاہتا ہے کس منہ سے شرف باریابی پاؤں گا ۔ نامۂ اعمال کی سیاہی اور عصیاں کی گراں باری رحمت تمام کے حضور کیونکر اذن لب کشائی دے گی اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خالق آب و گل اور اے دانائے

سید شاکر علی جعفری ۔ صدر، شعبہ بائیوکیمسٹری

اقبال اور عشقِ سیدّ البشر صلعم

"اقبال کی شخصیت جتنی دلربا ہے اتنی ہی پہلودار بھی"۔ وہ ایک ہی وقت میں مفکر، فلسفی، دانشور، حکیم اور شاعر ہی نہیں بلکہ ہماری فہم و دانش سے ماورا اور بھی نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں۔ مگر ان کی شخصیت کے نوع بہ نوع پہلو جس واضح اور روشن وحدت میں مربوط و منضبط ہیں وہ ہے عشق سیدّ البشر صلعم۔ اقبال کے چراغ حکمت و دانش کی ضو پاشیاں بھی چراغ مصطفوی صلعم کا پرتو ہے تو اقبال کے فکر و فلسفہ کی اساس و بنیاد بھی رسول امی لقب سے شغف خاص، اقبال کے اسلوب کی رعنائیاں اور اثر آفرینیاں بھی اسی ذات اقدس کی ثناء و حمد سے سیراب ہیں تو اقبال کے اشعار میں کیفیات و تاثرات بھی جلال و جمال رسول کی حلاوت سے پیدا۔ الغرض اقبال کی جملہ حیثیتوں کا مرجع و محور عشق و وجدان رسول مقبول صلعم ہی ہے۔ ؂

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر   اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

اسی اعتراف کو یوں بھی دہرایا ہے۔ ؂

اے ظہور تو شباب زندگی   جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند   آسماں از بوسۂ بامت بلند

از تو بالا پایۂ ایں کائنات   فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

ذات والاصفات کی آفاق گیر حیثیت کا اقبال نے کبھی یوں احاطہ کیا ہے۔ ؂

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ

ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود

فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

اور کچھ یوں کہ ؂

وہ دانائے سبل، ختم رسل، مولائے کل جس نے

غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر

وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

یہ اعتراف کرتے وقت کہ وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک اقبال کا یہی مصرعہ ان کی فکر و فرزانگی اور ان کی ژرف نگاہی کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سید احمد صدیقی صاحب کے قول کے مطابق "اقبال ہم سے۔ آپ سے اور دوسرے بہت سے لوگوں سے جو ہم سے بڑے ہیں، منفرد و اعلیٰ ملتے ہیں۔ بلکہ ہم سے جدا ہو کر ان پنہائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی ہمارے لئے دشوار ہے۔" صدیقی صاحب تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے مقامات پر خود اقبال اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں اگر یہ شاعری ہے تو پیغمبری کیا ہے اور اگر یہ پیغمبری ہے تو شاعر کا درجہ کیا ہوگا؟

اقبال کی آنکھوں نے جلال قرآنی میں جمال مصطفوی دیکھا ہے محبت کا کلام بھی محبوب کی ذات سے کم عزیز نہیں ہے کلام مجید پڑھتے اور اپنا عکس اس آئینے میں دیکھ دیکھ کر روتے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ جو اقبال کی ذات سے اس پہلو کو واضح کرتا ہے میں یہاں دوہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اقبال کو سید راس مسعود سے بڑی شیفتگی تھی اور اسی طرح سر راس اور لیڈی مسعود بھی اقبال سے شغف اور عقیدت رکھتے تھے۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی پیدا ہونے والے

آتشِ نوا

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ — دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسّس — جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعے جو باتیں بتاتا ہے وہ یا تو مابعد الطبیعاتی ہیں اور اس لحاظ سے تجربے اور مشاہدے کی قلمرو سے باہر ہیں یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ میں کسی نبی نے کوئی بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کہیں ہیں لیکن کسی چیز کا عقل کی دسترس سے باہر ہونا اور اس کا خلاف عقل ہونا بالکل الگ الگ باتیں ہیں۔

دنیا کی اصلاح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم مسلمان آگے بڑھکر اسلام کی صحیح روح کو اپنائیں اور پھر اسکو تقلید کے لئے دنیا کے سامنے پیش کریں تاکہ دنیا امن و چین کا گہوارہ بن سکے اور آج کی سسکتی و بلکتی ہوئی انسانیت کو فلاح نصیب ہو۔

بقیہ: دورِ حاضر کا انسان اور فرمان خداوندی

کے طالب ہوں۔ ہم ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے رہے سب ضائع۔" (۷)

یہ باتیں کچھ ایسی تھیں کہ جن کی صداقت کا ذرا بھر بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی لوگوں کے دل میں اب کوئی شیطانی خیال باقی رہ گیا تھا۔ اب دل کرتا تھا کہ یہ حسن آواز زندگی کے بہترین اصولوں سے ہمیں آشنا کرے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ تھمی ہوئی آواز دوبارہ محیط ہوتی چلی گئی۔

جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے (میرے) علم و دانش کے سبب ملی ہے (نہیں) بلکہ وہ آزمائش ہے۔ مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔" (۸)

"یہ کتاب جو تمہاری طرف وحی کی گئی اس کو پڑھا کرو اور نماز کے پابند رہو۔ کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ اور خدا کا ذکر بڑا اچھا کام ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔" (۹)

"اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرسکے۔" (۱۰)

" جس نے نفس کو پاک رکھا" اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ خسارے میں رہا۔" (۱۱)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے۔ تاکہ وہ ہماری عبادت کریں۔" (۱۲)

"ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک طرف سے آذان کی آواز سنائی دی اور وہاں موجود ہر ذی روح کے قدم آواز کی جانب اٹھ گئے اور یوں ان اندھیروں سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو نجات مل گئی۔

(۷) ھود:۔ ۱۵، ۱۶ (۸) الزمر:۔ ۴۹ (۹) العنکبوت:۔ ۴۵۔
(۱۰) الانعام:۔ ۱۶۵ (۱۱) الشمس:۔ ۹۔۱۰۔ الذٰریٰت ۵۶

★ ــ علم عمل کو آواز دیتا ہے۔ پس اگر وہ جواب دے تو ٹھہر جاتا ہے، ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔ (ارشادِ نبویؐ)

★ ــ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال کفار، فرعون، قارون وغیرہ کی (حضرت ابو بکرؓ)

★ ــ ستارے آسمان کی زینت ہیں اور تعلیم یافتہ انسان زمین کا زیور ہے۔ (حضرت عمرؓ)

(مرسلہ: فوزیہ پروین۔ سال اول)

وقت ختم ہونا ہی چاہئے ۔ اب کائنات کا جو نظریہ مقبول ہے وہ یہ ہے کہ کائنات ایک ہی تخلیقی انفجار (EXPLOSION) سے وجود میں آئی تھی نہ کہ کسی تدریجی عمل سے بلکہ اس کا سارا مادہ تخلیق یکجا، انتہائی کثافت وحرارت کی حالت میں تھا اور ابھی اس کی عمر پانچ منٹ ہی تھی کہ اس کے عظیم انفجار سے وہ پھٹی اور ۳۰ منٹ کے اندر اندر تمام کیمیاوی عناصر پیدا ہو گئے اور پھر اسی مادے سے بے شمار نظام فلکی بنے۔ یہ سائنس کے موجودہ ارشادات گویا قرآن کی تفسیر پیش کر رہے ہیں۔ سورۃ النحل کی آیت ۴۰ میں ہے "ہم جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اس کے لئے بس ہمیں یہ کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے ۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ میں دیکھئے "آسمان اور زمین سب ایک ڈھیر تھا پھر ہم نے انہیں پھاڑ دیا۔

اظہار خیال کے لئے جگہ کی تنگی کو محسوس کرتے ہوئے اب میں صرف اشارہ دیتا ہوا چلوں گا۔

ضابطہ ناکارگی (LAW OF EMTROPY) کے مطابق ایک وقت آنے والا ہے کہ جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی نتیجتاً کیمیائی اور طبیعی عمل کا کوئی میدان باقی نہ رہے گا۔ زندگی ناپید ہو جائے گی ۔ اور ایک ـــــ سمہ جیسی کیفیت پیدا ہو جائے گی ۔

زندگی کی پیدائش کے بارے میں بعض مادہ پرست خیال کرتے ہیں کہ چند مخصوص عناصر کے ایک خاص تناسب سے ملنے پر وجود میں آئی ہے مگر پروفیسر کانکلن (CONKLIN) کہتے ہیں کہ اس احمقانہ بات کا امکان اتنا ہے جتنا ایک چھاپے خانے میں دھماکہ ہو جانے سے ایک پوری ڈکشنری مرتب و طبع ہو کر نکل آنے کا امکان ہے ۔ پانی اور امونیا کا وزن ضابطہ ۱۷ اور ۱۸ ہے مگر دونوں کے سائنسی برتاؤ میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ پانی اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر انسانی زندگی کے لئے نہایت معاون ثابت ہوتا ہے ۔ زمین اگر کسی اتفاقی حادثے سے یا کسی بنانے والے کے بغیر آپ سے آپ بن گئی ہوتی تو ان باتوں کے قوی امکانات تھے کہ زمین کا سورج موجودہ فاصلے کے بجائے اس کا دوگنا یا نصف ہوتا ۔ اگر ایسا ہوتا موسم کی شدت زندگی دوبھر کر دیتی ۔ اگر اتفاقی حادثہ میں مجمع زیادہ یا کم ہو جاتا تو بھی زندگی ناپید ہو جاتی ۔ پروٹین

امینو ایسڈ کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتا ہے جس کی کڑیاں 10^{48} مختلف طریقوں سے جڑ سکتی ہیں ۔ ان میں سے صرف بعض طریقے ہی ایسے ہیں جسے پروٹین زندگی کے لئے مناسب ہوتا ہے ۔ اگر کسی نامناسب طریقے پر یہ کڑیاں جڑ جائیں تو حیات کے لئے الٹا زہر قاتل بن جائیں ۔ ان کڑیوں کا محض اتفاقاً مناسب طریقے سے جڑ جانا جتنا کچھ امکان رکھتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہ صرف اس پروٹین کا معاملہ ہے جو جاندار جسم کے اجزائے ترکیبی فراہم کرتا ہے اور خود بے جان ہوتا ہے ۔ اس کے اندر جان پڑنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ محض اتفاقی حادثہ اسے حل کر دے ۔

یہ اوپر چند موٹے موٹے اشارے بلا تشریح کے دیئے ہیں جو حقائق کو کھول کر سامنے رکھنے کے لئے کافی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے جس جس پہلو پر غور کریں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وحقانیت سامنے آتی ہے ۔ بعض پھولوں کی (FERTILISATION) کا عمل اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ کوڑا کرکٹ کے DECAY ہی کو دیکھئے اگر یہ DEGENERATION کا سلسلہ نہ ہوتا تو آج دنیا کی زرخیزی ختم ہو گئی ہوتی ۔ اور کوڑا کرکٹ و غلاظت کے ڈھیر الگ وبال جان بن جاتے ۔ اس طرح اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہمہ گیریت، وسعت اور نظام کی پابندی گواہ ہیں کہ ان کا نگہبان ایک ہے ۔ ان سب کا آقا اور حکم دینے والا ایک ہے اور یہ کائنات مختلف خداؤں کے درمیان ہرگز بٹی ہوئی نہیں ہے ۔

آخر میں ایک اہم بات اور کرتا چلوں ۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو بات بھی کہی ہے وہ بالکل حق ہے مگر ایسا ممکن ہے کہ جو انسانی عقل آج جس مقام پر ہے اس کی دسترس سے باہر ہو ۔ جس طرح آج سے پندرہ صدی قبل لوگ تخلیق کائنات کے معمہ کو سمجھنے سے قاصر تھے ۔

کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ جاتا ہو ۔ اگر کوئی شخص ہاتھی کو ہوا میں اڑاتا اور چیل یا کبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرتا بتائے تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں ۔ اس لئے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے ۔

مذہب اور سائنس

فرخ ابدالی۔ سال دوم

یہ ایک نہایت ہی اہم موضوع ہے۔ کیونکہ اس کا انسان کی عملی زندگی سے براہ راست اور بہت گہرا تعلق ہے۔ آج ایک بہت بڑا طبقہ لاشعوری طور پر ایسا سمجھتا ہے کہ سائنس اور مذہب میں باہم ٹکراؤ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلمان مذہب کے معاملہ میں پر اعتماد نہیں ہے اور مذہب کو عمل کی دنیا سے دور ہٹا کر نجی زندگی کا معاملہ بنا دینا چاہتا ہے۔

یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی اور اس میں کہاں تک سچ ہے۔ حقائق کیا ہیں۔ میں ان مسائل کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل سائنس کی دنیا نے کروٹ لی۔ اور سائنسی بنیادوں پر خاصا کام شروع ہوا۔ اور یہ سب کارروائی یورپ میں ہی ہوئی۔ سائنسی تحقیق کے نتیجے میں کچھ حقائق ایسے سامنے آئے جو عیسائی پادریوں کے ترمیم کردہ بائبل کے ارشادات سے ٹکرا گئے ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اہلِ کلیسا نے عقل کی بات کرنے کی بجائے اپنی مذہبی صباحت و قیادت کے بل بوتے پر سائنسی حقائق بزور چھپانے کی کوشش کی تاکہ ان کے استحصالی قلعہ کی بنیادیں نہ ہلنے پائیں مگر اس حماقت نے نوعِ انسانی کو بہت نقصان پہنچایا سائنس دانوں پر مسیحی ظلم کیا بالآخر سائنس پر مذہب کے ظلم سے تعبیر کیا گیا۔ اور صورت کچھ یوں بنی کہ مذہب سے سائنس میں راہنمائی کے بجائے سائنسی معلومات کے مطابق مذہب کو پرکھا جائے گا اور یہاں سے اس تباہی و بربادی کی ابتدا ہوئی جس سے آج ہم دوچار ہیں۔ اور اب تو کیفیت ایسی ہے کہ ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

جوں جوں سائنس کی باتیں سچ ثابت ہونے لگیں عیسائیت کے چند فرسودہ اصولوں کو مذہب کا نمائندہ ٹھہرا کر تمام مذاہب کے خلاف ایک ہی محاذ بنالیا گیا جو سراسر کم عقلی و گمراہی کی دلیل ہے۔ اسلام آگے بڑھ کر سائنس سے بھی آگے بڑھ کر زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری ایسی ٹھوس راہنمائی کرتا ہے کہ دنیا کی کسی بھی تحقیق کے نتیجے میں اس کی کوئی بات حرف غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ صاف سی بات ہے کہ خالق کی کہی ہوئی بات کو اس کی مخلوق کیونکر غلط ثابت کر سکتی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں اسلام کی راہنمائی کے بغیر سائنس نے جو ترقی کی ہے وہ نوع انسانی کی فلاح کا ضامن نہ بن سکی۔ علامہ اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

آیئے اب کچھ سائنسی تحقیقات اور اسلام کی راہنمائی کا تجزیہ ہو جائے۔

سب سے پہلے:—

تخلیق کائنات:۔ سائنس کا پرانا نقطہ نظر دنیا کے بارے میں اس دعوے پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا۔ اس کی صرف صورت بدل سکتی ہے مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کمی و بیشی نہیں ہوتی ہے اس بنا پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا ازلی و ابدی ہے مگر اب اس پورے تخیل کی بساط الٹ گئی ہے۔ حرکیات حرارت کے دوسرے قانون نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مادی عالم نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی بلکہ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک

ہم نے اپنے ضمیر کو بدکرداری، جھوٹ، مکر، فریب، ظلم اور اسی طرح کی دوسری برائیوں سے آلودہ چادر میں اڑھا کر سلا دیا ہے۔ لیکن سویا ہوا ہمارا یہ ضمیر جب کبھی کبھی کروٹ لیتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے گرد کیا ہو رہا ہے۔ ہم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس طرح کبھی کبھی ہماری آنکھوں کی بینائی اور کانوں کی شنوائی دونوں واپس آجاتی ہیں اور ہمیں کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کو ہم سمجھ بھی سکتے ہیں، ان کی حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحہ ہمارا ماحول ہمیں جنسیات کی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سے واپس لوٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے اور یوں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے اور انسانی ضمیر برائیوں کی آندھیوں کے زیر اثر منوں مٹی تلے دفن ہو جاتا ہے

لیکن اس دنیا میں ایسے انسان ابھی زندہ ہیں جو ان تاریک وادیوں سے بھی نکل آئے ہیں ان کے اس سفر کی داستان بہت طویل ہے لیکن وہ اپنی داستان کو مختصر کر کے کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

" اس وقت جب ہر طرف صرصر عصیاں چل رہی تھی، اندھیرے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا جن لوگوں میں استقلال تھا وہ ابھی تک ان شیطانی قوتوں کے خلاف ڈٹے ہوئے تھے اور یہ آندھیاں ان سے ڈر کر اپنا راستہ بدل لیتی تھیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے خود کو ان ہواؤں کے سپرد کر دیا وہ ان وادیوں میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو گئے۔ اتنے میں ایک بہت ہی شیریں آواز سنائی دی۔

" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی، تو نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے شب تاریک میں آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ یہ بہرے ہیں، اندھے ہیں گونگے ہیں کہ کسی طرح سیدھے رستے کی طرف لوٹ ہی نہیں سکتے۔" (۱)

" یہ آواز سنتے ہی وہاں موجود تمام انسان اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئے اچانک یہی آواز دوبارہ آئی۔"

" لوگوں اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ تاکہ تم اس کے عذاب سے بچو۔" (۲)

[(۱) البقرۃ ۱۔ ۱۸-۱۶۔ (۲) البقرۃ ۱۔ ۲۸۔]

" خدا ہی تو ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو اونچے بنائے پھر عرش پر جا ٹھہرا اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا۔ ہر ایک میعاد معین تک گردش کر رہا ہے۔ وہی دنیا کے کاموں کا انتظام کرتا ہے وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم اپنے پروردگار کے روبرو جانے کا یقین کرو۔" (۳)

" ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی تمام آندھیاں رک گئیں۔ ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔ فضا اس قدر دلکش ہو گئی۔ جیسے ابھی ابھی سحر ہوئی ہو پھر یہ آوازیں چاروں طرف پھیلنے لگیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اثر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک انجانی قوت نے پھر ہماری بصارت اور شنوائی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اب ہماری قوت ارادی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اب وہی دلکش آواز دوبارہ سنائی دی۔

" اور خدا تو لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔" (۴)

" کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے اور وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔" (۵)

" اس آواز نے وہاں موجود انسانوں کے دل کو وہ چین اور آرام دیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اچانک ہمارے ذہن میں ایک خیال آیا کہ جو لوگ خدا کی عبادت کرتے ہیں اکثر زیادہ تنگدست اور کٹھن زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو رشوت اور چور بازاری، لوٹ مار وغیرہ کو اپنا شیوہ بناتے ہیں اپنی زندگی چین کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت وغیرہ میں کچھ نہیں رکھا۔ زندگی گذارنی ہو تو انسان عیش کے ساتھ گذارے خواہ اس کے لئے برے سے برا کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہی آواز پھر گونجی۔" اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرام اور آسائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کریں! ان پر نگاہ نہ کرنا۔ اور تمہارے پروردگار کی عطا کی ہوئی روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔" (۶)

" اور جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت

(۳) الرعد ۱۳۔ ۲۔ (۴) یونس ۔ ۴۴ (۵) الزمر ۔ ۵۳۔ (۶) طٰہٰ ۔ ۱۳۱

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

عبدالرحمٰن ۔ سال دوم

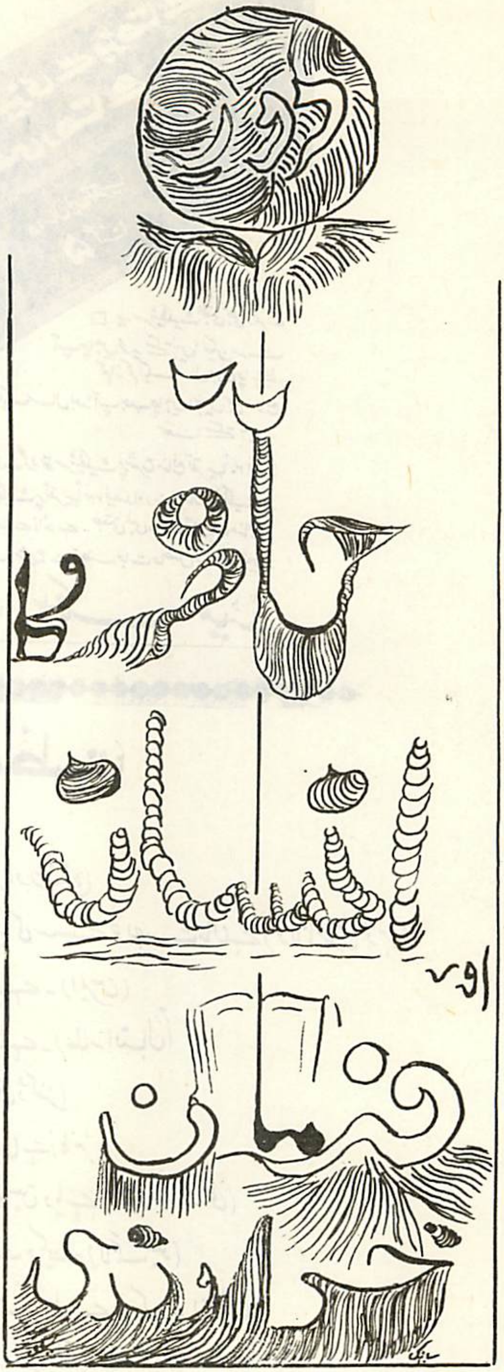

یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ آپ کوئی کام بہترین اور اعلیٰ طریقے سے اسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ کو پتہ ہو کہ :۔

آپ یہ کام کیوں کر رہے ہیں۔

آپ کو یہ کام کس صورت میں کرنا چاہیئے۔ اور

آخر اس کا نتیجہ کس صورت میں برآمد ہو گا۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرے کہ اس بنیادی تصور کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی ہم اپنی زندگی اور اپنے شب و روز کے بارے میں خود کو ان سوالوں سے دوچار نہیں کرتے۔

زندگی، جس کو بہترین طریقے سے بسر کرنا ہمارے ذمہ ایک اہم ترین کام ہے۔ اس کو ہم بغیر سوچے سمجھے، دوسروں کے نظریات اور غلط اعتقادات کے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہم اس کے حقائق سے نظریں چراتے ہیں۔ ہم فرار کے ایسے راستے اختیار کرتے ہیں۔ جو آخر کار انسان کی انفرادیت اور اس کے اندر پنہاں، تمام تر خصوصیات کو زنگ آلود کر دیتے ہیں۔

انسان میں خوب سے خوب تر کا جو مادہ قدرت نے پنہاں کیا ہے اس کو ہم استعمال کرنا تو چاہتے ہیں لیکن اس کام میں جب ایک طرف مشکلات نظر آتی ہیں اور دوسری طرف نفس انسان کو ورغلاتا ہے تو انسان کی تمام تر اعلیٰ قوتیں سرد پڑنے لگتی ہیں اور اگر ایسے وقت میں رہبر کامل کی آواز سنائی نہ دے تو پھر وہ آسان ترین راستہ اختیار کرتا ہے اور ہر کام میں تقلید کو اپنا شیوہ بنا لیتا ہے۔ اس کی بصیرت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کو محسوس بھی نہیں کر پاتا اس راہ پر چل کر وہ، اپنے کردار، اخلاق، خودی اور بلند حوصلگی کے میناروں کو گراتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آج ہم کھڑے ہیں ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا۔ ہم پر نفس نے غلبہ پا لیا ہے۔ ہم نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں۔ ہم نے اپنے رہبر کامل کی آواز ذہن تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ اب ہم کبھی مغربیت کی تقلید کرتے ہیں اور کبھی سرخ پوشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی عظمت کے تمام میناروں کو ٹھوکر مار کر گرا دیا ہے۔

حبیب بینک
ڈیپازٹ گروتھ
سرٹیفکیٹ
... میں آپ کا روپیہ تیزی سے بڑھتا ہے
اور بڑھتا ہی رہتا ہے
جتنی لمبی مدت
اتنا زیادہ منافع
۱۵ سال میں تقریباً
۵ گنا
۱۳ سال میں تقریباً
۴ گنا
۱۰ سال میں تقریباً
۳ گنا

□ یہ سرٹیفکیٹ جتنی بھی رقم کے آپ چاہیں خرید سکتے ہیں، لیکن مدت کم از کم ایک سال ہونی چاہیئے۔
□ ایک سال بعد، آپ جب چاہیں انہیں بمع منافع بھُنا سکتے ہیں۔
□ دس سالہ ڈیپازٹ گروتھ سرٹیفکیٹ پر شرح منافع تقریباً ۲۰ فیصد، تیرہ سالہ سرٹیفکیٹ پر تقریباً ۲۴ فیصد اور پندرہ سالہ سرٹیفکیٹ پر ۲۶ فیصد سے زائد ہے۔ جتنی لمبی مدت اتنا زیادہ منافع!
□ ان پر آپ ۱۳ فیصد شرح سے قرضہ جات حاصل کر سکتے ہیں۔

حبیب بینک لمیٹڈ

ماں کی عظمت

۱۔ مجھے پھول اور ماں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ (نادر شاہ)

۲۔ ماں کی اصلی خوبصورتی اس کی محبت ہے۔ میری ماں دنیا کی سب سے خوبصورت ماں ہے (مولانا محمد علی جوہر)

۳۔ ماں کی زندگی میں محبت اور میزبانی کا خمیر داخل کیا گیا ہے۔ (ایمرسن)

۴۔ سخت سے سخت دل کو ماں کی پُرنم آنکھوں سے موم کیا جاتا ہے۔ (علامہ اقبالؒ)

۵۔ سب سے خوبصورت اور شیریں پیار ماں کا ہے (چارلس ڈکنز)

۶۔ میں نے زندگی میں ثابت قدمی کا درس اپنی ماں سے سیکھا ہے (ڈانٹے)

۷۔ ہماری ماں نے ہمیں زندہ رہنے اور آزادی گزارنے کا سبق دیا ہے (مولانا شوکت علی)

۸۔ میں نے سب سے پہلے ماں کی آنکھوں میں محبت کا رنگ دیکھا۔ (لانگ فیلو)

۹۔ آسمان کا سب سے بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے۔ اس کی دل سے قدر کرو۔ (ملٹن)

(مس نگہت بٹ۔ سال چہارم)

ANOTHER QUALITY VITAMIN PREPARATION FROM PFIZER

PFIZER VITAMIN AD CAPSULES

a simpler and convenient way of vitamin A & D intake

Each capsule contains

VITAMIN A ....4500 UNITS
VITAMIN D ....450 UNITS

for QUALITY specify PFIZER

Pfizer

International sign of quality medicines

اور اس کے بتائے ہوئے حدود کی پابند ہے۔ اس انتخاب کا نمونہ ہمیں خلفائے راشدین کے عہد میں ملتا ہے جہاں باضابطہ تو کوئی استصواب نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی انہیں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ مدینہ کے بیشتر مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی اور چونکہ اس وقت مدینہ کی حیثیت عالم اسلام کے مرکز کی سی تھی اس لئے اہل مدینہ کی رائے تمام مسلمانوں کی رائے تھی۔ امیر المومنین بہترین اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی ذات خود غرضی، جانبداری، نفس پرستی، تعصب اور بددیانتی سے پاک ہوتی ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا اور اپنے خدا دونوں کے آگے جوابدہ ہوں۔ وہ حقیقت میں قوم کا خادم ہوتا ہے (سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُہُمْ ۔ حدیث)۔

مجلس شوریٰ:۔ اسلامی سیاست میں خلیفہ کے بعد کچھ لوگوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو خلیفہ کے دست راست ہوتے ہیں۔ اور اسے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اسے مجلس شوریٰ کہا جاتا ہے اسلام میں شوریٰ کی بہت اہمیت ہے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اور خود حضورؐ نے کئی موقعوں پر مقتدر صحابہؓ خصوصاً حضرت ابوبکرؓ سے مشورے لئے ہیں۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی بزرگ اور تجربہ کار اصحابؓ ارکان مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ارکان مجلس شوریٰ یا صاحب امر حضرات کا انتخاب بھی اکثریت کی رائے سے ان ہی اصولوں پر ہوتا ہے جو خلیفہ کے لئے تھے۔ چونکہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے چاہئیں اس لئے خلیفہ شوریٰ سے مشورہ کا پابند ہے۔ قرآن کی اس آیت کی رو سے کہ۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ ترجمہ:۔ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اطاعت کرو رسول کی، اور ان کی جو صاحب امر ہوں۔

مجلس شوریٰ کی حیثیت دراصل اسمبلی کی سی ہے جس میں مختلف ارکان کو مختلف شعبوں کا ناظم مقرر کر دیا جاتا ہے یا انہیں مختلف وزارتیں سونپ دی جاتی ہیں۔ حضورؐ کے وقت میں اگرچہ وزیر کے لفظ کا استعمال عموماً نہیں ہوتا تھا لیکن جو لوگ اس لفظ کے معنی سے آشنا تھے وہ حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ کا وزیر کہا کرتے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں حضرت عمرؓ کی حیثیت وزیر کی سی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے وقت میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اسی قسم کی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔

مقنّنہ:۔ اسلامی سلطنت میں مقنّنہ کے مختلف کام ہیں۔ مثلاً جن معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکام ہیں ان کے نفاذ کے لئے قانون بنائے، جہاں ایک سے زیادہ احکام ہوں وہاں یہ طے کرے کہ کون سا حکم قانونی شکل پائے اور جہاں کوئی احکام یا اصول نہ ہوں ان کے لئے کوئی بھی مناسب قانون اجتہاد کے ذریعے بنائے بشرطیکہ وہ کتاب سنت یا شرع سے تصادم نہ رکھتے ہوں۔

انتظامیہ:۔ انتظامیہ کا کام یہ ہے کہ قوانین اور احکام الٰہی کو نافذ کرے اور اس کے نفاذ کے لئے ملک و معاشرے میں سازگار حالات پیدا کرے۔

عدلیہ:۔ عدلیہ کا فرض یہ ہے کہ جو فیصلہ کرے وہ عین قانون الٰہی کے مطابق ہو" اور یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے۔ (المائدہ)"

مندرجہ بالا اصول پر قائم کی گئی اسلامی ریاست ایک ایسی مثالی مملکت ہوتی ہے کہ جس کا نمونہ ہمیں بلاشبہ خلفاء راشدین کے دور میں ملتا ہے۔ جہاں مساوات تھی، امیر غریب، غلام آقا سب برابر تھے۔ خلیفہ اور گورنر رعایا کے درمیان ہی رہتے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے سیاسی رہنما تھے، بلکہ ان کے دینی قائد بھی تھے۔ نمازوں کی امامت کرتے اور اس طرح عوام سے قریب تر رہتے۔ یہ اسلام کی عملی سیاست کا وہ دور تھا جب ایک عام مسلمان خلیفۂ وقت کو ٹوک سکتا تھا کہ اس کے بدن پر جو ایک زائد چادر ہے وہ کہاں سے آئی۔ جہاں کا قاضی ایک یہودی کے خلاف امیر المومنین کا مقدمہ صرف اس لئے خارج کر دیتا تھا کہ ان کے پاس اپنے غلام اور بیٹے کے علاوہ کوئی اور گواہ نہ تھا۔ جہاں کی رعیت کا یہ حال تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنا اور سنگسار کر دینا تھی وہ جرم اگر ان سے سرزد ہو جاتا

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

اسلام اور سیاست

سید سبط حسن - سال دوم

اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے، ایک ایسا مکمل نظریۂ حیات اور جامع نظام زندگی ہے جس کے ذریعے ہم زندگی کے ہر شعبے میں مکمل رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہو، معاشی ہو یا سیاسی ہو۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں دین اور سیاست کو عموماً الگ الگ حیثیتیں دی گئیں ہیں لیکن اسلام میں سیاست کا تصور قطعی مختلف ہے۔ یہاں نہ دین سیاست کے بغیر چل سکتا ہے اور نہ سیاست دین سے جدا ہو کر۔

اسلام کے اندر قومیت کا عنصر موجود نہیں۔ کیونکہ اسلام کسی خاص قوم یا طبقے کے لئے نہیں آیا بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے آیا ہے حضورؐ رحمت اللعالمین بنا کر بھیجے گئے چنانچہ اسلام میں نظامِ مملکت کی بنیاد وہ نظریہ ہے جو بنی نوع انسانیت کو قومیت جیسے محدود نظریہ سے بالاتر کر دیتا ہے، ابتدا میں اسلام جس تیزی سے دنیا کے مختلف ممالک اور اقوام میں پھیلا ہے اس کی وجہ ہی ایک خاص نظریہ اور اصول تھا جس نے قومیت، طبقات اور رنگ و نسل کی تمام دیواریں ڈھا دی تھیں۔

اللہ کی حاکمیت :- اسلام میں سیاسی نظام کا دار و مدار بلکہ اس کی بنیاد خدائے واحد اور قادر مطلق کی حاکمیت کے نظریہ پر ہے۔ حاکمیت دراصل ہوتی ہی اس ہستی کی ہے جو قادر مطلق ہو، جس پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو جس کے نافذ کردہ قانون کا اطلاق ہم پر تو ہو لیکن خود اس پر کوئی قانون یا پابندی نہ ہو اور بلاشبہ ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ

بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ ترجمہ :- وہی (اللہ) تمام اقتدار کا مالک ہے۔

چنانچہ حاکمیت کے ان اوصاف کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کسی شخص، خاندان، طبقے یا قوم کو حاکمیت کا حق حاصل نہیں۔

"اللہ کی مخلوق پر کسی مخلوق کو حکم چلانے کا اختیار نہیں۔" (القرآن)

جب یہ بات طے ہو گئی کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے تو ظاہر ہے کہ قانون بھی اسی رب العزت کا دیا ہوا نافذ ہو گا۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ

ترجمہ :- پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب نے نازل کیا ہے۔

خلیفہ :- اسلامی ستیا میں اللہ کی حاکمیت کے بعد دوسری حیثیت خلیفۂ وقت کی ہے۔ اس دنیا میں انسان اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یا نائب کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے۔ خلیفہ یا امیر المومنین پر جمہور کی رضامندی اور اعتماد کا ہونا لازمی ہے۔ خلیفہ کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، مرد ہو، عاقل اور بالغ ہو اور اسی مملکت کا باشندہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس منصب کا خواہاں نہ ہو۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے اکثریت کی رضامندی ضروری ہے۔ اسلام میں جمہوریت کا تصور بھی آجکل کی جمہوریت سے (جو مختار کل ہے) مختلف ہے اس لحاظ سے کہ یہاں یہ اللہ کے قانون

تعلق زیادہ سے زیادہ ہو ۔ خدا کا خوف ان کے دلوں میں اس طرح موجزن ہو جس طرح اس کا حق ہے ۔ یا ایھا الذین آمنو اتقو اللہ حق تقاتہٖ اس کے غضب سے بچنے کی تراکیب کی جاتی رہیں ۔ اس کی رحمت سے پرامید ہوں اور مغفرت کے طلب گار ہوں ۔ اور سب سے بڑھ کر اس سب سے مشکل کام کو انجام دینے کی صلاحیت، وہی سیرت و کردار، اس کے ذرائع اور نصرت الٰہی پہنچنے کے لئے دعاگو ہوں ۔

(۲) فکر آخرت

خدا سے تعلق کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں احساس آخرت بھی سب سے نمایاں ہو، ان کی نمازوں میں، دعاؤں میں، انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں میں، کاروبار و لین دین میں، باہمی تعلقات و تمدن و معاشرت میں، غرض کہ زندگی کے ہر ہر پہلو سے آخرت کا احساس، اور فکر و آخرت ثابت ہو ۔ جب تک اسلامی تحریک کے داعیوں میں یہ فکر آخرت، پوچھ گچھ کا احساس سزا اور جزا کا تصور عین الیقین کی حد تک گہرا نہ ہوگا ۔ انسانی زندگی میں نہ تو کوئی تبدیلی رونما ہوگی ۔ بلکہ وہ اس مقصد و نصب العین کے لئے بھی مؤثر ثابت نہ ہوگی ۔ بلکہ نقصان پہنچانے کا ہی باعث بنے گی ۔ چنانچہ خدا کی ربوبیت کا اقرار، اس کیساتھ ایمانی تعلق کی نوعیت، اور آخرت میں جوابدہی کا تصور ہی وہ محرک ہے جو اس تحریک کو فعال و مؤثر بنانے میں نہ صرف کارآمد بلکہ یہ کہ قوت متحرکہ ثابت ہو سکتی ہے ۔

(۳) صبر و استقامت

اس باب میں ایک اور اہمیت رکھنے والی چیز صبر و استقامت ہے ۔ عالمگیر انسانی قیادت کی تبدیلی، انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر صرف خدا کی اطاعت میں ڈالنے کی کوشش، نیز جاہلیت کو ختم کر کے نظام خالصہ قائم کرنے کی جدوجہد میں ہر ہر مشکل کا سامنا کیا جائے ۔ قربانی کا وقت تو جان و مال کا نذرانہ، انسانی تعمیر کا نقشہ خون دل میں انگلیاں ڈبو کر بنانا پڑے ۔ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے اس پر ثابت قدم رہنا اور صبر کی روش اختیار کرنا ہی درحقیقت فلاح کا راستہ ہے ۔

کتاب الٰہی میں ارشاد ہے ۔ یا ایھا الذین آمنو اصبرو و صابرو و رابطو و اتقو اللہ لعلکم تفلحون ۔ ایمان لانے والوں کو فلاح و ہدایت کی وعید ان الفاظ میں سنائی جا رہی ہے کہ صبر سے کام لو، مشکلات پیش آئیں تو پامردی سے باطل کا مقابلہ کرو اور حق کی خدمت کے لئے کمربستہ رہو ۔ یہ تمام کام اللہ سے ڈرتے ہوئے کرو اور اسی طرح تم کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہو ۔ کسی جگہ پر ایمان والوں کو صبر اور نماز سے مدد لینے کے لئے کہا گیا (واستعینو بالصبر و الصلوٰۃ) یہ صبر درحقیقت باطل کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھنا، اس راہ میں آنے والی قربانیوں پر آمادہ ہو جانا اور مشکلات کے لئے مردانہ وار مقابلہ کرنا نصب العین کے لئے ڈٹ جانا اور باطل قوتوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا، جس میں جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کیا جائے اسے پیش کر دینا ۔ اس معاملہ میں اللہ تعالےٰ کی نصرت و حمایت کا طلب گار رہنا ۔ اس کی رحمت کی توقع رکھنا ہی صبر و استقامت کی دلیل ہے ۔

(۴) احسان

پھر دائمی انقلاب ظلم کا راستہ اختیار نہ کرے ۔ عدل کی راہوں پر گامزن رہے ۔ زمین پر فساد برپا نہ کرتا پھرے بلکہ فساد کو ختم کرنے والا ہو ۔ فسق و فجور کی راہوں پر چلنے والا نہ ہو بلکہ محسن ہو ۔ اس لئے نبی اکرم صلعم کو محسن انسانیت کہا گیا ۔ خدائے واحد نے کہا کہ ان اللہ یحب المحسنین ۔ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔

بقیہ : جدا ہو دین سیاست سے

تو خود اس کا اقبال کرتے اور سزا کے لئے اصرار کرتے کیونکہ وہ روز محشر اللہ تعالیٰ کے آگے اپنی گردنیں گناہوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔ اس ریاست کا سپاہی فقط اللہ کے لئے جہاد کرتا جہاں اپنی جان خدا کے سپرد کرنے کے واسطے گھر سے نکلتا وہاں اس سے پہلے اپنے مال کی بھی قربانی دیتا اور میدان جنگ میں جو مال غنیمت ہاتھ لگتا تو وہ سپہ سالار کے آگے لا کر رکھ دیتا ۔

اسلامی سیاست کے یہ رہنما اصول ایک ایسی ریاست کو وجود میں لائے جہاں نیکیوں اور بھلائیوں کا پرچار ہوا اور برائیوں کا خاتمہ جنھوں نے اس ریاست کو غیر مسلم ریاستوں سے ممیز اور ممتاز کر دیا تھا اور اس بات کا عملی نمونہ پیش کیا تھا کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا دار و مدار دین و سیاست کے چولی دامن کے ساتھ میں ہی ہے ۔ اسی لئے حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دعوت اسلامی

یہ دعوت، ہر دور و زمانہ، ہر علاقہ و صوبہ میں غرض زمین کے ہر چپہ میں مختلف افراد کے ذریعے پھیلتی رہی۔ امت کا ایک گروہ ہر دور میں ایسا رہا ہے جو حق کی طرف بلاتا رہا ہے۔ نیکیوں کو پھیلانے میں معاون اور برائیوں کے خلاف اعلان جہاد کرتا رہا ہے اقامت دین کے فرض کو لے کر اٹھ کھڑا ہوتا رہا ہے۔

آ آج کے اس گوناگوں دور میں بھی اسلام کی دعوت وہی ہے جو پہلے تھی۔ آج بھی اسلام انسانوں سے جانوں اور مال کی قربانی چاہتا ہے اپنے اولاد و رشتہ داروں کی، تعمیر نظر و سیرت و کردار کی، افکار و خیال کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی سیرت و کردار، طرز فکر و طرز گفتار، معیشت و معاشرت، سماج و تمدن، عدالت و سیاست غرض ہر انسانی پہلو کی قربانی ان چیزوں میں تبدیلی پیدا کرنے سے ہی لینا چاہتا ہے۔ اور یہ تبدیلی۔ ہمہ گیر انسانی زندگی کی تبدیلی وہ اللہ اور اس کے رسول صلعم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق۔ روشن و واضح رستہ پر چلا کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آج اس دور میں جب کہ برائیاں جنگل کی آگ کی طرح بڑھ رہی ہیں اور نیکیاں ڈوبتے سورج کی طرح کم ہو رہی ہیں۔ ظلم و فساد قوموں پر مسلط ہو گیا ہے۔ اقوام و ملل کی اخلاقی حس مردہ ہو چکی ہے۔ انسانی خواص مٹتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے دوسرے انسانوں کا اعتبار و اعتماد کلیتاً اٹھ گیا ہے نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی زندگی کا لازمی حصول بن گئی ہیں۔ مذہب کی جو کیفیات ہیں وہ بھی ہمارے سامنے ہیں۔ اخلاص تو مل جاتا ہے لیکن حقیقی مذاہب کی اساس سے اس کا تعلق ختم ہو رہا ہے۔ کہیں کلیسا کے راہب، صلیب کے نام لیوا امن و سلامتی کے نام پر انسانیت کا خون بہاتے دہشت و درندگی کا مناظرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کوئی فلسفۂ اخلاق کی تحریک اٹھتی ہے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور فلسفۂ اخلاق کو بنیاد بنا کر خود ہی اخلاقی اقدار ہی کو پامال کرتی نظر آتی ہے۔

معیشت کے سلسلہ میں کمیونزم کا فلسفہ دم توڑ رہا ہے۔ خود روس میں بھی وہ نظام رائج نہیں جس کی بنیاد مارکسزم پر رکھی گئی تھی۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا نظام خود واشنگٹن پیرس اور لندن کی گلیوں میں پناہ حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ مغربی تہذیب کے افراد مایوس ہو کر نظام سے بغاوت کر کے مشرق کی طرف جھک رہے ہیں۔ جہاں کے تہذیبی ورثہ میں انہیں کشش نظر آتی ہے چنانچہ پوری کی پوری قومیں، افراد و اجتماع، مذاہب و الہامی فکریں اخلاقی و معاشرتی قدریں اپنی موجودہ ڈگر سے ہٹ کر کسی اور طرز فکر پر چلنا چاہتی ہیں۔ اور اسی مقام پر اسلام کی دعوت انقلاب، فکری و عملی تبدیلی، معیشت و معاشرت، سماج و عمرانیات، تہذیبی و تمدنی، فکری و اخلاقی اقدار میں تبدیلی کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلام بھٹکی ہوئی انسانیت کو فلاح و کامرانی کی خوشخبری سناتا ہے۔ وہ اسی دور میں انسانیت کی اس کمی کو پورا کرتا ہے جو مغربی مفکرین، سیاست دان و ادیب پوری نہ کر سکے۔ یہ خوشخبری، یہ دعوت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ لوگ جو اس موقع پر اس بھولی ہوئی انسانیت کو نجات کا راستہ دکھانا چاہتے ہوں وہ اٹھ کھڑے ہوں اور خدا تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے اس کے احکام و قوانین کو یہاں نافذ کرنے کے لئے اور پوری کی پوری انسانی زندگی میں، انسانی تاریخ میں تبدیلی کا عزم راسخ لے کر آگے بڑھیں۔ فرسودہ قیادت کو لے کر آگے بڑھیں۔ نوع انسانی کی ہر پہلو سے زندگی میں اسلامی احکام کے مطابق تبدیلی پیدا کریں۔

تحریک اسلامی کے مطالبات

جس مقصد و نصب العین کے لئے تحریک اسلامی کام کر رہی ہے اس نصب العین کے حصول کے لئے اپنے قافلے کے افراد سے کچھ مطالبات پورے کراتی ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور پھر صرف ایمان لا کر ہی بیٹھ نہیں گئے بلکہ نیک عمل بھی کئے۔ عملو الصّٰلحٰت کے درجہ پر پہنچ گئے۔ ان سے یہ تحریک کچھ مطالبات بھی کرتی ہے۔ جو شخص اس تحریک کو قبول کر لے اور اس دعوت کیلئے کام کرنے کا جذبہ اس میں موجزن ہو جائے۔ اپنے دل میں عظیم انسانی قیادت کا بار سنبھالنے کی ذمہ داری اور اس کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت کر دے۔ اس تحریک سے کچھ تقاضہ کرتی ہے۔ یہ تقاضہ صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور دوسرے فرائض چند ظاہری مناظر تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تحریک اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے تحریکی ساتھیوں سے چند تقاضے، چند مطالبات ان کے سامنے رکھتی ہے۔

(۱) تعلق باللہ

تحریک اسلامی کے تقاضے اپنے ساتھ چلنے والوں، مجاہدوں، ہر رنگ میں نہ رنگ جانے والوں، ہوا کا رخ اور طوفان کا بہاؤ موڑنے کا عزم رکھنے والوں سے بنیادی مطالبہ یہ رکھتی ہے کہ وہ اپنے ایمان کا تعلق اساس مضبوط کریں۔ خدا سے اس ایمان کا

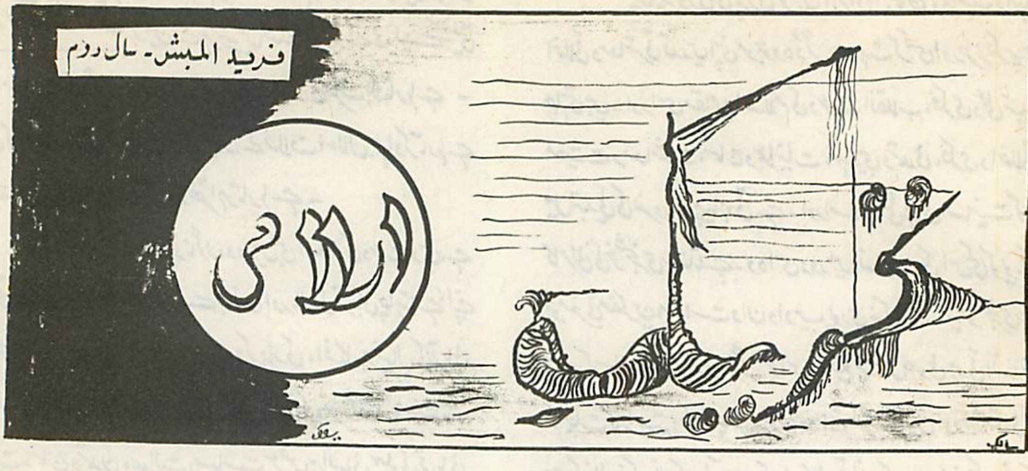

اسلامی تحریک

ایک ہمہ گیر نام ہے۔ یہ تحریک اس کے سلاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں دے دے۔ ایسی قوت حق ہو کہ جو اپنی دعوت۔ رنگ و نسل کی بنیادوں سے ہٹ کر، زبان و مقام کے تفرقہ سے دور، طبقاتی کشمکش سے بے نیاز، ساری کی ساری اطاعت، پورے کا پورا دین، خدا کی ربوبیت کا اقرار اس طرح کرے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ کی عملی تعبیر سامنے آجائے۔ ہر ذی شعور جان لے کہ زمین خدا کی، ملک خدا کا ہے چنانچہ اس زمین میں خدا کے قانون کی اطاعت ہو۔ نظام الٰہیہ کا نفاذ ہو، اور بندگی کا حق بندے کے لئے اور ربوبیت کا حق "رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ" کے لئے مختص ہو جائے۔

تحریک اسلامی کی تاریخ

اس دعوت کے لئے سب سے پہلے جو لوگ اٹھے انہیں خود خدا تعالیٰ نے چنا تھا۔ ان ہی کے ذریعے خدائے واحد و قہار نے اپنی نگرانی میں یہ تحریک برپا کی یہ لوگ ہر دور و ہر علاقہ میں مبعوث ہوتے۔ انہوں نے اس دعوت کا اعلان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے نعرے سے کیا۔ تمام طاغوتی طاقتوں سے، کفر و الحاد کی قوتوں سے اور باطل پرست تحریکوں سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ایک مالک و آقا، معبود و الٰہ کی بندگی کا اقرار۔ یہ دعوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا دی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

اس تحریک کے مکمل ہونے، اپنی نعمتوں کو بندوں پر تمام کرنے کی خوشخبری دے دی گئی اور تمام دنیا کے لئے اسلام کو دین حق کے طور پر پسند کیا گیا!

چنانچہ اب تحریک کا وہ حصہ اپنے اختتام پر پہنچا ہے۔ جہاں اس کی قیادت انبیاء کرام کر رہے تھے۔ اب یہ ذمہ داری امت مسلمہ پر ان الفاظ کے ساتھ ڈال دی گئی۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔ (ترجمہ) امت مسلمہ کو ایک معتدل امت قرار دیا جاتا ہے ان کو تمام دنیا کے لوگوں پر گواہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس امت کے لئے اللہ کے رسول کو گواہ رکھا گیا۔

چنانچہ اس حق کی گواہی دینے میں جو لوگ ثابت قدم رہے۔ رب السموات ان کے لئے بہترین خوشخبری کا وعدہ دیتا ہے۔ جنت کے ان باغوں کی خوشخبری جن کے نیچے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں رب کی طرف سے لاتعداد انعام و اکرام ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اصحاب الجنۃ کہا گیا۔ اور اصحاب المیمنۃ میں سے ہیں اور یہ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی۔ بہترزندگی ہے اور خیلر والقبیٰ ہے۔

کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں۔ کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جائیگا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور کسی کے اشارہ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا۔ خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ گویا انسان کی سچی آزادی کا اعلان تھا۔

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لئے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے لئے رہنما اصول ملتے ہیں پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے اور اسی ہستی کی قیادت میں قافلہ انسانیت فلاح و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے اس کا اقرار اسلام میں داخلہ کی شرط اول ٹھہرا۔ اس کلمہ کو مؤذنوں نے بلند آواز سے پکارا، اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا۔ اسے افضل الذکر قرار دیا گیا اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

حضورؐ کا انقلابی کلمۂ حق جس دل میں اترا اس کی کایا پلٹ دی، جس زندگی میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشو و نما پانے لگی۔

لانی ہے چمن میں گر لالی تو خونِ جگر ارزاں کر دو
یوں صرف خزاں کے ماتم سے تخلیقِ بہاراں کیا ہوگی
خود آپ کرو تزئینِ چمن شادابیٔ گل کے دلدادو
تخریب کے خوگر گلچیں سے تعمیرِ گلستاں کیا ہوگی

——— ڈاکٹر نذیر احمد شہید

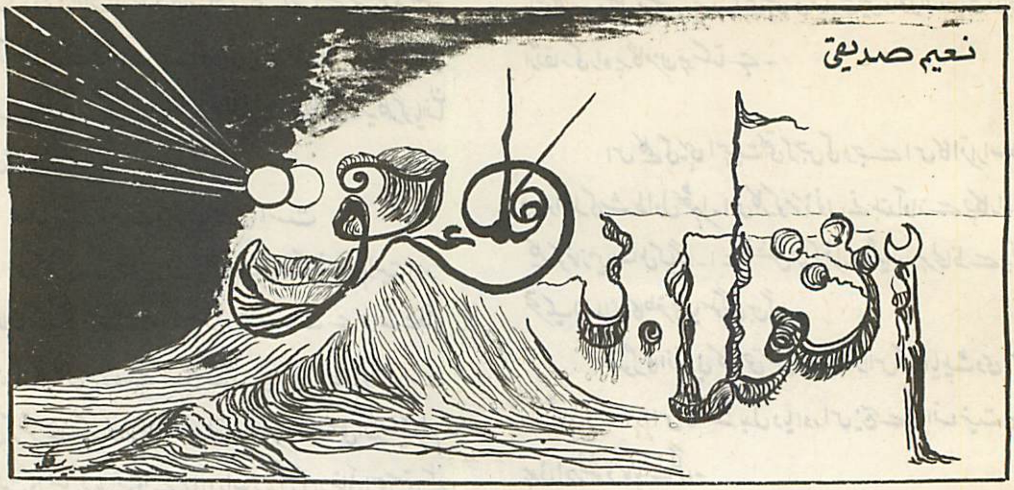

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعتقاد، کسی نظریہ اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہ تھا، کوئی جنونِ خام نہ تھا، بلکہ حضور کون و مکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کر اٹھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ۔ برسوں حضورؐ نے زندگی کے معمے پہ کاوشیں کی تھیں، غارِ حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الٰہی نے آپؐ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا۔ اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپؐ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔ یہی کلمۂ حق حضورؐ کے انقلاب کا بیج تھا۔ اس بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرۂ طیبہ نمودار ہو سکتا تھا۔ جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں تک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضور کا کلمہ حد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا "لا الٰہ الا اللہ"! لفظی پہلو سے انتہائی مختصر، معنوی لحاظ سے بے حد عمیق۔ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں صرف وہی ایک الٰہ ہے۔ الٰہ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے، جس پر آدمی والہانہ طور پر فدا ہو۔ جس کی عظمت مان کر پرستش کرے۔ جس کی تمجید و تقدیس کرے جس کے گن گائے۔ جس کی تسبیح کرے۔ جس کو نذر پیش کرے۔ جس سے بھلائی کی امیدیں لگائے اور جس کی گرفت سے ڈرے، جس سے نیکی کی جزا کا امیدوار ہو، اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رکھے جس کو اپنا مالک و مختار سمجھے۔ جس کو فرمانروا اور قانون ساز مانے، جس کے مطالبوں کو پورا کرے اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے۔ جس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بناتے زندگی بنائے۔ جس کی مقررہ حدوں کی پابندی کرے۔ جس کے ضابطہ حلال و حرام کو بے چون و چرا مانے، جس کو اپنے لئے سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرے۔ جس کی مرضی کے مطابق نظامِ حیات کی تشکیل کرے۔ جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے۔ جس کے اشاروں پر تن من دھن کی بازی لگا دے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا۔

الوہیت کے یہ حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے اور بے شمار الٰہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں نسلی، قومی اور قبیلوی وحدتوں کی روایات، جاگیردار اور بیوپاری طبقوں کی بالادستی شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی، یہ مختلف طبق پر طبق الوہیتیں تھیں جس کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا اور "لا الٰہ الا اللہ" کی شاہ ضرب ان سب پر یک دم پڑتی تھی۔ اس کلمہ کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں۔

جب ملک عرب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا پیام سنایا تو اردگرد کے ممالک میں بادشاہتیں قائم تھیں۔ روم، ایران اور حبشہ میں انسان انسانوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بتایا کہ کائنات میں حکمرانی اللہ کی ہے قانون بھی اسی کا چلتا ہے۔ کسی اور کو حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی بادشاہت کے مقابلے میں اپنا تخت بچھائے اور مخلوق خدا پر اپنی حکومت قائم کرے۔

دو اصولوں کی جنگ

فرات کے کنارے دو شہزادوں کی جنگ نہیں تھی، دو اصول ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ دو نظریے برسرپیکار تھے۔ ایک یہ کہتا تھا کہ اس دنیا میں بادشاہی قانون سازی اور کبریائی کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس کے برگزیدہ بندے اس کے قانون کا نفاذ کر کے زمین پر نظم و نسق قائم رکھتے ہیں۔ دوسرا یہ کہتا تھا کہ بادشاہت ہمارا حق ہے۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس فوج ہے، خزانہ ہے اور دنیا کے چند لوگ ہماری "ہاں میں ہاں" ملانے کے لئے تیار رہیں۔

امام حسینؓ اپنی کامیابی کے لئے دو طریقے استعمال کر سکتے تھے۔ چند سربرآوردہ لوگوں سے ساز باز کر کے حکومت کا مقابلہ کرتے یا عامۃ الناس میں شعور و بیداری پیدا کر کے نظام مملکت کو بدلنے کی کوشش کرتے آپ نے آخرالذکر طریقہ استعمال کیا۔ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک جس جس راہ سے گزرے، جس جس مقام پر خیمہ زن ہوتے وہاں کے لوگوں کو انسانی حقوق اور اسلامی فرائض سے آگاہ کیا۔ پھر چند ماہ مکہ کے مرکزی مقام پر رہ کر وہاں آنے جانے والے کو ان حالات سے باخبر کیا۔ پھر کربلا میں جتنے دن گزارے اپنے خطبوں کے ذریعے سے افہام و تفہیم کا کام انجام دیا۔ شب عاشور امام عالی مقام کے تاریخی خطبہ کے روز عاشورا آپ کی یادگار تقریریں کہ آپ تلوار سے نہیں بلکہ، افہام و تفہیم سے اسلامی دنیا پر اثرانداز ہونا چاہتے تھے۔ کیونکہ تلوار مسائل کو حل نہیں کرتی بلکہ الجھا دیتی ہے۔ اگر دنیا نے امام حسینؓ کی بات پر دھیان دیا ہوتا تو آج انسانی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا مگر اقتدار صرف طاقت کی زبان سن اور سمجھ سکتا ہے اور قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

حسینؑ اور ان کے ساتھی تین دن تک بھوکے پیاسے رہ کر شہید ہو گئے۔ ان کے خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ ان کی بے جان لاشوں پر گھوڑے دوڑا دیتے گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر حسینؑ کا عزم صمیم کوئی نہیں کچل سکا۔ ان کے صبر و استقامت میں کوئی چیز خلل نہ ڈال سکی۔

مقام شبیری، حقیقت ابدی

اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے آپ نے اپنے اہل حرم کو اپنا نائب اور ترجمان بنا دیا۔ لٹا ہوا قافلہ اموی سلطنت کے سارے مشہور شہروں سے گزرا۔ حکومت اپنے رعب داب کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ نقیب آگے آگے اعلان کرتے ہوتے چلتے تھے کہ "یہ علی کی اولاد اسیر ہو کر آئی ہے"۔ "یہ ہاشمی گھرانے کے لوگ ہیں"۔ "یہ حاکم وقت پر خروج کی سزا ہے"۔ اور اس طرح خود حکومت کے خرچ پر اور سرکاری نظام پر ملتے عامہ امام حسینؓ کے موقف اور ظالم حکومت کے کرتوت سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یزید کے خلاف عوامی بغاوت ہو گئی اور سب کو معلوم ہو گیا کہ بنی امیہ نے ایک بادشاہت قائم کی ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے آئین و قوانین کے پابند نہیں ہیں۔

یوں آخر فرزند رسولؐ اپنی جان دے کر اولوالعزم لوگوں کے اس کارواں میں شامل ہو گئے، جو نوع انسانی کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے زندگی کے ہر موڑ پر نمودار ہوتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ دنیا بگڑ بگڑ کر سنورتی اور مٹ مٹ کر ابھرتی رہتی ہے۔

امام حسینؓ نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ماننے کے قابل قانون تو صرف اللہ کا ہے۔ کسی فرد کو دھن، دولت، دھونس اور دھاندلی کے بل بوتے پر یہ اختیار حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ شہری حقوق پر ڈاکے ڈالے اور آزادی ضمیر پر پہرے بٹھائے۔ انہوں نے اپنے عمل سے بتایا کہ باطل کو من مانی کرنے کی کھلی اجازت نہیں دی جائے گی۔ حق کے پرستار تعداد میں قلیل ہی سہی مگر وہ علامتی مزاحمت (TOKEN RESISTANCE) کر کے تاریخ میں اپنا احتجاج ثبت کرائیں گے اور آئندہ نسلوں کو اپنے کٹے ہوئے گلوں اور چھیدے ہوئے سینوں سے یہ پیام دیں گے کہ حق کے مشن کو آگے بڑھاتے رہو اور ظلم کے سامنے سپر انداختہ نہ ہو جاؤ۔ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی جب محرم کا چاند افق پر نمودار ہوتا ہے تو ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرنے والے اسلام کا پرچم بلند کر کے امام حسینؓ کی روح کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں اور دنیا کو بتاتے ہیں۔

حقیقتِ ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

حق و باطل اور نور و ظلمت کی کشمکش

علامہ ابن حسن جارچوی

حق و باطل، نور و ظلمت، نیکی اور بدی کی کشمکش روزِ ازل سے جاری ہے۔ کبھی حق کا غلبہ ہوتا ہے، کبھی باطل اپنی عارضی کامیابی پر بغلیں بجاتا ہے۔ کبھی دنیا نور سے معمور ہو جاتی ہے، کبھی فضا تاریکی میں ڈوبتی نظر آتی ہے۔ کبھی بدی کی طاقتیں بظاہر نیکی کو مغلوب کر لیتی ہیں اور مخلوق خدا ظلم و ستم سے نڈھال ہو جاتی ہے۔ عربی کی ایک مثل ہے "تعریف الاشیاء باضدادہا" چیزیں پہچانی ہی اس وقت جاتی ہیں جب ان کی ضد موجود ہو۔ اندھیرا نہ ہو تو روشنی کی قدر کون کرے گا جس نے گرمی کی لذت نہ چکھی ہو وہ سردی سے کیا لطف اندوز ہو گا۔ اگر دنیا میں ہر طرف عدل و انصاف کا دور دورہ ہو تو ظلم و ستم کی برائی ہم پر کس طرح ظاہر ہو سکے گی؟ کارخانۂ قدرت کی رونق "اضداد" سے ہے۔ جب ہم کچھ کھو کر پاتے ہیں یا پا کر کھوتے ہیں تو اشیاء کی اصل قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زندگی کا کارواں بہت دور سے آ رہا ہے اور نسل انسانی نے تمدن و ترقی کے اس درجہ تک پہنچنے کے لئے بہت پاپڑ بیلے اور بہت سے "ہفت خوان" طے کئے ہیں۔

دینی اور معاشرتی انقلاب

حضرت نوحؑ اور ان کے مخالف و معاند، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود، حضرت موسیٰؑ اور فرعون۔ حضرت ماسوی اللہ کے ہر قسم کے اقتدار کو جلا کر رکھ دیا۔ یہ حضرات ابراہیم علیہ السلام ہی کی تعلیم و تبلیغ کا اثر تھا جس نے مصری فرعون کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ فلسطین میں رومی سامراج پر کاری ضرب لگائی اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے کعبے کے بتوں اور قریش کے مہنتوں کی حکومت ختم کی۔

اسلام سچ مچ ایک دینی معاشرتی اور سیاسی انقلاب تھا۔ مگر انقلاب کوئی دھماکہ نہیں ہوتا جو دفعتہً رونما ہو جاتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ جو ایک دم و یک لخت پھٹ پڑتے ہیں اور آگ برسانے لگتے ہیں، ان کا آتش فشانی مادہ بھی برسوں میں جا کر جمع ہوتا ہے اور بعض اوقات تو صدیوں کے بعد جا کر پھٹتا ہے۔ اسی طرح تمدنی اور معاشرتی دنیا میں جو انقلابات آتے ہیں ان کے علل و اسباب بھی برسوں سے مجتمع ہوتے رہتے ہیں اور کسی دن دفعتہً ہمارے سامنے آ جاتے ہیں تو ہم اس دن کو "یوم انقلاب" کہنے لگتے ہیں۔

کرۂ ارض پہ انسانوں کے قدم

جب اس کرۂ ارض پر حضرت انسان نے قدم رکھا تھا تو اس کا تمدن تہذیب اور ثقافت فطرت کے تقاضوں کے مطابق تھی اور سب "دین فطرت" کے پابند تھے۔ شروع شروع میں لوگ درختوں کے پھلوں سے پیٹ بھرتے۔ جڑی بوٹیاں کھا کر گزارہ کرتے پھر سبزی ترکاری بونے لگے۔ لوگ کم تھے، زمین زیادہ تھی، جنگلی جانور بہت تھے، جو چاہتا کھیتی کرتا، جو چاہتا جنگلی جانوروں کا شکار کرتا۔ مگر جب نسل انسانی بڑھی اور زرخیز زمین ہر شخص اور خاندان کے لئے کافی تعداد میں نہ مل سکی اور شکار کے لئے جنگلی جانور بھی آسانی سے میسر نہ آ سکے تو افراد افراد سے ٹکرائے خاندان خاندان سے دست و گریباں ہوئے اور قبیلے قبیلوں پر چڑھ دوڑے اور ایک نے دوسرے کی ملکیت پر قبضہ جمانے کے لئے "ٹھگ بدیا" کی داغ بیل ڈالی زبردست کمزوروں کا مال ہتھیا لیتے۔ اور اپنے آپ کو اور آس پاس کے دوسرے لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے کوئی ضابطہ۔ بادشاہ اس کو کہتے ہیں جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر حکم قانون ہو۔ اسلام میں اسی وجہ سے بادشاہت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

زندگی دیا ہے جو دوسرے ضوابط زندگی، مثلاً کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم اور میٹریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پر ان کے نظام اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے اور ان کو علوم و آداب ہیں اخلاق و معاملات ہیں۔ عادات و اطوار میں تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست ہیں غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک کر کے اور بعض کو اختیار کرنیکی ہدایت کرتا ہے اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریق فکر اور ایک خاص مقصد حیات پر رکھی گئی ہے جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریق فکر و مقصد حیات سے بالکل مختلف ہے جسکی رو سے اشیاء کی قدریں دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر تعین ہوتی ہے اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کئے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کی بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ایسا ہو جو ان کے دل اور دماغ میں اسلام کے طریق فکر و مقصد حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں مسلمان کی حیثیت سے سوچیں اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظام تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں اگرچہ ان کے بعض افراد کی علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو اس غرض کیلئے اسلام کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

بقیہ: قرآن کا طریق انقلاب

بادشاہت کا خاتمہ غاصبین کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر خدا کی طرف اسے لوٹانا۔ شریعت الٰہی کی فرمانروائی، انسانی قوانین کی تنسیخ۔ یہ سب مہمیں مجرد دعوت و تبلیغ سے انجام نہیں پا سکتیں۔ جو لوگ خلق خدا کی گردنوں پر سوار ہیں اور انہوں نے اقتدار خداوندی پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ تیری تبلیغ اور اپیل سے اپنے تخت و اقتدار سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہی معاملہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے لئے دنیا کے اندر دین حق کی سرفرازی نہایت سہل کام ہوتا لیکن انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے جو کچھ واضح ہوتا ہے وہ اس کے برعکس ہے چنانچہ اس اتنے اہم مشن کو سرانجام دینے کے لئے ضروری تھا کہ یہ اعلان مجرد تبلیغ و دعوت تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا قالب بھی اختیار کرے تاکہ عملی صورت حال کے ہر ہر پہلو کا مقابلہ متوازی اور عملی وسائل و ذرائع سے ہو سکے۔

انسان نے ہر دور میں، دور ماضی میں بھی، عہد حاضر میں بھی اور شاید عالم فردا میں بھی۔ مبین دین حق کا طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے مقابلہ کر کے اسے نیچا دکھانے کی کوششیں کی ہیں۔ کیونکہ یہ دین انسانوں کو غیر اللہ کی آقائی سے آزاد کرتا ہے۔ چنانچہ انسانوں نے اس دین کے راستہ میں فطری اور مادی ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی دیواریں حائل کیں۔ نسلی اور طبقاتی نعرے استعمال کئے۔ انسان کے منحرف عقاید اور باطل تصورات بھی مذکورہ عوامل کے پہلو بہ پہلو کام کر رہے تھے۔ اور ان کے اتحاد سے انتہائی پیچیدہ صورت حال ظہور پذیر ہوتی رہی ہے۔

اگر تبلیغ، عقائد اور تصورات کی اصلاح کرتی ہے تو تحریک دوسرے مادی سنگہائے راہ کو صاف کرتی ہے۔ جن میں سرفہرست وہ سیاسی قوت ہے جو پیچیدہ مگر مربوط فکری، نسلی، طبقاتی، اجتماعی اور اقتصادی سہاروں پر قائم ہوتی ہے اور یہ دونوں "تبلیغ اور تحریک" قائم شدہ نظام پر چاروں طرف اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور ان کے عوامل و اسباب کے ساتھ اپنے نئے نظام کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور اس غرض کے لئے ہر مخالف عامل کا اس کے ہم پلہ عوامل اور وسائل سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس زمین پر انسان کی حقیقی آزادی بلکہ پوری دنیا میں پوری انسانیت کی حقیقی آزادی کا عظیم مشن سرانجام دینے کے لئے ان دونوں کو (یعنی تبلیغ اور تحریک کو) دوش بدوش کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہایت اہم نکتہ ہے اسے بار بار ذہن نشین کرنا نہایت ضروری ہے۔

(معالم فی الطریق۔ سید قطب شہیدؒ)

اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق معین کرو جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ تمہارا انفرادی اور اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بناء پر انتخاب کرو جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تمکو ملا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ـــــ کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے۔ چند عبادات تجویز کرتا ہے چند شعائر (جو عام اصطلاح میں مذہبی شعار کہلاتے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے۔ ٹھیک اسی نظریۂ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مراحل میں مادی وسائل اور قوانین طبیعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے۔ طریق فکر ایک ہے نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے۔ اس لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصولوں کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے جوہری اختلاف ہرگز نہیں۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی آپ خواہ پاکستانی ہوں یا ترکی، یا مصری۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنا پڑے گی، اور ہر اس اسکیم کو رد کرنا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا۔ آپ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں دنیا کو جس طرح برتیں گے دوسرے مرحلہ میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقے سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلے میں صحیح نتائج حاصل ہوں ـــ

پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے اور اس میں اعتقادات و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز کو ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں تو یہ جزوی ارتداد ہے جو آخر کار ارتداد کلی پر منتہی ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت ان ہی معتقدات اور ان ہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام لایا ہوا اور ایمان رکھتا ہوں اس کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا مصداق ہے پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرہ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانیکے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

پس چہ باید کرد۔ اسلام اس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جو دنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کیلئے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرہ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر اور انسان کو زمین میں خلیفۂ الٰہی قرار دیکر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے تاکہ انسان دنیا میں صحیح برتاؤ کرے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو اس غرض کیلئے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطہ

سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصلی مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے وطن پرست پھر مسلمان اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافیائی تقسیم قبول کر سکتا ہے، ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام ہندوستانی اسلام، پاکستانی اسلام اور پھر پنجابی، بنگالی، سندھی، بلوچی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کئے ہیں اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے اس لئے کہ اسلام ایک "مذہبی" ضمیمہ ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور طریقے کیساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین و دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیئے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں یعنی اعتقادات و عبادات ان کی حد تک مسلمان اپنی الگ راہ پر چل سکتے ہیں اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے نہ ہٹا سکتا ہے رہے دنیوی معاملات تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیئے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی تمدنی اور لسانی حقوق کیلئے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کیلئے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیئے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جد و جہد کر رہی ہے۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کیلئے اٹھے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجے میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اس لئے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں گے وہی ان کے اصلی اہمیت رکھتے ہیں باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہہ میں کام کرتا ہے اور جو اپنے طریق فکر و زاویۂ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو یا جرمنی یا اطالوی یا فاروقی و خالدی ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ان کے نزدیک یہ سب یکساں اسلامی ذہن ہیں۔ کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے۔ یعنی علو اور تمکن فی الارض ان کی نگاہ میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے وہی "صالح ہے" اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے وہی "مومن" اگرچہ وہ مسیحؑ کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا کیوں نہ ہو۔ دیکھا آپ نے شکلیں کس قدر مختلف ہیں، مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اس جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو انکی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے ہی ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کریم کا طریق فکر ہے — زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو جو قرآن کی نظر ہے — تم

پھر یہی طریق فکر اور نظریہ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور پاکیزہ روحانی منتہائے نظر معین کرتا ہے اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو خواہ وہ کسی میدان میں ہو۔ ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (VALUE) متعین کی جاتی ہے اس معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے جو اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور جو شے سد راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر جماعت کی زندگی کے بڑے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کار فرما ہے وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، طہارت میں صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف جانیوالی سیدھی راہ پر قائم رہے اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کئے جائیں۔ جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبہ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہوں جو اصل منزل مقصود کی طرف جانیوالے ہوں اور وہ راہیں اختیار نہ کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کیلئے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے تاکہ وہ اس مقصد کی خادم بن جائیں اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں، صلح میں، اشتراک و اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تاکہ خارجی تعلقات کے ان پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے نہ ہٹنے پائیں۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے غرض وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لیکر بازار اور میدان کارزار تک طریق عبادت سے لیکر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک غسل و وضو اور طہارت و استنجا کے جزوی مسائل سے لیکر اجتماعیات معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لیکر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ جاہل اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے، خانقاہوں اور مسجدوں کے "تاریک" حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشہ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں، اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی تاریک خیال۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے اور تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نور علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

جاہلی تصور کے اثرات ۱۔ فہم و ادراک کے اس تصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربوں کی بناء پر ۔ جن کو ہر زمانے میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانۂ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کیلئے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں مذہب چونکہ ان کے لئے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس لئے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا۔ جہانسوزی اور غارتگری کا بھی، سود خواری اور زنا و نیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصور:۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فطری تصور پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اس کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا بھی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جزء نہیں بلکہ تمام زندگی ہو زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو۔ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنیوالی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے۔ راہ کج سے بچائے۔ راہ استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں جو دنیا سے لیکر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کیساتھ گزار دے

اسی مذہب کا نام **اسلام** ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کیلئے نہیں آیا ہے۔ بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ساتھ ایک ضمیمہ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے۔ اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ اور ایکدوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا۔ جب تک انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں۔ دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں اور مذہب کا اصل کام اس کامیاب زندگی کیلئے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

" اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے

انقلابی تصور:۔ اسلام ایک خاص طریق فکر (ATTITUDE OF MIND) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (OUTLOOK ON LIFE) ہے پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اس طریق فکر اور اس نظریہ زندگی سے متعین ہوتا ہے اس طریق فکر اور طرز عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے۔ وہی تہذیب اسلامی ہے اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بنلاتے ہیں وہی ایک طریق فکر اور نظریہ حیات ہے۔ جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے عزیزوں اور قرابتداروں کے پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، قوم و ملت کے، ملک و وطن کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے۔ حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اسی امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا۔ بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

مذہب کا انقلابی تصوّر

ابوالاعلیٰ مودودی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کیلئے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے اس کا تعلق کلیتہً صرف اس رشتے سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ محض نجات مطلوب ہو اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود ان پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے۔ اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔

مذہب اور تہذیب: — یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں۔ اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو اس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے ہیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا بہت اثر ڈالا۔ مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے اس لئے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، لذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیئے یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لئے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بد سے بد تر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے اس چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود اس مذہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

نہ دی ۔ خدا کو معلوم ہے کہ یہ طریق کار دعوت اسلامی کے لئے موزوں و مناسب نہیں ہے ۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمہ معانی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں ۔ جو معاملات کی زمام کار کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو ۔ اور معاشرہ ہر اس فیصلہ کو برضاو رغبت قبول کرتا ہو جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے صادر ہو اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں' پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر دیا ہے ۔ اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے ۔ اور اس نظام کی اطاعت سے اسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے ، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا ۔

معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل میں حرص و آزرد کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں ۔ تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کئے جارہے ہوں ۔ جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں ۔

آپ نے محض ایک اصلاحی تنظیم سے دعوت کا آغاز کیوں کیا؟

رسول اللہ کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی ۔ صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے ۔ ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔ شراب خوری اور جوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے ۔ اور ان پر فخر کیا جاتا تھا ۔ زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی ۔

سوال کیا جاتا ہے اگر رسول اللہ چاہتے تو ایک اسلامی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے ذریعے اخلاق ، تزکیہ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کر دیتے اور اس طرح وہ بآسانی اچھے انسانوں کی ایک جماعت کو اپنا متفق بنا لیتے اور اس طرح پہلے ہی مرحلے میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتے ۔

اس طریقے کی کمزوری

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل مقصود کو نہیں جاتا ۔ اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پہ ہی ہو سکتی ہے ۔ لیکن ایک ایسا طریقہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار ردّ و قبول فراہم کرے اور دوسری طرف اس طاقت (ENERGY) کا تعین بھی کرے ۔ جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں ۔ اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو ۔ اور اس جزا و سزا کی نشاندہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کی صورت میں اس طاقت کی طرف سے دی جائے گی ، وگرنہ اس طاقت کے تصور کے بغیر اقدار و معیارات مسلسل تغیر کا نشانہ بنے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر قائم رہنے والا اخلاقی نظام ڈانواں ڈول رہے گا ۔

نظام حق کی کامیابی کا واحد راستہ

اگر دعوت اسلامی کا قافلہ اسی انداز سے روانہ سفر ہوتا اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گذار جاں گسل راہ تھی مگر حقیقت میں آساں اور برکت بداماں تھی ، تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا جز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا ۔ اس طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بنکر سامنے آتی یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی یا اصلاحی فہم کا قالب اختیار کرتی یا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے اشعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قائم ہوا کبھی خالص ربانی نظام بنکر جلوہ گر نہ ہو سکتا

دنیا میں حکومت الٰہیہ کیسے قائم ہو سکتی ہے

دنیا میں خدا کی بادشاہت کے قیام کی یہ صورت نہیں ہے کہ مسند حاکمیت پر کچھ مقدس رہنما (یعنی رہنما) فروکش ہو جائیں ۔ جیسا کہ چرچ کی بادشاہت کا حال تھا ۔ اور نہ یہ درست ہے کہ دیوتاؤں کے کچھ نمائندے زمام حاکمیت ہاتھ میں لے لیں جیسا کہ تھیوکریسی یا خدا کی مقدس حکومت کے نام سے یاد کئے جانے والے نظام میں رائج تھا ۔ خدا کی بادشاہت کا قیام یہ ہے کہ خدا کی شریعت حکمرانی کرے اور تمام معاملات کا آخری فیصلہ اس کے مطابق کیا جائے لیکن پیش نظر رہے کہ دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام ، انسان کی

نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ حضورؐ اگر چاہتے تو انہیں قومیت کا درس دیتے اور عرب کی سرزمین کو آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس پر عرب کا بچہ بچہ کھنچا ہوا لپکتا اور آپ کو مصائب نہ سہنے پڑتے جو ۱۳ سال تک سہنے پڑے۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے اور قیادت کا منصب آپ کو سونپ دیتے، اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ کے قبضہ میں آجاتیں۔ اور رفعت و عظمت کا تاج آپ کے مبارک سر پہ رکھ دیا جاتا تو آپ اپنی بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدہ و توحید کا سکہ رواں کرنے کے لئے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جاکر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے۔ لیکن خدائے علیم حکیم نے اپنے رسول کو اسی راستہ پر نہیں چلایا۔ بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپ خود اور مٹھی بھر افراد جو اس پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لئے بھی تیار رہیں۔

وجہ

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بنیں لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوق خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پاکر عربی طاغوت کے پنجے میں گرفتار ہو جاتے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ یہ ملک اللہ کا ہے اور اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار قائم ہونا چاہئے۔

اللہ کا اقتدار صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف لا الہ الا اللہ کا پرچم لہرائے۔ ایک عرب لا الہ الا اللہ کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو۔ اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع اور ماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ اور اقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لئے ہے اور اسلام انسانوں کے لئے جس قومیت کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پہ طے ہوتی ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ کسی رنگ و نسل کی ہوں۔ عربی ہوں یا رومی اور نصرانی سب کی سب اسی عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں کہ ان کے نزدیک اسلامی دعوت کا صحیح اور فطری طریقہ کار ہے۔

اقتصادی طریق کار اختیار نہ کرنے کی وجہ

رسول اللہؐ کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا اور سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمایہ کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے۔ نبیؐ نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھہرا کر امراء و شرفا کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اگر رسول اللہؐ اس دور میں ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا مگر غالب اکثریت آپ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور مقابلہ میں وہ معمولی سی اقلیت رہ جاتی جو اپنے مال و جاہ سے چمٹی رہتی۔ یہ طریقہ زیادہ موثر اور کارگر ہوتا اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پورا معاشرہ لا الہ الا اللہ کے خلاف صف آرا ہو جائے اور صرف چند نادر روزگار ہستیاں ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہؐ میں یہ صلاحیت بدرجہ کمال موجود تھی، کہ جب ان کی اکثریت آپ کی تحریک سے وابستہ ہو کر اپنی زمام قیادت آپ کے ہاتھوں میں دے دیتی اور آپ دولت مند اقلیت پر قابو پاکر اس کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا چکتے تو آپ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور اپنی پوری قوت و طاقت کو اسی عقیدہ توحید کے منوانے اور راسخ کرنے میں استعمال کر لیتے جس کے لئے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انہیں پروردگارِ حق کے آگے جھکا دیتے۔

لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپ کو اس طریق کار پہ چلنے کی بھی اجازت

قرآن کا طریقِ انقلاب

سید قطب

مکی دور کا بنیادی مسئلہ

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی صورتوں پر مشتمل ہے پورے تیرہ ۱۳ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدت میں قرآن کا مدار بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔ قرآن نے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوتا گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اس مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اولین اہمیت کا حامل تھا۔ عظیم تر مسئلہ تھا۔ اساسی اور اصولی مسئلہ تھا۔ عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا۔ ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت، قرآن کریم اس بنیادی مسئلہ کو لیکر انسان سے بحیثیت انسان خطاب کرتا رہا۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلق ہے۔ وہ چاہے عرب کے رہنے والے ہوں یا غیر عرب۔ نزول قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانے کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

کارِ رسالت کا آغاز اسی مسئلہ سے ہوا

یہ عین حکمت خداوندی تھی کہ آغازِ رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے۔ دعوت کا محور و مرکز بنایا جائے یعنی اللہ کے رسولؐ راہِ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں کہ لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔ اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں اور انہیں صرف اس کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

رسول اللہؐ نے قومیت کے نعرہ سے کیوں نہ کام لیا؟

رسول اللہؐ جب اللہ کی طرف دین حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت یہ حالت تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مال دار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے۔ بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ یہ بات بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ محمدؐ اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ اس بات پر پوری طرح قادر تھے۔ کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیتوں کے جذبے کو بھڑکاتے اور اس طرح ان قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں جنہیں باہمی جھگڑول

سوئے حرم

ہمارا جاسوسی ادب - ہمایوں ظفر وقت گزاری کے ادب کا دلچسپ محاسبہ کرتے ہیں............ ۱۱۶
سیر مسیحاؤں کے مسکن کی۔ تنویر صادق ہوسٹل کی خوشگوار زندگی کے ناخوشگوار تجربات کی تصویر کھینچتے ہیں...... ۱۴۳
عیادت - اشرف ظہیر احسن کی ایک معصوم خواہش جوان کے لئے زحمت بن گئی۔............ ۱۵۵
ایک منتخب افسانہ - شہاب جاوید بضد ہیں کہ یہ بھی ایک افسانہ ہے..................... ۱۷۰

شگفتہ شگفتہ

ہم نے طلبا سے کچھ پوچھا تھا — انہوں نے شگوفے کھلادیئے........ ۱۳۷

آوازِ جرس

اساتذہ طبی اور قومی مسائل پر کیا کہتے ہیں.......................... ۹۷

انداز مسیحائی

ذیابیطس کے موذی مرض پر سید نذر علی کے قلم سے ایک مقالہ.................. ۱۶۶
شوکت علی ملک مسلمانوں کی طبی خدمات کی تصویر ماضی کے آئینے میں سجاتے ہیں.............. ۱۳۵

آتشِ گل

نمودِ سحر - عزیز حمیدی
لینن کے نام............ ۶۵
فرمانِ امروز - رحمٰن کیانی....... ۷۷
نعت رسول مقبولؐ - علامہ اقبال...... ۸۰
زندگی کا سفر - اشرف ظہیر احسن..... ۸۲
عزم وتمنا - زین السالکین......... ۸۲
علم - عزیز حمیدی............ ۱۲۴
بیادِ مالک شہید - عزیزہ انجم........ ۱۲۶
سورج - اقبال ہاشم.......... ۱۲۷
حقائق - فاطمہ قدسیہ.......... ۱۲۸

صیقل خانۂ دل

یاسمین محبوب....... ۸۵
حسن اکبر جمال....... ۱۲۳
یوسف سونیجا....... ۱۳۰
اسلم شاہ....... ۱۳۰
اسما صدیقی....... ۱۴۶
عذرا جمال....... ۱۴۶
زین السالکین....... ۱۴۷
سید سبط حسن....... ۱۴۸
محمد ابراہیم....... ۱۴۸
شہاب جاوید....... ۱۴۹
عذرا جمال....... ۱۵۰
نثار احمد حیمہ....... ۱۵۰
بشیر احمد نسیم....... ۱۵۱
شائستہ ظفر....... ۱۵۲
مفتاح الحسن زیدی....... ۱۵۲
شمیم آزر ۱۵۳
یاسمین محبوب ۱۵۴

صورت آئینہ

صاحب سیف و قلم سے ایک ملاقات ..... زین الملکین رحمان کیانی سے انٹرویو لیتے ہیں۔..... ۷۱

فکر و نظر

بیت المقدس کے نشیب و فراز اور صیہونی سازشیں ظفر الاسلام ۔ تاریخ کے آئینے میں بے نقاب کرتے ہیں ۱۳۱

قومی کھیل

پاکستان میں ہاکی کی تاریخ اور اس کا مقام .... اسلم صدیقی کا مختصر جائزہ ۱۶۴

محشرِ خیال

یادیں جو اَن مٹ ہیں .... منظر سلیم کی ایک حسین تاثراتی نظم ۸۱

دریچے

وطن کا پاسبان .... بدرالنساء کے حب الوطنی میں ڈوبے قلم ۸۹
کی ایک حقیقی افسانوی تخلیق

خزاں کی بہاریں .... ظہیر نادر بھٹی کا زندگی کی حقیقتوں سے پُر افسانہ ۹۳

اور وہ ہار گیا .... طارق بٹ کے قلم سے بہن بھائی کے لازوال پیار ۱۱۸
کی ایک داستان

تمہارے نام .... نورجہاں رحمت اللہ کا ایک خوبصورت رومانوی افسانہ ۱۲۱

کالا صندوق .... زین الملکین جیتے جاگتے روشن معاشرے کے
ایک تاریک پہلو سے پردہ اٹھاتے ہیں......... ۱۵۸

تلاشِ سحر .... ایک خوبصورت افسانہ جسے عزیزہ انجم نے تحریر کیا ۱۶۱

رات کا دکھ .... درد میں ڈوبی تحریر ۔ عذرا جمال کے قلم سے ۱۷۴

شرارتی لکیریں

ہوٹل ۔ اقبال ہاشم کی آڑھی ترچھی لکیریں جو صرف ایک پیشہ ور مزاح نگار ہی بنا سکتا تھا ۸۳

ڈاکٹر اے کے غالب کی کلینک میں ۔ شکیل احمد مرزا غالب سے دلچسپ انٹرویو لیتے ہیں ۸۶

ریسرچ ۔ عبدالحمید ریاضی کی خشک زبان میں لکھا ایک ریاضی داں کا دلچسپ محبت نامہ چراتے ہیں ۹۵

ہم پہ احساں جو نہ کرتے ۔ شاہدہ وحید شوق مسیحائی کے خطرناک رجحانات سے روشناس کراتی ہیں ۱۱۳

** حُسن ترتیب **

قائداعظمؒ نے کہا .... ایک لمحۂ فکر

پیغام .... ڈاکٹر محمود حسین۔ شیخ الجامعہ

پیغام .... پروفیسر فضل الٰہی۔ چیئرمین لمودِ سحر

پیغام .... آفتاب احمد قاضی۔ سابق صدر انجمن اتحاد طلبا ڈاؤ میڈیکل کالج

اداریہ .... نویدِ صبح

سوئے حرم

قرآن کا طریقِ انقلاب .... سیّد قطب شہید ۲۶

مذہب کا انقلابی تصور .... سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ۳۰

حق و باطل اور نور و ظلمت کی کش مکش .... علامہ ابن حسن جارچوی ۳۵

انقلابی کلمۂ حق .... نعیم صدیقی ۳۷

تحریکِ اسلامی .... فرید المبشر ۳۹

جدا ہو دین سیاست سے تو .... سیّد سبط حسن ۴۲

دورِ حاضر کا انسان اور فرمانِ خداوندی .... عبدالرحمٰن ۴۶

سائنس اور مذہب .... فرخ ابدالی ۴۸

آتشِ نوا

اقبال اور عشق سیّد البشرؐ .... پروفیسر سیّد شاکر علی جعفری ۵۲

کیا ڈاکٹر اقبالؒ اشتراکی تھے .... ڈاکٹر جاوید اقبال ۵۵

پیغامِ اقبالؒ .... رانا عبیدالرؤف ۵۷

علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی .... تاج تبسم ۵۹

انعامی مضامین

احتساب ارتقاء کے لئے ضروری ہے .... عزیزہ انجم کی ایک خوبصورت نگارش ۶۲

احتساب ارتقاء کے لئے ضروری ہے .... غزالہ ابدالی کی عمدہ کوشش ۶۴

پاک سرزمین

پاسبان .... نثار احمد حیمہ کے قلم سے وطن کی پکار ۶۶

میرا دیس .... سعید اختر ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۷۸

اپنی باتیں

خدا خدا کرکے تین سال کے طویل عرصے کے بعد طلوعِ سحر کا انتظار ختم ہوا۔ نمودِ سحر کا ظہور ہوا۔ اگرچہ زندگی کی شبِ تاریک ابھی تک صبحِ نو کی منتظر ہے۔ بہرحال! ہم نمودِ سحر کی خوشخبری لے کر حاضر ہیں۔

نمودِ سحر کو ہم نے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔ مجلّہ کی آرائش میں بہت محنت کی گئی ہے۔ شاید اس کا احساس ہر پڑھنے والے کو ہو۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں عرض ہے کہ یہ مضامین میڈیکل کالج کے طلباء نے تحریر کئے ہیں۔ وہ کوئی منجھے ہوئے ادیب تو نہیں۔ ان کی تخلیقات ان ہی کی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اگر اس باب میں کہیں کوئی کمی نظر آئے تو صرفِ نظر کیجئے۔

ہمارے ساتھ اکثر طلبا نے ہر ممکن طور پر تعاون کیا۔ مضامین ہمیں اس کثرت سے ملے کہ ہمیں کسی بھی عنوان پر مضامین کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس متعدد مضامین شریکِ مجلّہ نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے دوستوں سے معذرت خواہ ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان کی تخلیقات اتنی معیاری نہ تھیں کہ شاملِ اشاعت نہ کی جا سکیں۔ بلکہ اس لئے کہ نمودِ سحر کا دامن صفحات محدود تھا۔ صرف اور صرف یہی وجہ تھی کہ کئی مضامین شریکِ مجلّہ نہ ہو سکے۔

نمودِ سحر کو سب سے پہلے جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا وہ اشتہارات کا معاملہ تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں بہت سے لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن نہ معلوم مشتہرین حضرات قومی زبان کے اس مجلّے میں اشتہار دینے سے گریز کیوں کرتے ہیں، نتیجتہً ہم مطلوبہ فنڈز جمع نہ کر سکے۔ آج کل کاغذ کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اخباری کاغذ خریدنا جرم ہے۔ پرنٹنگ کاغذ کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نمودِ سحر مزید ضخیم نہ ہو سکا۔ لیکن اچھی چیز کا اندازہ اس کی ضخامت یا مقدار سے نہیں بلکہ معیار سے کیا جاتا ہے۔ اس باب میں ہم اہلِ فکر و نظر کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں — نمودِ سحر ابھی تکمیل کے مرحلے طے کر رہا تھا کہ مسیحاؤں کی دنیا میں ایک طوفان آگیا۔ طوفانِ دار و گیر و شورشِ قید و سلاسل۔ صدر انجمن مصباح العزیز اور ہمارے دوسرے چند ساتھی گرفتار کر لئے گئے اور ہمیں اپنی ساری قوتیں اس طرف صرف کرنی پڑیں۔ یہی باعث ہے اشاعت میں تاخیر کا۔

اس مجلّے کی ترتیب و تدوین میں اساتذہ کرام نے اپنے مفید مشورے سے ہماری راہنمائی کی۔ خاص طور پر پروفیسر فضل الٰہی صاحب نے جس دلچسپی کا اظہار کیا اور ہماری کوششوں میں ہاتھ بٹایا۔ ہم تہِ دل سے ان تمام قابلِ احترام ہستیوں کے ممنون و معترف ہیں۔ پرخلوص اساتذہ کی شفقت کا اظہار ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے۔ اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔

راہنمائی کا تمہاری شکریہ

جب مقاصد عظیم ہوں تو محدود وسائل آڑے آتے ہیں۔ ان گنت مشکلات آگھیرتی ہیں، کم نظر طرح طرح کی رکاوٹوں سے راہ مسدود کرنے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں کامیابی کیلئے کتنی ضروری ہوتی ہیں اس کا اندازہ ہمیں حسن انتخاب سے لیکر حُسن طلوع تک کی منازل میں بخیر و خوبی ہو گیا۔ ہمارا معیار ادبی اقدار پر کس حد تک پورا اترتا ہے، اس بارے میں ہمیں کوئی خوش فہمی نہیں۔

کاغذ کی قلت اور مہنگائی ایک قومی المیہ ہے کیونکہ اس کا اصل سبب ہمارے سوہنے سنہرے دیس کا ہم سے بچھڑنا ہے۔ اوروں کے آنسوؤں میں ہمارے آنسو بھی شامل ہیں۔ یہ آنسو لہو کے آنسو ہیں کیونکہ یہ اپنوں کے دیئے ہیں، غیروں کے نہیں۔

جب بات شخصیات کی ہو تو اجتماعی نقصان ناگزیر ہوتا ہے۔ یہی ہمارے آپ کے ساتھ ہوا۔ گذشتہ کئی سالوں میں نوید سحر کی سحر کیوں نہ ہوئی۔؟ اپنے پرچے کے لئے اشتہارات لیتے وقت ہماری گردنیں کیوں خم ہوئیں۔؟ مسیحاؤں کی اس بستی اور اس عظیم پیشے کا تقدس کیوں مجروح ہوا۔؟ کس نے اس تقدس کو مجروح کیا۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جو طلباء نہ صرف میگزین سیکشن سے متعلق اپنے سابقہ نمائندوں بلکہ حکومت سے بھی کرنا چاہیں گے

اس دور کا طالبِ علم تعلیمی اداروں اور طبی پیشے کے تقدس کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کی آئینی آزادی کا بھی طالب ہے۔ اور ملک کا خواندہ اور باشعور طبقہ ہونے کے ناطے صرف انہی کو اربابِ اختیار کی صف میں دیکھنا چاہتا ہے جو اس حق کے راستے میں کانٹے نہ بچھائیں۔

آخر میں ہم یہ بات واضح کرنا چاہیں گے کہ یہ پرچہ انفرادی نہیں، اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ایک منظم ٹیم ورک ہے، اور کارکنوں کی مخلصانہ کوششوں کا حاصل ہے۔ امید ہے کہ ہماری اس حقیر کوشش کی خامیوں کو فراخ دلی سے نظر انداز کیا جائے گا۔

ہم خدا تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں کہ اس نے ہمیں پرورشِ لوح و قلم کا موقع دیکر خدمت کرنے کے قابل بنایا۔ اگر آپ کا تعاون شریکِ حال رہا تو انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ہم اس معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

(مدیر اعلیٰ)

اداریہ

نویدِ صبح

جب سلونی گندمی زمین داغِ مدادِ شب سے سیاہ ہو تو روشنی شورشِ میخانۂ انسان سے بالاتر ہوتی ہے۔ تمام رات جوشِ طلب سے دیوانے انجم تاریکی سے پیکار رہتے ہیں۔ پروانہ وار میدانِ فلک پر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ خونِ صد ہزار انجم سے جب اندھیروں کے بھیانک عفریت کی پیاس بجھتی ہے، تب کہیں جاکر عروسِ صبح گوہرِ آفتاب پہنتی ہے اور بامِ فلک پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ نور کی جھنکار سے خواب میں ڈوبے انسان کو جھنجھوڑ دیتی ہے اور حیران انساں چشمِ ظاہر سے عروسِ سحری کا جلوہ دیکھتا ہے۔ یوں روشنی دن بھر کے لئے اس کی بن جاتی ہے۔ نمودِ سحر کی یہ رسم ازل سے چلی آئی ہے اور ابد تک رہے گی۔

لیکن ایک سحر وہ ہے جس کا جلوۂ حسن دیکھنے کے لئے طلبِ صادق کی ضرورت ہے جو یوں خود بخود انساں کے پاس نہیں آتی بلکہ اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔ عشقِ پیہم کے بغیر جو ایک لمحہ نظر نہیں آتی ۔ جہدِ مسلسل جس کی صرف ایک کڑی ہے ۔ جسکے نور سے اچھی طرح سیراب ہونے کیلئے چشمِ ظاہر کیا تھ چشمِ باطن کا وا ہونا لازمی ہے۔ اور جسے پالینے والے کو یہ سلسلۂ روز و شب بازیچۂ اطفال نظر آتا ہے۔

یہ سحر وہ سحر ہے جو غارِ حرا سے نمود ہوئی۔ اسی سحر نے اسی پیغام نے صفحۂ ایام سے نقشِ باطل مٹایا۔ چشمِ باطن جس سے کھلیں وہ اسی سحر کا ۔ اسی پیغام کا جلوہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے جو کائنات پر چھا گیا۔ وہ یہی پیغام تھا۔ اور ہمیں جس کو لے کر آگے بڑھنا ہے وہ یہی پیغام ہے اور یہی آپ کیلئے، ہمارے لئے نویدِ صبح بھی ہے۔ پیامِ صبح بھی ہے، اور نمودِ سحر بھی ہے۔

ہماری یہ کوشش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کوشش کی داستان گو بہت طویل ہے، لیکن مقصدِ حقیقی کے آگے بہت ہیچ ہے۔

نمودِ سحر

عزیز حمیدی

شعور و فکر ہوئے پھر اسیرِ دامِ حسود
فریبِ حسن سے آدم ہوا برہنہ وجود

لگی ہے پھر لبِ مظلومیت پہ مہرِ سکوت
ہیں رودِ نیل میں اب بھی ہزارہا تابوت

جہانِ فطرت قابیل ہوگیا بیدار
ہے ابنِ نوح سفینہ سے آج بھی بیزار

اسیرِ چاہِ مصائب ہے یوسفِ سادہ
کلیم وادیٔ سینا میں پھر ہے واماندہ

ہنوز آلِ ابراہیم زرد رُو مردود
ہر اک قدم پہ بھڑکتی ہے آتشِ نمرود

غرور و سطوتِ باطل کے خادماں و نقیب
مسیحِ وقت کی خاطر بنا رہے ہیں صلیب

فقیہہ روما و یونان ہیں ہمدمِ چنگیز
ہے اب بھی ساغرِ سقراط زہر سے لبریز

"رسول" غارِ حرا میں ہیں مضطر و مہجور
"رسول" عرصۂ طائف میں زخمی و رنجور

اگرچہ زیست پہ ہوتی رہی سدا یلغار
مگر حیات ہے خنداں بصد غرور و وقار

فروغِ صبح سے مایوس کب ہیں اہلِ نظر
وجودِ شب تو ہے خود ضامنِ نمودِ سحر

معاونین

شہاب جاوید

اقبال ہاشم

یاسمین محبوب

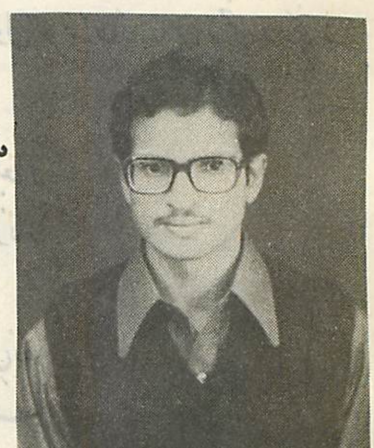

نثار احمد چیمہ

شکیل احمد

مدیرانِ مجلّه

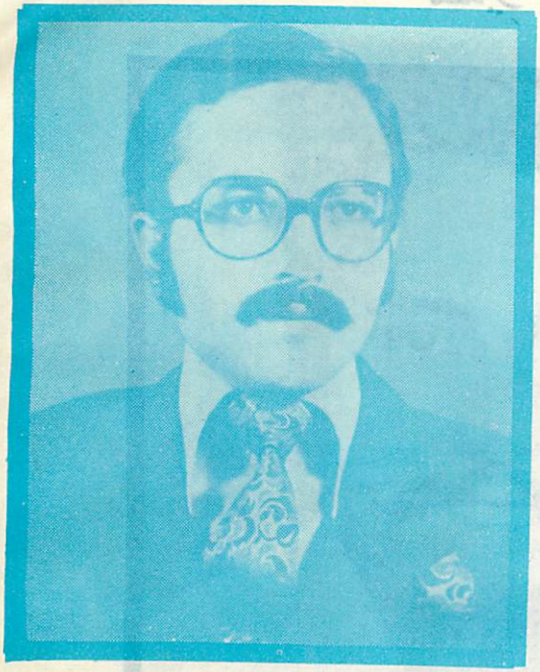

زین السالکین

سعید اختر

مُدیرِ اعلیٰ

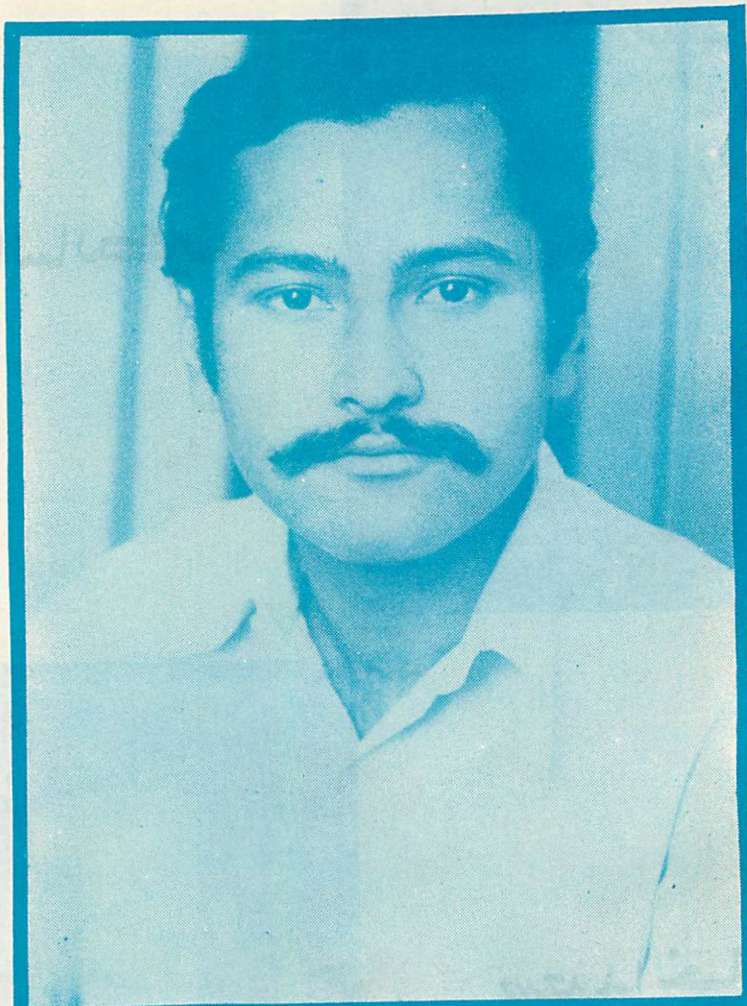

خالد سلیمان

نگراں

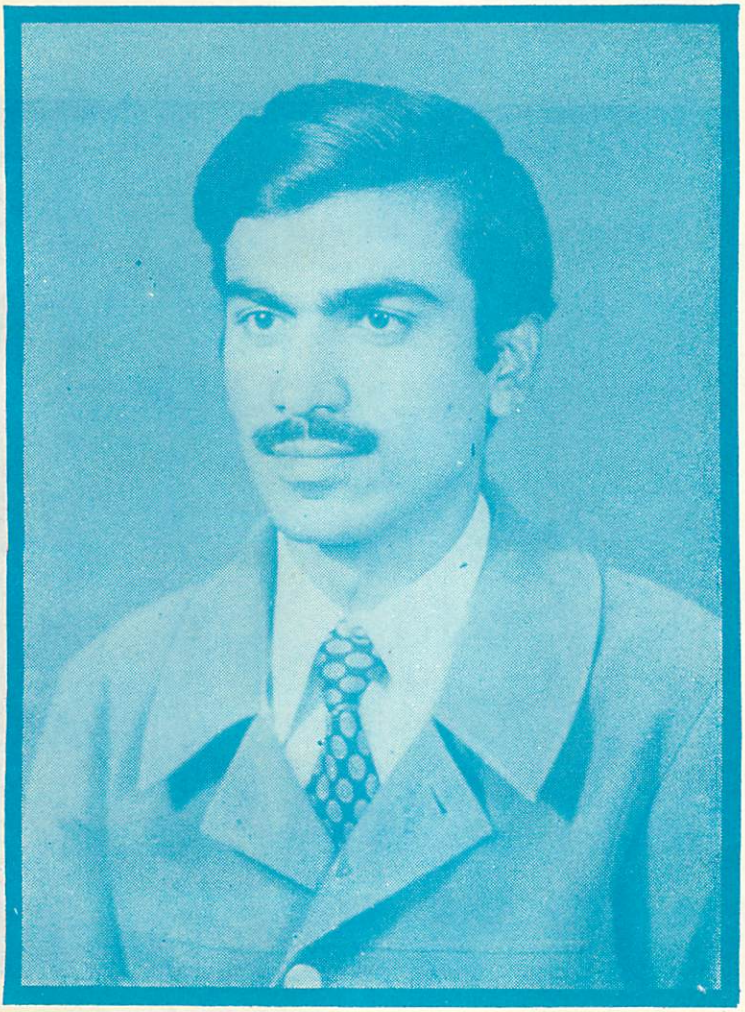

سیّد حامد ذکی

مصباح العزیز

صدر انجمن اتحاد طلباء ڈاؤ میڈیکل کالج

ممبر سینیٹ کراچی یونیورسٹی

ڈپٹی چیئرمین کراچی اسٹوڈنٹس کونسل

جنرل سیکرٹری

منظر سلیم

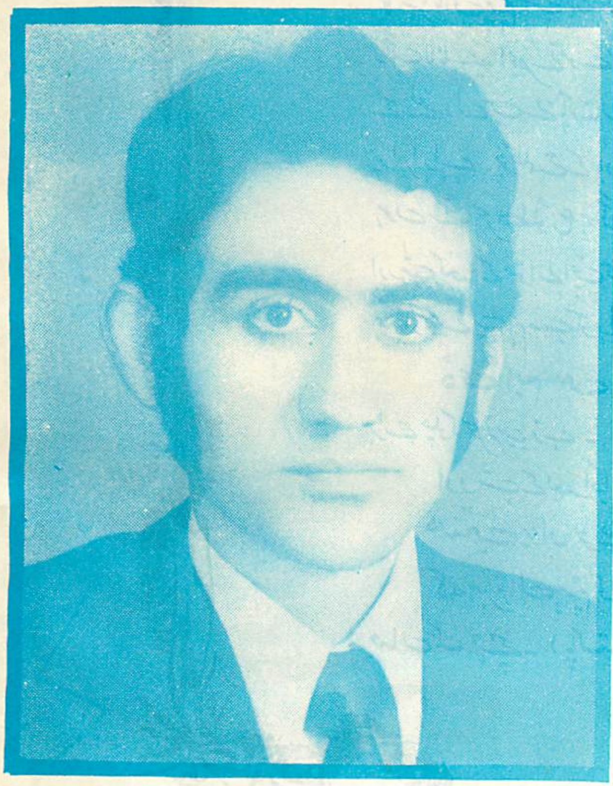

میگزین سیکرٹری

زبیر فاروق

پیغام

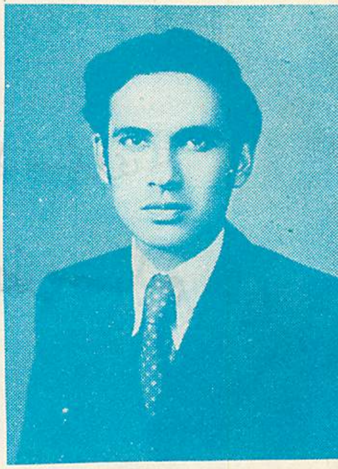

ڈاؤ میڈیکل کالج سے سحر کی نمود ہو رہی ہے۔ نہ جانے وہ شب جو تاریک تر تھی، کب سحر کے قالب میں ڈھلی اور کن صد ہزار انجم کے خون سے اس طرح جنم لیا ہے۔ بہرحال نمودِ سحر مبارک ہو۔ خدا کرے یہ سحر کبھی تاریکی کا منہ نہ دیکھے جس کے ہزار انجم ڈی ایم سی کے متوالے اور پاکستان کی سالمیت کے امین یہ طلباء ہیں۔

تاریکی اور اندھیرے نہ جانے کب سے ہمارے منتظر تھے اور منتظر ہیں۔ ہماری شبِ تاریک تو شاید قائدِاعظم کے ہم سے رخصت ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی اور اس کی تاریکی میں اضافہ اس وقت ہوا جب ہم نے نظریۂ پاکستان کو بھی ذہن کے تاریک گوشوں میں چھپا دیا۔ پھر اس ظلمت کی رات کے دامن سے ہمارا سابقہ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہوا جہاں ملک کے جانباز، خونِ شہداء کے امین، برہمن سامراج کے آگے جھکا دیئے گئے۔ جہاں کا سبز ہلالی پرچم اب بھی ظلمت کے طوفان سے لرزاں ہے۔ لیکن شہیدوں کے خون کو ابھی رنگ لانا ہے۔ ابھرتے ہوئے سورج کی شفق تابی میرے وہ نوجوان ساتھی ہیں جو اللہ اکبر کے نعمے دل میں لئے پاکستان کی تعمیر میں مشغول ہیں جن کا سبز ہلالی پرچم پاکستان کے مستقبل پر لہرا رہا ہے۔ جو ظلمت کے بادلوں میں دمکتے ہوئے چاند ہیں۔ جب بھی اندھیرے دُور ہوں گے۔ سحر طلوُع ہوگی۔ آفتاب نمودار ہوگا۔ ظلمت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اور ربِ کعبہ کے متوالے اپنی سحر سے ہمکنار ہوں گے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اس سحر سے ہمکنار کرنے میں ہم سب کو برابر کا شریک ہونا ہے۔

ڈی ایم سی کے جیالو، پاکستان کے طالبِ علمو، نظریہ پاکستان کے علمبردارو، بڑھے چلو کہ سحر قریب تر ہے۔

اور شب کے بعد اُجالا ہمارا مُقدر ہے۔

ہمتیں جواں، حوصلے بلند کئے بڑھتے رہو۔

کہ سبز ہلالی پرچم کی عظمتیں تمہارے دم سے قائم ہیں اور اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ (پاکستان زندہ باد)

(آفتاب قاضی)
سابق صدر انجمن اتحاد طلباء۔ ڈاؤ میڈیکل کالج۔
ممبر سنڈیکیٹ۔

پیغام

مجھے بڑی مسرت ہے کہ نمودِ سحر کا یہ پرچہ تین سال کے وقفے کے بعد پھر سے شائع ہو رہا ہے، خصوصاً یہ دیکھ کر حد درجہ اطمینان اور مسرت ہوئی ہے کہ اس کے مرتبین نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا ہے۔ کیونکہ یہ پرچہ خاص طور پر طلباء کا پرچہ ہے اور طلباء کے مفاد کے ساتھ ساتھ پیشۂ طب کے مفاد کا احاطہ کرتا ہے۔ لہٰذا میں طلباء سے پرزور اپیل کروں گا کہ وہ اپنی جانب سے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور صحیح طریقے پر تعلیمی اداروں کو چلانے کی مثبت کوشش کریں۔ اور ان کوششوں میں اساتذہ سے تعاون کریں اور ان کا ہاتھ بٹائیں۔

ملک کو اپنے نوعمر طلباء سے بہت توقعات ہیں۔ اور جو بجا نہیں ہیں۔ ملک ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے، اور ایسے وقت جبکہ ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ طلباء کا انتشار ایک بے معنی سی چیز معلوم ہوتا ہے۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ طلباء منظم ہو کر ایک بامقصد اور صحیح طریقے سے اپنی تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کریں اور ملک و قوم کی خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھیں۔ میری دعا ہے کہ ہم سب اس ارادے میں خدا تعالیٰ کی مدد سے کامیابیاں حاصل کریں۔

پروفیسر فضل الٰہی
(چیئرمین - نمودِ سحر)

چہرے میں نمودِ سحر

پروفیسر فضل الٰہی

سرپرست

پروفیسر اے۔ وحید

پرنسپل ڈاؤ میڈیکل کالج

شیخ الجامعہ

کراچی یونیورسٹی، کراچی

مورخہ ۱۸/مارچ ۱۹۷۵ء

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی کی بزم طلبا اپنا مجلہ نمود سحر عنقریب شائع کررہی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ مجلہ میں ایسے مضامین شامل کئے جائیں گے جن سے نہ صرف یہ کہ طلباء کو امراض اور اس کے علاج کے سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ عام آدمی بھی مرض کو سمجھنے اور فوری احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی اہمیت سمجھ سکے گا ۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے جہاں بیماریاں عام ہیں اور علاج و معالجے کے مواقع ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں نسبتاً کم ہیں یہ بہت ضروری ہے کہ طلباء میڈیکل کالجوں سے اچھی طرح تعلیم حاصل کرکے نکلیں تاکہ وہ دکھی انسانیت کی بہتر انداز میں خدمت کرسکیں ۔

(محمود حسین)

شیخ الجامعہ

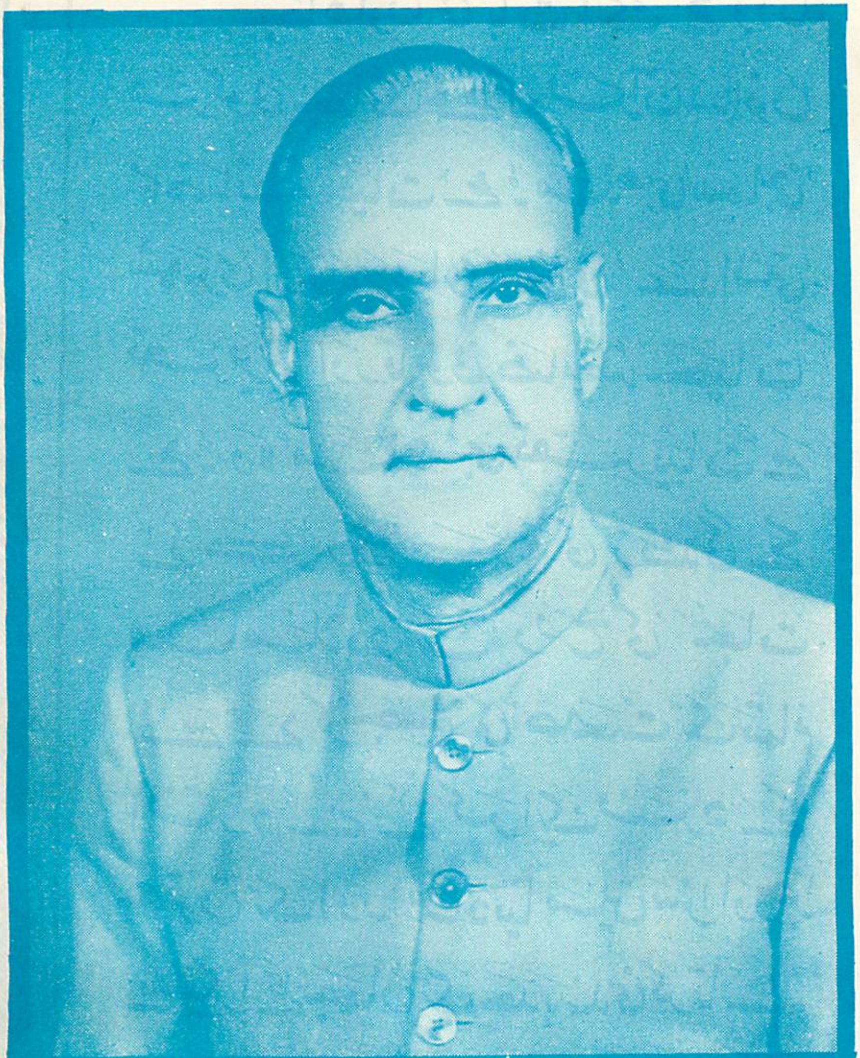

ڈاکٹر محمود حسین

قائدِ اعظم نے کہا:

جاہلوں کی بات الگ ہے ورنہ ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی، شہری اور کاروباری، فوجی، عدالتی، تعزیری، اور قانونی ضابطۂ حیات ہے۔ وہ مذہبی تقریبات سے لے کر روز مرہ کی زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک تمام افراد سے لے کر ایک فرد کے حقوق تک اور اس دنیا میں سزا اور جزا سے لیکر اگلے جہان تک حد بندی کرتا ہے۔

۱۹۴۵ء

انجمن اتحاد طلباء ڈاؤ میڈیکل کالج کا سالانہ مجلہ

نمودِ سحر

۹۵ - ۱۳۹۴ھ

۷۵ - ۱۹۷۴ء

نگران
سید حامد ذکی

میگزین سیکریٹری
زبیر فاروق

مدیر اعلیٰ
خالد سلیمان

مُدیران

زین السالکین

سعید اختر

معاونین

نثار احمد چیمہ • شہاب جاوید • اقبال ہاشم

• یاسمین محبوب • شکیل احمد

سرورق : اشتیاق سبحانی
کراچی اسکول آف آرٹس

آرٹسٹ :- زین السالکین

(سپر آرٹ پریس ۔ کراچی)

کتابت : ظفر ندیم ۔ فون : ۲۲۴۷۶۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالعَصرِ ① إِنَّ الإِنسَانَ لَفِی خُسرٍ ② إِلَّا الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
تَوَاصَوا بِالحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوا بِالصَّبرِ ③ ع ۳ ۲۸

”زمانے کی قسم، انسان درحقیقت
بڑے خسارے میں ہے،
سوائے اُن لوگوں کے جو
ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے
رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی
نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے“

بسم الله الرحمن الرحيم

Usman

یو بی ایل یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

UBL.7.127.74

نمودِ سحر

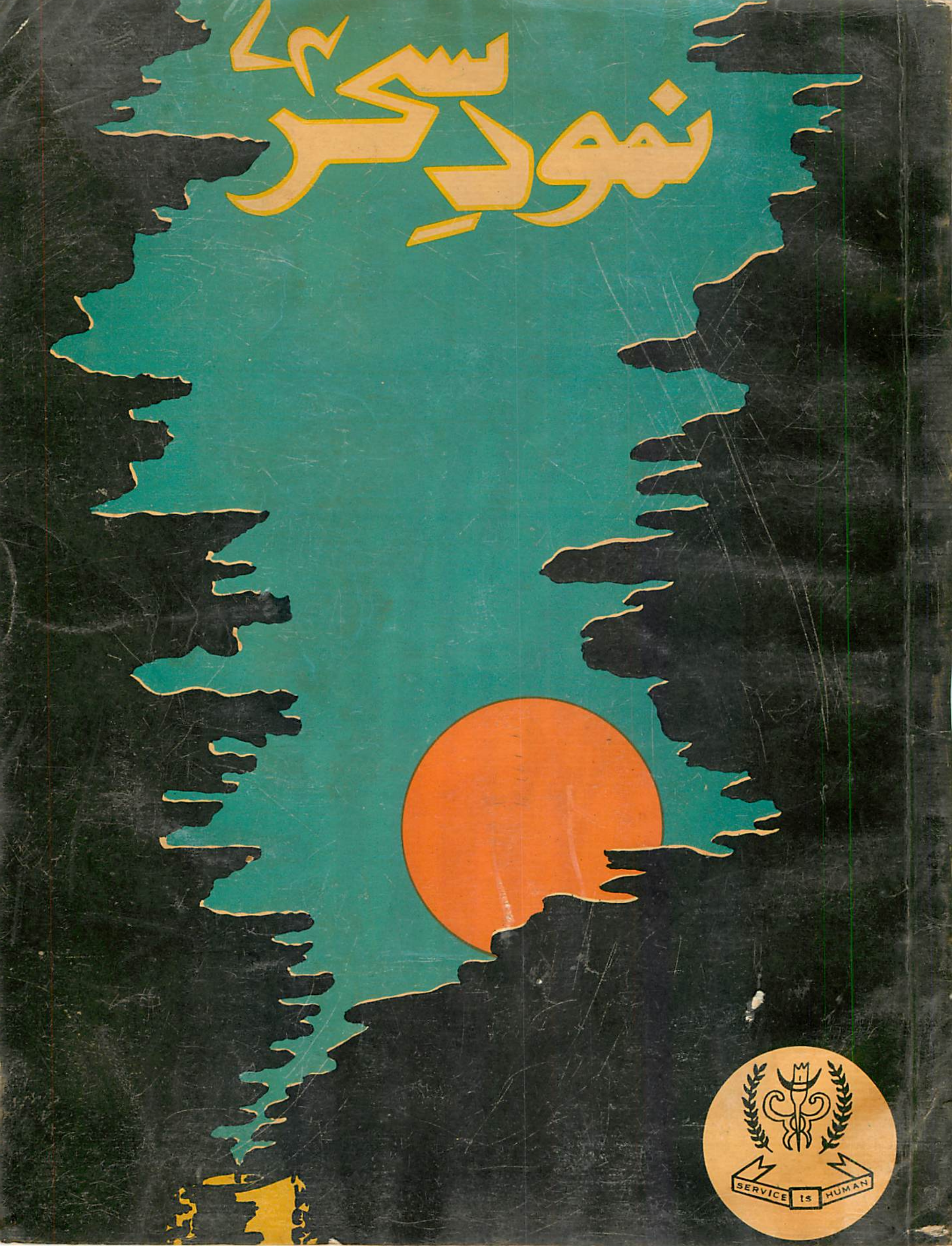

SERVICE is HUMAN